# تذکرہ

# سادات جارچہ و چھولس

نبی ہادی

ناشر

ظہور ہادی (انجمن تنظیم سبزوار)
۹/۲۴۳ دستگیر کالونی، فیڈرل بی ایریا کراچی (پاکستان)

# تذکرہ

# سادات جارچہ و چھولس

نسبی ہادی

ناشر

ظہور ہادی (انجمن تنظیم سبزوار)

۳۴۲/۹ دستگیر کالونی، فیڈرل بی ایریا کراچی (پاکستان)

حق اشاعت محفوظ : ڈاکٹر ظہور ہادی
۹/۲۴۳ دستگیر کالونی فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

مؤلف پروفیسر نبی ہادی

ناشر ڈاکٹر ظہور ہادی

تعداد ایک ہزار پہلا ایڈیشن

مطبع

کتابت لئیق احمد خان (رامپوری)

# تذکرہ

# سادات جارچہ وچھولس

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| مقدمہ | | ۴ |
| پہلا باب | : مورث اعلیٰ | ۷ |
| دوسرا باب | : مددمعاش | ۲۰ |
| تیسرا باب | : قوس نزولی | ۳۵ |
| چوتھا باب | : گلشن سبزوار (جارچہ) | ۶۰ |
| پانچواں باب | : عزیزانِ جارچہ | ۶۷ |
| چھٹا باب | : گلشن سبزوار (چھولس) | ۱۶۵ |
| ساتواں باب | : عزیزانِ چھولس | ۱۹۰ |
| آٹھواں باب | شجرہ | ۳۴۲ |


## صفحہ شخصیات باب پنجم


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۶۷ | قاری جعفر علی | ۱۰۸ | شمس الاسلام |
| ۷۶ | عباس حسین | ۱۱۱ | محمد صفی رضوی، قمر الاسلام |
| ۸۶ | احمد ظہیر عباس | ۱۱۳ | فخر الاسلام |
| ۹۴ | بیان یزدانی | ۱۱۵ | ابن حسن جارچوی |
| ۹۸ | عیان میرٹھی | ۱۲۶ | حیدر عباس، نخشب جارچوی |
| ۱۰۴ | بدر الاسلام | ۱۳۴ | سجاد حسین |

۱۳۵ اعجاز جارچوی
۱۴۰ سید حسن، لئیق الحسن
۱۴۳ محمد الیاس
۱۴۶ سیّد محمد
۱۴۸ مرتضیٰ حسین، لیاقت حسین
۱۵۳ حکیم یوسف حسین
۱۵۸ باقری بیگم
۱۶۰ آبادی بیگم
۱۶۳ کلثوم بیگم

## شخصیات باب ہفتم

۱۹۱ میر علی رضا
۱۹۵ ہادی حسین
۲۰۶ قاضی شوکت حسین
۲۱۰ میر ابوالحسن
۲۱۸ منشی محمد نذیر
۲۲۵ طالب علی
۲۲۸ مقدم علی حسین
۲۳۴ میر علی احسن
۲۳۹ مرتضیٰ حسین لکھیا نمبردار
۲۴۵ غلام سبطین تپان چھولسی
۲۵۲ حاجی تجمل حسین
۲۵۳ اہلبیت حسین
۲۵۴ انتظام علی
۲۵۴ منشی محمد رفیع
۲۶۶ قمر الزماں سبزواری
۲۷۰ رسالدار ظہور علی، مرتضیٰ حسین
۲۷۶ سلطان احمد، محمد ہاشم علی
۲۷۸ ندیم برنی
۲۸۴ حفیظ الحسن، حیدر عباس
۲۹۱ بھیّا رفیع
۲۹۲ ڈاکٹر غلام حسنین نجم
۲۹۵ حکیم ریاض علی
۲۹۷ حکیم باقر حسین
۳۰۰ پیرجی ابراہیم حسین
۳۰۴ محمد رضا، غلام رضا، رونق حسین
۳۱۰ سجّاد حسین، عابد حسین
۳۱۳ ڈاکٹر زمرّد حسین
۳۱۷ میر کرم علی
۳۲۴ محمد حسنین، محمد مہدی
۳۲۷ منشی محمد علی
۳۳۰ حیدر عباس (نورپوری)، شبیہ عباس
۳۳۴ مصطفیٰ بیگم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# مُقدمہ

مُدّت ہوگئی (سنہ ۱۹۸۰ عیسوی) کراچی میں چھولس کے کچھ نوجوان لڑکے ملنے آئے اور اپنے ساتھ کھانے پر مدعو کیا۔ کھانا ہو چکا تو انھوں نے اپنی انجمن "تنظیم سبزوار" کا تعارف کرایا اور خواہش ظاہر کی کہ سادات سبزوار جارچہ چھولس کا ایک مختصر تذکرہ لکھ دوں" تاکہ آنے والی نسلیں اپنی اصل کو نہ بھولیں اور گذشتہ بزرگوں کی یاد باقی رہے۔

مہاجرت کا عمل تاریخ کا قدیم تجربہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے عہد سے اس سانحہ کے اثرات وعواقب کا سب کو علم ہے۔ مہاجر نسل کا اضطراب اور المیہ جسم اور جان میں جدائی کے اضطراب سے کم نہیں ہوتا۔ لوگ بظاہر سالم وجود سمیت نئی سرزمین کی طرف منتقل ہو گئے لیکن جو دار و دیار چھوڑ کر آئے روح وہیں بھٹکتی رہتی ہے۔ یہ جاں سوزی کا عالم پہلی نسل کے ساتھ ختم نہیں ہوتا۔ بعد کی نسلیں سنی سنائی باتوں کی ایک خیالی دنیا اپنے دل میں آباد کیے رہتی ہیں۔ اگرچہ جدید تہذیب نے مہاجرت کو مزید آسان بنا دیا ہے اور دنیا سمٹ چکی ہے، پھر بھی

انسان کی بنیادی فطرت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آدمی گھر سے دس ہزار میل دور سات سمندر پار جا بسے، مگر بقول مولانا روم، "بازجوید روزگارِ وصلِ خویش"۔ شام ہوتی ہے تو آشیانوں کی طرف واپس اڑتے ہوئے طائروں کو حسرت و یاس کے ساتھ دیکھ کر رہ جاتا ہے۔

مہاجرت کی صورتِ حال سے مخلصانہ ہمدردی اور پیٹ میں پلاؤ کی گرمائی، میں نے لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ پاس ہی پلنگ پر بیٹھی، میرے مرحوم بھائی محمد کامل کی بیوی شمیم بانو، ساری کارروائی دیکھ رہی تھیں۔ غالباً لڑکوں نے پلاؤ ان ہی سے پکوایا تھا۔ میرے وعدے پر ان کو ذرا سی ہنسی آئی۔ سمجھ گئیں کہ ویسے ہی اڑا رہا ہے، نہ لکھے گا، اور اگر لکھا بھی تو بہت دن لگائے گا۔ واقعہ ایسا ہی ہوا، میں علیگڑھ پہنچ کر طرح طرح کے ضروری سے زیادہ غیر ضروری جھمیلوں میں پھنس گیا اور وقت گزرتا رہا۔ سب سے بڑی وجہ کاہلی جس کو امّ الوجوہات کہنا بے جا نہ ہوگا۔ وقتاً فوقتاً میاں شبیر علی رضوی، تنظیم سبزوار کے مدیر اعزازی کی جانب سے تقاضے کے خطوط موصول ہوتے رہے، افسوس یہ سطور پوری نہ لکھ پایا تھا کہ وہ مرحوم ہو گئے۔ چھولس میں برادرِ محترم جرار چھولسی نہایت ملیح انداز سے یاد دہانی کرا دیتے تھے۔ ان دونوں کی شرافت قابلِ داد ہے۔ مجھ پر اتنا لمبا اعتبار کیا اور ان کے اعتماد میں کمزوری واقع نہ ہوئی۔ آخر علی گڑھ کی معاشی سے قطعی گلو خلاصی پائی اور ریٹائر ہو گیا تو سوچا اب وعدہ وفا کرنا چاہیے۔

اطمینان کا باعث ہے کہ اپنے عزیزوں کی فرمائش پوری کر سکا اور تذکرہ تکمیل کو پہنچا۔ یہ کوئی فردوسی کا شاہنامہ یعنی عظیم قہرمانوں کی داستان نہیں ہے، ادبی دلچسپی کی چیز کہلائے یہ بھی اصل مقصد نہیں۔ ان مختصر اوراق میں اپنی نسل کے بزرگوں کی روئیداد سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ جو قصباتی اور دیہاتی پس منظر کے پرورش یافتہ تھے۔ بیشتر کے قبضے میں تھوڑی تھوڑی زمینیں تھیں جن پر کاشت کرتے تھے اور سادگی سے رہتے تھے۔ اتفاقاً کوئی پڑھ لکھ گیا تو شہر میں جا کر نوکری ڈھونڈ لی اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ عرصہ گزار کر گھر واپس یا وہیں بود و باش اختیار کر لی جیسا موقع ہوا۔ ان ہی میں

دو چار ممتاز اور معروف بھی ہو گئے۔ اگر کہیں کہیں نقشہ جارج چھبوس کے خط کشیدہ حدود دیارِ اربعہ سے باہر ہو گیا ہے تو بے وجہ نہیں ہے۔ پٹواریوں کی کھیوٹ اور کھتونی سامنے رہتی تو اتنی ساری باتوں کا طومار لگانے کی نوبت نہ آتی اور کسی کو اعتراض نہ ہوتا کہ زمانے بھر کے قلابے ملانے کی کیا ضرورت تھی۔ بالآخر جارج چھبوس کے لوگ اس برِ صغیر کے شہری ہیں۔ یہاں جو اُفتاد پڑی اس کے اثرات ان تک بھی گئے۔ وہ یہاں سیّد مبارک شاہ کے عہد میں وارد ہوئے اور سلطان بہلول لودی سے جارج چھبوس کے تصرفات کا فرمان پاکر اس دیارِ بہادر میں بسنے والے مسلمانوں کی تاریخ کا حصّہ بن گئے۔ قدرتی طور پر ان کا بظاہر حقیر، کم بضاعت، اور خوردبینی وجود پورے معاشرے سے مربوط ہے۔ بہار و خزاں کے تغیّرات کی آہٹ زمین کا ہر ذرّہ اور باغ کا ہر برگِ ضعیف سنتا ہے۔

امید ہے عزیزانِ وطن اس مختصر تذکرے کا خیر مقدم کریں گے۔ کسی اور کے لیے نہیں محض ان ہی کے لیے بعض نوجوانوں کی فرمائش پر لکھا ہے، سب کو کیا دلچسپی ہونے لگی۔ مشہور ہے شیخ ابوالفضل نے اپنے اکبر نامے کے ابتدائی صفحات کسی دوست کو دکھائے۔ اس نے پڑھ کر کہا ایسی عبارت کیوں لکھتے ہو جسے سو میں پانچ آدمی پڑھیں اور عام آدمی کا جی نہ لگے۔ شیخ کے منہ سے برجستہ نکلا ان ہی پانچ کے لیے لکھتا ہوں، ساری دنیا سے کیا مطلب ہے۔ مثالیں تلاش کیجیے تو اس نوعیت کی کتابیں اکثر چھوٹی اور بعض بڑی بھی، ہر زبان میں مل جائیں گی جو بہت تھوڑے سے پڑھنے والوں کی رعایتِ خاطر ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی جاتی ہیں اور ان کی اپیل محدود ہوتی ہے۔ یہ بھی اسی طرح کی کوشش ہے، شاید رسد بخاطرِ مشکل پسندے۔

نبی ہادی

(سابق پروفیسر، شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ہند)،

ساکن حال

بدر باغ، علی گڑھ (ہند)

١١ اکتوبر سنہ ١٩٩٣ عیسوی

## پہلا باب

# مورثِ اعلیٰ

سادات جارچہ وچھولس اپنا سلسلۂ نسب سیّد جلال بیہقی سے شروع کرتے ہیں۔ سیّد جلال بیہقی کا شجرہ پانچ پشت اوپر جاکر شاہ حسن روشن چراغ سے مل جاتا ہے۔ شاہ حسن روشن چراغ امام ہشتم علی رضا علیہ السلام کے فرزند ہیں۔ سیّد جلال کا وطن بیہق، ایران (خراسان) کا ایک قدیم اور شاداب قصبہ ہے۔ بعد میں اس کا نام سبزوار ہو گیا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے تک، بیہق کہلاتا تھا۔ نیشاپور سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے۔ سبزوار کی بہت سی مشہور روایات ہیں۔ ایران کے جن مقامات پر سادات علوی کے پراگندہ خانوادے سب سے پہلے آکر بسے ان میں قم کے ساتھ سبزوار کا نام بھی شمار ہوتا ہے۔ اس سرزمین میں ہمیشہ علماٗ اور اہل کمال پیدا ہوتے رہے۔ جب ایران میں بیشتر فقہ حنفی و شافعی کا سکّہ رائج تھا اور تمام اہل ایران تسنّن کے مسلک کی پیروی کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی سبزوار کے لوگوں نے شیعہ عقیدہ سے وابستگی قائم رکھی اسی نسبت سے مولانا روم نے اپنی مثنوی میں ایک حکایت بیان کی ہے اور ان کا ایک شعر ضرب المثل بن گیا ہے قصّہ یوں ہے کہ کسی بادشاہ نے سبزوار پر حملہ کر دیا۔ اور لوگوں کو برا بھلا کہا کہ تم بدعقیدہ اور

بدمذہب واقع ہوئے ہو۔ میں تمہاری ہڈیاں توڑ دوں گا اور جو بدعتیں تم کرتے ہو اُن کا ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ یاد رکھو گے۔ سب نے خوشامد کی اور قسمیں کھائیں کہ کس نے کہہ دیا ہم ہرگز بدعقیدہ نہیں ہیں۔ ہم کھرے دیندار ہیں۔ ہمارے حال پر رحم فرمائیے۔ بادشاہ بولا، اچھا، اگر سچ کہتے ہو تو مجھے ثبوت میں کم از کم ایک ابوبکر اپنے شہر میں دکھا دو۔ فوراً شہر میں بھاگ دوڑ مچ گئی اور تلاش ہونے لگی۔ بالآخر ڈھونڈنے کے بعد ایک ابوبکر ہاتھ آیا اور لوگ اسے بادشاہ کے سامنے لے گئے۔ مگر بے چارا نہایت خستہ حال اور دُبلا پتلا سا آدمی تھا۔ اس کو دیکھ کر بادشاہ کا غصّہ اور بڑھا اور لہجے میں تیزی آگئی۔ لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ جہاں پناہ ہماری خطا نہیں ہے۔ سبزوار کی آب و ہوا اس سے بہتر ابوبکر پرورش نہیں کر سکتی۔

سبزوار است ایں جہانِ بے مدار
ما ابوبکریم دروے خوار و زار

سیّد جلال بیہقی کے تین بیٹے تھے۔ سید محمود، سید محمد، اور شاہ میر۔ ان میں فرزندِ اکبر یعنی سیّد محمود برقعہ پوش کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ وہی سب سے پہلے ترکِ وطن کر کے سبزوار سے ہندوستان تشریف لائے۔ سید محمود صاحبِ دل عارف اور ولی کامل تھے۔ ان کا لقب "برقعہ پوش" ان کے عارفانہ اوصاف کی نشان دہی کرتا ہے۔ بیشتر صوفیائے کرام کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ زن و فرزند کے بکھیڑوں سے دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ عبادت و ریاضت میں انہماک، ضبط و پرہیز کی عادت، ترکِ دنیا پر مسلسل اصرار، مال و زر سے ہاتھ خالی رکھنا، یہ سب باتیں لازمی طور سے تنہا رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ سید محمود نے بھی اپنی پوری زندگی تجرّد کے عالم میں گزاری اور درویش کی طرح رہے۔ ایران سے اضطراری کیفیت میں رخصت ہونا پڑا تھا۔

سیّد محمود کے ضمن میں صوفیوں کے بعض ضروری قواعد و ضوابط کی طرف نظر جاتی ہے۔ ان کی تاکید ہے کہ دنیا کو ایک کہنہ رباط، ایک ویران سرائے، سمجھو اور ابلقِ صبح و شام پر سوار چار جانبِ عالم کا چکر لگاتے رہو۔ میرزا بیدل کا مصرعہ صوفیائے کرام کے مسلک

کی ترجمانی کرتا ہے۔ دریں غربت سرا خورشید تنہا گرد را مانم۔ میں اس غربت سرا کے اندر تنہا گھومنے والے سورج کی طرح ہوں۔ قیامِ مقامی کے نتیجہ میں دل بہت جلد دنیا کی طرف لپکتا ہے آدمی کی سکونت مستقل طور سے ایک مقام پر ہوئی۔ اور وہ دنیا کے جھمیلوں میں پھنسا۔ صوفیوں کے نزدیک دنیاوی علائق سے بچنے کا مجرّب علاج یہ ہے کہ جہاں گردی کرتے رہیے۔ اس عجوزہ عروس کے عشوۂ باطل سے محفوظ رہنا ہے تو ایک جگہ دل نہ لگائیے صوفی عقاید میں سفر و سیاحت تزکیۂ نفس کے لیے بڑے کام کی چیز ہے۔ ویسے بیشتر مسلمان زندگی میں ایک لمبی مسافرت کا تجربہ ضرور حاصل کرتے ہیں۔ حج کعبہ رکنِ دین ہے اور بلادِ مقدس کی زیارت کے لیے ہر مسلمان کا جی چاہتا ہے۔ اولیائے کرام اور زیادہ اہتمام کے ساتھ اس معاملے میں مستعد اور پابند رہتے تھے۔ لباسِ درویشی پہن کر دنیا کی سیر کرنا ان کا مرغوب معمول تھا۔ اور جب دیکھا کہ عمر کی دوپہر ڈھل چکی اور شام ہونے کو ہے تو ایسا کرتے تھے کہ کسی دور افتادہ جگہ کو بالینِ آسائش قرار دیا اور صبر کے ساتھ پیغامِ دوست کا انتظار کرنے لگے یہ عام ضابطے کی بات تھی۔ البتہ غیر معمولی حالات میں وقت آن پڑے تو سالکِ راہِ حقیقت مجاہد بھی ہوتا تھا اور خدمتِ خلق کی خاطر سپاہی بھی بن جاتا تھا۔ سیّد محمود سبزواری کی زندگی میں بالکل ایسا ہی سانحہ پیش آیا۔

ایران کی تاریخ میں دو حادثے بڑے المناک اور ہیبت خیز گزرے ہیں، ایک تاتاریوں کا حملہ جو چنگیز اور اس کے بھتیجے ہلاکو نے کیا اور جس کی انتہا بغداد کی تباہی اور بنی عباس کی خلافت کے خاتمے پر ہوتی ہے۔ یہ سنہ ۶۵۶/۱۲۵۸ کا معاملہ ہے۔ دوبارہ کم و بیش ڈیڑھ سو برس بعد تیمور لنگ نے تباہی مچائی۔ اس کے لشکر کی گزرگاہوں پر انسانی کھوپڑیوں کے مینار نظر آتے تھے۔ سبزوار بھی زد میں آیا۔ تیمور لنگ نے سبزوار پر سنہ ۷۸۳/۱۳۸۱ میں حملہ کیا اور پورے شہر کو خاک میں ملا دیا۔ سید محمود نے تیمور کے خلاف دفاعی جہاد کیا۔ ظاہر ہے کہ تیمور کے سیلِ بے پناہ کے سامنے ٹھہرنا اور اس کو روکنا مشکل تھا۔ سیّد محمود اور ان کے ساتھیوں کو شکست ہوئی وہ افسردہ و دل شکستہ امام رضا علیہ السلام کے روضۂ مبارک پر پہنچے اور وہاں جاکر دعا کی۔ پانچ روز کے

اعتکاف اور تضرّع کے بعد خواب میں بشارت ہوئی۔ مورّخ کے الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں: "فی الحال امام علیہ السلام لعابِ مبارک خود را بر زبانِ ایشان مالید"۔ صبح کو آنکھ کھلی تو سینہ معرفت کے نور سے روشن ہو چکا تھا۔ اسی نوعیت کا تجربہ خواجہ حافظ شیرازی کو بھی ہوا تھا۔ خواجہ کی ایک پوری غزل اسی روئیداد کے بیان پر مشتمل ہے: اندر آں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند۔ سیّد محمود سبزداری نے ضریح کے سامنے کھڑے ہو کر ترکِ دنیا کی قسم کھائی اور فقیری اختیار کر کے مشہد سے نکلے۔

عرفان یا علمِ لدنّی اللہ کا انعام ہے جو تخصیصِ محض کے طور پر انبیاؑ کے بعد اولیاء کو بخشا جاتا ہے۔ یہ کتابی علم سے بالکل الگ اور نرالی چیز ہے۔ عرفان کے حصول کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک وہ جس کی مثال سیّد محمود سبزداری اور خواجہ حافظ کے سلسلے میں اوپر گزری۔ صوفی اس کو طیّ لسانی کہتے ہیں۔ طیّ زمانی اور طیّ لسانی کا مطلب یہ ہے کہ انبیاؑ اور اولیاؒ پر زمان و مکان کے حدود اٹھ جاتے ہیں۔ وہ زمان و مکان کو طے کر سکتے ہیں۔ حضرت خضرؑ، حضرت عزیرؑ، اصحابِ کہف اور آخر میں ہمارے پیغمبر سرورِ کائناتؐ کی معراج طیّ زمانی اور طیّ مکانی کی واضح مثالیں ہیں۔ ہمارے امام مہدیٔ آخرالزماں بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ جو فی الحال زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ ان واقعات کو ہر مسلمان جانتا ہے۔ طیّ لسانی کے معنی یہ ہیں کہ جن علوم یا اسرار کو زبان سے سمجھانے میں برسوں لگیں وہ پلک جھپکنے میں بھی ایک قلب سے دوسرے قلب تک منتقل کیے جا سکتے ہیں۔ ایک نگاہ دنیا بدل ڈالتی ہے۔ یہ الہام کی سطح ہے اور اس کو حقائق کے ابلاغ یعنی سمجھنے اور سمجھانے کا سب سے بلند طریقہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس سے نیچے دوسرے درجے پر فکر کی سطح آتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے نظریات کی تبلیغ میں سینکڑوں برس لگے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مفکرین نے جان کی بازی لگا دی اور صدیوں کوشش کی تب کہیں جا کر ان کی بات لوگوں کی سمجھ میں آئی اور بہت سے پھر بھی جھگڑتے رہ گئے۔ بے شمار معقول باتوں کا اظہار اس خوف سے نہیں کیا جاتا اور لوگ احتیاط کے مارے زبان بند رکھتے ہیں کہ بحث و تکرار کا دروازہ کھلے گا اور خواہ مخواہ فساد پھیلے گا۔

سب سے سیدھا سادا طریقہ وہ ہے جسے ایرانی عورتیں اپنے گھریلو روزمرّہ میں خرفہم کہتی ہیں۔ یعنی بات اس قدر سہل اور آسان ہو کہ آدمی تو کیا گدھا بھی سمجھ لے۔ طی الہٰی کے علاوہ حصولِ معرفت کی دوسری صورتیں بھی ہیں۔ صوفی سلسلوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ روحانی تربیت مکمل کرنے کے لیے عملی طور سے سات مرحلے یا مقام ہیں۔ پہلا مقام توبہ ہے۔ مشہور ہے کہ کسی صوفی نے ستّر مرتبہ توبہ کی اور توڑ بیٹھا۔ آخر میں خدا کو رحم آیا اور توفیقِ الٰہی کی بدولت مقامِ توبہ پر قائم رہنا اور آگے بڑھنا ممکن ہو سکا۔ داتا گنج بخش شیخ علی بن عثمان ہجویری اپنی کتاب کشف المحجوب میں فرماتے ہیں، اور بعد کے بزرگوں نے ان کی تائید کی ہے، کہ مرشد کامل کی رہنمائی میں سالک کے لیے سلوک کی منزلیں سہل ہو جاتی ہیں۔ ویسے معمول کے طور پر صوفی برسوں ریاضت و عبادت میں لگا رہتا ہے۔ قدم قدم پر ضبطِ نفس کی آزمائشیں آتی ہیں۔ سید محمود سبزواری خوش نصیب تھے، وہ ایک رات میں تمام مرحلوں سے گزر گئے۔ حقیقتاً راہ آسان نہیں، بقول بیانؔ یزدانی : سخت سے سخت ہے مشکل سے سوا مشکل ہے۔

جارچہ چھولس کے لوگ ابھی ایک نسل پہلے تک اپنا خوب مذاق اڑاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اپنے کو مذاق کا موضوع وہی بناتا ہے جو اپنی حیثیت پر اعتماد رکھتا ہو۔ مولانا ابنِ حسن جارچوی کہا کرتے تھے کہ میرا تاریخ کا مطالعہ دُور تک ہے۔ لیکن باوجود کسی تاریخی کتاب میں جارچہ چھولس کے زوال کا حوالہ نہیں نظر سے نہیں گزرا۔ آخر ہمارے پڑوس میں سادات بارہہ بھی تو ہیں۔ وہ مغل حکومت پر چھائے رہے۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ میرے والد حضرت شاہنشاہی پر نزع کا عالم طاری تھا۔ امرائے عالی مقام کو میری صلاحیت پر اعتماد نہ تھا اور مجھے جانشین بنانے میں سخت مذبذب تھے۔ گفتگو اور بحث نے طول کھینچا اور رات گزرتی گئی تو سید مرتضیٰ بارہہ اور ایک راجپوت امیر یہ کہہ کر محفل سے اٹھ گئے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا بیٹا موجود ہے آپ لوگ پوتے کی طرف کیوں دیکھتے ہیں۔ سیّد مرتضیٰ کی حمایت نے قضیّہ کا فیصلہ کر دیا۔ اس کے اٹھ جانے کے بعد پھر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ میرے

خلاف اصرار کرتا۔ گویا یہ سادات بارہہ کا وقار اور وزن تھا۔ بادشاہ گر کہلاتے تھے۔ مگر جارچہ چھولس کا کہیں پتہ نہیں حالانکہ ہم بھی دہلی کے نواح میں رہتے ہیں۔ جارچہ کے ایک بزرگ ضیاء الاسلام عیاں میرٹھ میں وکالت کرتے تھے، شاعر تھے، نکتہ آفرینی اور بزلہ سنجی کے لیے مشہور تھے۔ ان کو بھی یہی شکایت تھی۔ کہتے تھے کہ سادات بارہہ کو تو جانے دیجیے۔ اسی ضلع بلند شہر میں سیّدوں کا ایک قصبہ سکار پور ہے۔ وہاں کے حضرات جس صفت کی بنا پر ساری دنیا میں مشہور ہو گئے وہی خوبی جارچہ چھولس کے سیّدوں میں ان سے زیادہ بدرجۂ کمال موجود ہے۔ پھر بھی بدنصیبی ملاحظہ فرمایئے کہ ہم ہمیشہ گمنام رہے۔ کوئی قدیم دستاویز ایسی نہیں ملتی جس میں اشارتاً بھی جارچہ چھولس کا تذکرہ آیا ہو۔ ان بزرگوں کی حسرت توقع کے خلاف بالآخر پوری ہوگئی۔

جہانگیر کے زمانے میں ایک تاریخ بہارستان شاہی کے عنوان سے لکھی گئی۔ اس میں بیشتر کشمیر کے واقعات درج ہیں۔ مؤرخ اپنا نام نہیں بتلاتا۔ اتنا ضرور واضح ہے کہ کشمیر میں بیٹھ کر کتاب کی تکمیل کرتا ہے اور وہاں کے واقعات سے بخوبی واقف ہے۔ بہارستان شاہی کے خطی نسخے مدّتوں نایاب اور مفقودالخبر رہے۔ اتفاقاً حال میں دریافت ہوئے ہیں۔ مؤرخ کے نام کا سُراغ نہ ملنے کے سلسلے میں بھی مختلف قیاس آرائیاں ہیں۔ مثلاً یہ کہ غالباً شیعہ تھا۔ اسی لیے عمداً نام پوشیدہ رکھتا ہے۔ مغلوں کے زمانے میں شیعہ اپنے مسلک کے اظہار کے معاملے میں گول رہتے ہوں مگر حکومت کی دستگاہ میں غالب عنصر بنتے جارہے تھے۔ مغل عہد سے پہلے وہ زمانہ جو عہدِ سلطنت کہلاتا ہے واقعی شیعوں کے لیے سازگار نہ تھا۔ ان کو تقیہ کرکے رہنا پڑتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے کی ایک تاریخ سیرتِ فیروز شاہی نام کی ہے۔ اتفاق سے اس کے مولف کا نام بھی پردۂ گمنامی میں رہ گیا۔ سیرتِ فیروز شاہی کی اطلاع کے مطابق فیروز شاہ تغلق نے اپنی حکومت میں بعض اصلاحات نافذ کیں۔ ایک اصلاح یہ تھی کہ لوگوں کے عقاید کے بارے میں چھان بین کی گئی۔ بقول مؤرخ جن کے خلاف شیعہ ہونے کی اطلاع ملی اور تفتیش پایۂ ثبوت کو پہنچی ان کو پکڑ کر سزائیں دی

گئیں اور سرکاری مراعات سے محروم کردیا گیا۔ ہندوستان میں بابر کی آمد اور مغل سلطنت کے قیام کے بعد مسلم معاشرے کی فضا میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہوئے۔ رواداری بڑھی اور روشن فکری کو رفتہ رفتہ پھیلنے کا موقع ملا۔ حتمی طور سے اتنا ہوا کہ شیعوں کے بے دھڑک قتل کا رواج جاتا رہا۔ مغل سلطنت کی سرحدیں صفویوں کی شیعہ سلطنت سے ملتی تھیں۔ ہمایوں کے زمانے میں شیخ حمید سنبھلی نام کے ایک عالم تھے۔ ان کے علم و فضل کی بنا پر ہمایوں ان سے دوستانہ سلوک کرتا تھا۔ شیر شاہ نے ہمایوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیا۔ شیخ حمید ملاقات کے لیے کابل پہنچے۔ ہمایوں نہایت محبت اور مدارات کے ساتھ پیش آیا۔ ایک دن بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کہنے لگے: بادشاہم، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے عقیدے میں خلل آگیا، کہیں ایمان تو ہاتھ سے نہیں کھو بیٹھے؟ ہمایوں نے پوچھا: شیخ ایں سخن بہ چہ دلیل فرمودید؟ شیخ نے جواب دیا، میں تمہارے لشکر سے گذرا، سپاہیوں کے نام پوچھے، جو بھی ملا گدا علی، نقش علی، کفش علی۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ ہمایوں کو بہت برا لگا۔ قلم ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ کاغذ پر ایسا مارا کہ قلم ٹوٹ گیا۔ کہنے لگا، مولانا میرے سنی ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ میرے دادا کا نام عمر تھا۔ پھر بھی آپ کو یقین نہیں آتا؟ اصل بات یہ تھی کہ بنی امیہ اور بنی عباس نے طرف دارانِ علی یعنی علی کو خلیفۂ بلافصل کہنے والوں کے خلاف نہایت مضبوط روایت چھوڑی تھی۔ سوادِ اعظم کی رائے عامہ اس معاملے میں صدیوں تک ایسی بے لچک رہتی آئی ہے کہ بادشاہ بھی الزام سے گھبراتے تھے۔ ہمایوں کے خلاف اس کا بھائی اور حریف، کامران، یہی الزام اپنے دعوے کے اثبات میں عاید کرتا تھا۔

غرضکہ بہارستان شاہی کے مولف کا نام کیوں چھپا رہ گیا۔ اس سوال کا جواب ملنا مشکل ہے۔ کاتب کی بے احتیاطی بھی مورخ کے نام کا صفایا کرنے کی ذمہ دار ہوسکتی ہے۔ قدیم نسخوں کی کتابت میں کچھ نہ پوچھیے کاتب کیا اندھیر مچاتے تھے۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ بہارستان شاہی کے صفحات میں ہمارے اجداد کے وطن کا حوالہ موجود ہے۔ وہاں جاریچہ لکھا ہے۔

بہارستان شاہی کا مولف سادات بیہقی کا کشمیر میں داخلہ سکندر بت شکن کے زمانے میں دکھاتا ہے۔ سلطان سکندر کا زمانہ حکومت سنہ ۹۶/۷۹۳/۱۳۹۳ء سے شروع ہو کر ۸۱۶/۱۴۱۳ء تک جاتا ہے۔ سری نگر کی جامع مسجد جو ہند اسلامی فن تعمیر کی تاریخ میں ایک یکتا نمونہ شمار ہوتی ہے، سلطان سکندر کی یادگار ہے۔ سادات بیہقی کی جماعت کے میر کارواں سید محمود سبزواری تھے۔ بہارستان شاہی کی شہادت کے مطابق سید محمود اپنے مربی سلطان سکندر بت شکن کی وفات کے بعد دہلی واپس چلے گئے۔ سلطان سکندر کی مدح میں سید محمود سبزواری کے قصیدے اور سلطان کی وفات پر مرثیہ بہارستان شاہی میں موجود ہیں۔ سیّد محمود سبزواری اور ان کے احفاد یعنی بھائی بھتیجے سب شاعر تھے۔ صوفیائے کرام عموماً فن شعر کے ماہر ہوتے ہیں۔ فارسی شاعری اپنے شاہکاروں کے لیے صوفیوں کی مرہون ہے۔ مورخ کے الفاظ یہ ہیں: "در کشمیر قرار و سکونت نیافتہ باز بولایت ہند مراجعت نمودند و نزدیک دہلی بموضعے جاریچہ نشستند" وہ مزید کہتا ہے کہ سلطان سکندر کے بیٹے سلطان زین العابدین کے عہد میں سید محمود سبزواری دوبارہ خدم و حشم کے ساتھ تشریف لائے۔ کشمیر سے چلے جانے کی وجہ دوسری بھی ہو سکتی ہے۔ سید محمود اصل میں درویش تھے اور ہر درویش جہاں گرد ہوتا ہے۔ دہلی میں سید مبارک شاہ کا زمانہ تھا۔ سیّد مبارک شاہ کی وفات سنہ ۸۳۷/۱۴۳۴ء میں واقع ہوئی۔ اندازہ یہ ہے کہ سیّد محمود دہلی میں زیادہ دن نہ ٹھہرے۔ وہ وہاں سے بنگال کی طرف روانہ ہوئے۔ بنگال میں الیاس شاہی خاندان کا فرماں روا سلطان غیاث الدین سنہ ۷۹۲/۱۳۸۹ء سے لگا کر ۸۱۲/۱۴۰۹ء تک تخت و تاج کا مالک رہا ہے۔ سلطان عالموں کی صحبت کا شیدائی تھا۔ اور اس کے دربار میں ارباب فضل و دانش کا مجمع رہتا تھا۔ خواجہ حافظ شیرازی کو بنگال آنے کی دعوت سلطان غیاث الدین ہی کی طرف سے گئی تھی۔ خواجہ کی ایک غزل میں غیاث الدین کا نام اور دعوت نامے کا اشارہ باقی رہ گیا ہے۔ خواجہ آئے نہیں مگر سلطان کا انعام و اکرام شیراز میں بیٹھے وصول کرتے رہے۔ "ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود"

جارج چھوس کے لوگوں کی سینہ بسینہ روایات میں اور بہارستان شاہی کے بیانات میں کہیں مشابہت ہے اور کہیں اختلاف بھی ہے۔ مورخ اپنی دانست میں سلطان غیاث الدین کو دہلی کا بادشاہ تصور کرتا ہے، یعنی کشمیر میں رہ کر اس کی نظر بنگال تک نہیں جاتی۔ البتہ سلطان غیاث الدین کے دربار کی شان و شوکت کا حال اور اہلِ کمال کے جلسوں کا نقشہ بالکل صحیح بیان کیا گیا ہے۔ دونوں کی روایت ایک نقطے پر پہنچ کر مشترک ہو جاتی ہے وہ یہ کہ سلطان غیاث الدین کو اپنی جوان بیٹی کے بیاہ کی فکر دامنگیر تھی۔ مسلمان بادشاہوں کا اکثر یہ دستور رہا ہے کہ اپنی لڑکیوں کے رشتے سادات اور شیوخ سے کرتے تھے۔ سلطان بہرام شاہ غزنوی نے اپنی چالیس بیٹیوں کی نسبت صحیح النسب سیّدوں کے ساتھ کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اہلِ دنیا میں کوئی اُن کا ہم پلّہ نہ ہو پھر بھی سادات آلِ رسول ہیں اور شیوخ بھی پیغمبر کے رشتے دار ہیں۔ دوسرے علم و فضل ان ہی کی میراث ہے۔ سلطان غیاث الدین نے اپنے دربار کے مقربین خاص کو بلا کر مشورہ کیا۔ سب نے کہا یہ نو وارد سید علوم عقلی و نقلی کا فاضل ہے اور بظاہر تقویٰ و پرہیزگاری کی برکت سے بھی آراستہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کو شرف دامادی بخش دیا جائے تو مناسب رہے گا۔ سلطان کے ایما سے علمائے کرام سید محمود سبزواری کے پاس گئے اور پیغام دیا انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ میں فقیر ہوں اور ترکِ دنیا کی قسم کھا چکا ہوں۔ اپنی گزشتہ زندگی کے سارے واقعات سنائے اس پر بھی علمأ کا اصرار جاری رہا تو وہ کہنے لگے کہ میں معاملے کے حل کی ایک صورت تجویز کرتا ہوں۔ میرا بھتیجا حسن میرے ساتھ ہے۔ اس کی تربیت میں نے خاص توجہ سے کی ہے۔ علم کی شائستگی کے علاوہ یہ میری طرح پرہیزگار بھی ہے۔ سلطان سے کہیے اس کے ساتھ بیٹی کا نکاح منظور کرلے۔ علمأ نے جاکر سلطان کے سامنے سید محمود کی تجویز رکھ دی۔ سلطان راضی ہو گیا اور شہزادی کا عقد سید حسن سے کر دیا گیا۔ یہ مفصل اطلاع بہارستان شاہی میں موجود ہے۔

سید محمود سبزواری کی سوانح حیات دلچسپ حکایتوں کی آمیزش سے خالی نہیں ہر

ویسے تقریباً سب ہی صوفیوں کے سلسلے میں ایک باریک سی قباحت کو قدرِ مشترک سمجھنا چاہیے وہ یہ کہ اُن کے عقیدت مند اُن کی کرامات کے قصّے بے تحاشا پھیلاتے رہتے تھے سید الطائفہ جنید بغدادی سے لے کر حضرت نظام الدین اولیاؒ تک تمام بزرگوں نے اپنے مریدین پر سخت تاکید جاری رکھی کہ خبردار کرامات کی باتوں کو ہرگز اہمیت نہ دینا۔ وجہ یہ کہ کرامات کے بیان میں مبالغے کی گنجائش ہوتی ہے اور زیبِ داستان کے لیے بات بڑھائی جاتی ہے۔ خدا کے بندے اس پر بھی باز نہ آئے۔ سیّد محمود سبزواری کی بابت مشہور ہے کہ بنگال پہنچنے پر پہلے تو سلطان غیاث الدین ان سے اور ان کے بھتیجے حسن سے سخت ناراض ہوا، بعد میں حقیقت سامنے آئی کہ خدا رسیدہ بزرگ ہیں تو معتقد ہو گیا۔ داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن صبح کے وقت قصرِ شاہی سے باہر باغ میں شہزادہ یعنی سلطان غیاث الدین کا بیٹا اور ولی عہد سیر کے لیے آیا۔ سیّد محمود سبزواری کے بھتیجے حسن بھی وہاں ٹہل رہے تھے۔ انھوں نے شہزادے کو سلام نہ کیا۔ غالباً پہچانا نہیں۔ شہزادہ غصّے میں بھرا باپ کے پاس پہنچا اور شکایت کی۔ بادشاہوں اور شہزادوں کا مزاج ہوتا ہے کہ بقول شیخ سعدیؒ، گاہے بسلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے بخشند۔ یعنی کبھی سلام پر ناراض ہو گئے اور کبھی گالی پر ہنس پڑے۔ سلطان کے اشارے سے شاہی خادم نے سید محمود کو زہر کا پیالہ پیش کیا وہ بسم اللہ کہہ کر پی گئے۔ خادم کی اطلاع پر کہ زہرِ قاتل نے اس درویش پر قطعی کوئی اثر نہ کیا اور وہ ویسا ہی بیٹھا قرآن کی تلاوت کر رہا ہے۔ سلطان نے تاکید کی کہ ایک پیالہ اور پلا، پھر بھی کچھ نہ ہوا تو سلطان ڈر گیا سیّد محمود سے آ کر معذرت کی اور احترام کے ساتھ پیش آیا۔ قباحت یہ ہے کہ جدید ذہن ایسے قصّوں کو قبول نہیں کرتا۔ عقل سوال کرے گی کہ بھلا زہر اپنی تاثیر کیوں بدلنے لگا؟ اس طرح کا واقعہ ہرگز پیش نہیں آیا اور سراسر افسانہ طرازی ہے۔ فرض کیجیے ایسا ہی ہوا تو ماننا پڑے گا کہ پیالے میں زہر نہ تھا۔ دل کو لگنے والی تاویل یہ ہو سکتی ہے کہ شاہی خادم ایک بے گناہ مسافر اور فقیر کی جان کا عذاب مفت اپنی گردن پر رکھنے سے جھجک گیا ممکن ہے اس نے زہر کی جگہ کچھ اور گھول کر پلا دیا اور سلطان کو جا کر بتا دیا کہ زہرِ قاتل کے کئی جام پلا آیا ہوں۔

شاہی خادم اکثر وبیشتر خواجہ سرا ہوتے تھے ان کو ایسے کرتب خوب آتے تھے۔

عام روایت کے مطابق سیّد محمود سبزواری کو بنگال چھوڑ کر اس لیے واپس آنا پڑا کہ سلطان غیاث الدین کے بیٹے اور سید حسن میں تعلقات ہموار نہ رہ سکے حالانکہ عزیزداری ہو چکی تھی۔ شہزادے کی بہن سید حسن کے عقد میں تھی۔ مشہور ہے کہ دونوں شیر کے شکار کو گئے۔ سید حسن نے شہزادے کے پہنچنے سے پہلے ہی شیر کا ڈھیر کر دیا۔ شہزادہ رشک کے مارے جل گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ سیّد محمود اپنے بھتیجے حسن اور ان کی دلہن کو لے کر دہلی آگئے۔ سید مبارک شاہ کے دربار میں سید حسن کو رسائی حاصل ہوگئی سلطان ان کی استعداد اور شجاعت سے متاثر ہوا اور وہ اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے جارجہ اصل مرکز سکونت قرار پایا۔ سلطان غیاث الدین والیٔ بنگالہ کا داماد ہونا ترقی میں مزید معاون ہوا۔

سیّد محمود سبزواری بیشتر دہلی میں رہے جہاں رفتہ رفتہ ان کے چاروں طرف عقیدت مند جمع ہونے لگے۔ ان میں دو کو خصوصی تقرب حاصل ہوگیا ایک خواجہ تاجر اور دوسرے باوا ملک کے نام سے مشہور تھے۔ خواجہ تاجر جن کے جہاز سمندر پار ملکوں کی تجارت کو جاتے تھے، سیّد محمود کی صحبت کے اثر سے درویشی کی طرف مائل ہوگئے۔ انھوں نے معقول رقم خرچ کر کے ایک مسجد اور ایک گنبد تعمیر کرایا۔ گنبد کو اپنے مرشد کی ابدی آرام گاہ بنانا مقصود تھا۔ سید محمود نے کہا فقیر آزاد ہوتا ہے اور کھلے آسمان کے نیچے پاؤں پھیلا کر سوتا ہے۔ مجھے اس گنبد کی ضرورت نہیں۔ بہت دنوں تک پیر اور مرید میں اصرار و تکرار کے بعد یہ طے پایا کہ جو پہلے اس دنیا سے رخصت ہو وہی گنبد کے اندر دفن ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ خواجہ تاجر پہلے مرے اور وہاں دفن ہوئے آجکل محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے جو تختی لگی ہے وہ وہاں سیّد محمود کے مزار کی نشان دہی کرتی ہے۔ اور یہ کہ مزار کی وضع سے عہد لودی کا فنِ تعمیر واضح ہوتا ہے۔

سیّد محمود کی شہرت مرنے کے بعد بھی قائم رہی مشکل سے کوئی صوفی ایسا ہوگا جس کی سوانح عقل کو حیرت میں ڈالنے والے قصوں کی بھرمار سے خالی ملتی ہو۔ سید احمد خان نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں دہلی کے معروف اولیائے کرام کا مختصر تذکرہ

کیا ہے۔ سیّد محمود سبزواری کی بابت لکھا ہے کہ آپ کو خواص محی العظام، یعنی ہڈیوں کا زندہ کرنے والا۔ اور عوام راجہ ہاڑ گوڑ کہتے ہیں۔ غالباً یہ روایت حبیب اللہ اکبر آبادی کی کتاب ذکر جامع اولیائے دہلی سے مستعار ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک بڑھیا کا بیٹا سفر کو گیا تھا۔ وہ ضعیفہ اس سے بہت محبت رکھتی تھی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی التجا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے از رد ئے مکاشفہ آپ پر ظاہر کیا کہ اس کا بیٹا فلاں جگہ مر گیا ہے اور بجز ہڈیوں کے اور کچھ باقی نہیں ہے۔ وہ بڑھیا بہت روئی اور آپ کے قدموں میں پڑ گئی۔ آپ نے بعجز و انکسار اللہ تعالیٰ کی جناب میں دعا کی وہ لڑکا تندرست وسالم اپنی ماں سے آ ملا۔ جب سے آپ کا لقب محی العظام اور راجہ ہاڑ گوڑ ہو گیا۔ یعنی بادشاہِ استخوانہا۔

سیّد احمد خان کی جماعت کے سرگرم رکن اور اردو کے معروف ادیب ڈپٹی نذیر احمد کے بیٹے بشیر الدین احمد نے "واقعات دارالحکومت دہلی" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب یادگار چھوڑی ہے۔ "حضرت مخدوم سبزواری کی مسجد اور چوکھنڈی" کی تفصیل جلد سوم میں مذکور ہے۔ بقول مولف، چوکھنڈی کے ساتھ ایک چھاپری مسجد ہے۔ مسجد کے رو کار پر جوڑا توڑے دار چھجہ ہے۔ منبر اور اندر کا فرش باقی نہیں ہے۔ مولف نے دہلی کے جتنے آثار کا ذکر کیا ہے ان کی باقاعدہ پیمائش ضروری ہے۔ یہاں بھی وہی اصول ملحوظ رکھا ہے۔ مسجد کے دالان کا رقبہ اونچائی سمیت اور بیرونی صحن کی حدود دے رکھی ہیں۔ مزید یہ کہ موضع شاہ پور جٹ جہاں مسجد اور چوکھنڈی واقع ہے۔ علاؤالدین خلجی کے شہر سیری کی فصیل میں اندر کی طرف ہے۔ بشیر الدین احمد کے بیان کی وضاحت میں اتنا اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ "مخدوم سبزواری" کی مسجد اور مزار کا محل وقوع قطب مینار اور مہرولی سے کچھ فاصلے پر ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول تک یہاں شاہپور جٹ نام کا چھوٹا سا گاؤں تھا اور جاٹ اراضی پر کاشت کرتے تھے۔ ادھر آزادی کے بعد یہ پورا علاقہ شاندار اور خوب صورت کالونی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مزار کے چاروں طرف کشادہ سبزہ زار ہے اور مزار محکمۂ آثار قدیمہ کی نگرانی میں صحیح سالم ہے۔

سادات جارچہ کی نسل سید حسن سے شروع ہوئی۔ ان کے شجرے میں سید حسن کی اولاد کے نام اور بعد والے شاخ در شاخ خاندانوں کے نام ترتیب سے محفوظ ہیں۔ سید محمود سبزواری کے دوسرے بھتیجے سید علاؤالدین تھے۔ انکے بیٹے سیّد علی، سادات چھپولس کے جدّاعلیٰ ہیں۔ وہ ذرا بعد میں، یعنی سیّد محمود کی وفات کے بعد، بروایت مشہور چالیس سال بعد سبزوار سے آئے۔ قیاس کہتا ہے کہ کشمیر سے وارد ہوئے اور چچا کے ترکے میں حق کا دعویٰ کیا۔ دہلی میں سیدوں کی حکومت کا اختتام اور لودیوں کے عہد کا آغاز تھا۔ سلطان بہلول لودی کے [illegible] کے مطابق انھوں نے جارچے کی جائیداد کا چوتھائی حصہ پایا جو ان کی اولاد کو منتقل ہو گیا۔ وہ چہارم والے کہلاتے ہیں۔ جارچہ چھپولس کی روایت کے مطابق سید محمود نے خواب میں اپنے مرید کو بشارت دی کہ میرے بھتیجے آتے ہیں ایک روٹی پکاؤ اور چار [illegible] ے کر کے ان کو دے دو۔ سلطان کے دربار میں اس خواب کی تعبیر یہ ٹھہری کہ چوتھائی جارچہ سیّد علی کو، اور باقی تین حصّے دیگر دعویداروں کو دے دیے جائیں۔ سلطان بہلول نے اتفاق کیا اور مُہری فرمان جاری کر دیا۔ چہارم والوں کے علاوہ سید علی کی اولاد چھپولس میں آباد ہوئی اور پھیلی۔ وہاں پہلے سے پٹھان اور راجپوتان گہلوت آباد تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ انھوں نے سکونت ترک کر دی۔ سیّد علی نے راجپوتوں کی اراضی اپنے زرِ خاص سے خرید لی۔ سادات چھپولس کے ایک خاندان میں سے کچھ لوگ نواحی گاؤں نور پور میں جا کر رہنے لگے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ نور پور بھی اگر پورا نہیں تو اس کا کچھ رقبہ سادات کی مدد معاش، یعنی معافی کا گاؤں تھا یہ بھی ممکن ہے کہ میر سید علی اور ان کی اولاد نے وہاں اراضی خریدی۔

جارچہ چھپولس کے سیّدوں سے سنہ ۱۹۴۷ عیسوی کے قبل تک دہلی بھری پڑی تھی۔ وہ لوگ سید محمود دبر قعہ پوش اور اپنے دیگر اجداد کے یوم وفات کو "عرس" کہتے آئے ہیں جسکی تاریخی وجہ ہے دلّی والے داد کا عرس، زمانۂ قدیم میں جیسے بھی منایا جاتا ہو۔ ادھر کچھ عرصے سے مجلس کا رواج ہو گیا تھا۔ مزار پر لوگوں کا مجمع پہنچتا تھا اور مجلس عزا منعقد ہوتی تھی۔ بزرگوں سے سنا ہے کبھی میلہ بھی لگا کرتا تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد دہلی کے زمین و آسمان بدل گئے۔

## دوسرا باب

# مدد معاش

بہارستان شاہی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سادات جارچہ نے وہاں آباد ہوکر بہت جلد گنگا جمنا کے درمیانی علاقے میں اپنا بھرپور اثر قائم کرلیا تھا۔ سلطنت دہلی کی طرف سے امن وقانون برقرار رکھنے کی خدمت ان کے سپرد تھی۔ ان کی جانفشانی سے سنبھل تک رہزنی اور قتل وغارت کی وارداتیں بند ہوگئی تھیں۔ اگر قطاع الطریق کسی کا مال لوٹتے یا چراتے تھے تو ان کے خوف سے خود ہی لاکر جارچے میں جمع کردیتے تھے۔ مؤرخ کے الفاظ ملاحظہ ہوں: (۱) تمام صوبۂ سنبھل درمیان دوآبہ تنخواہ جاگیر ایشان (میر سید حسن وجماعت ایشان) مقرر فرمودند، وپرگنہ مذکور در نواحیِ دہلی جہت توطنِ ایشان دادند، وآن جماعت بموضع جارچہ سکونت ورزیدہ تمام متمردان آن نواحی را زبون وزیر ساختہ باج وخراج می گرفتند۔ (ترجمہ) سلطان کے حکم سے تمام صوبہ سنبھل اور دوآب (گنگا جمنا) کا درمیانی علاقہ میر سید حسن اور ان کی جماعت کے لیے تنخواہ جاگیر کے طور پر مقرر ہوگیا۔ پرگنہ مذکور "وطن" کی مدد میں عنایت کردیا گیا سادات کی جماعت نے جارچہ میں سکونت اختیار کرلی اور اس نواح کے تمام باغیوں

کو دبا دھمکا کر باج اور خراج وصول کرنے لگے۔ (۲) درمیانِ دوآب جہت ناامنیت درمحل مخوفہ تا نجات نشاندند۔ اگر کسی درمحل مخوفہ بیک واسطہ بارے در راہِ افتادہ از ترس وھیبتِ آن طائفہ (جماعت سادات) آن بار بر سر و دوش خود گرفتہ متمردانِ نواحیٔ بقصبہٗ جارچہ رسانیدند، و این حال بر عالم و عالمیان معلوم است۔ (ترجمہ) سادات نے دوآب کے علاقے میں بدامنی روکنے کی خاطر تھانے مقرر کر دیے۔ اگر کسی مسافر کا سامان کسی وجہ سے وہاں کے خوفناک راستوں میں گر جاتا تھا تو جماعت سادات کی ہیبت اور ڈر سے نواح کے باغی خود اپنے سر اور کاندھوں پر اٹھا کر جارچے پہنچا دیتے دیتے تھے۔ یہ حال دنیا بھر کو معلوم ہے۔ (بہارستان شاہی۔ ترتیب پروفیسر اکبر حیدری ص ۲۶۳ ص ۲۶۴)

ہندوستان میں محمد بن سام غوری کی فتح کے بعد دہلی مرکز سلطنت بن گئی تو ایک خاص ادارہ وجود میں آیا جو مدد معاش کہلاتا تھا۔ تقریباً التمش کے وقت سے اس کے قواعد وضوابط وضع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ ادارہ وسعت اختیار کرتا گیا۔ مدد معاش اصل میں سادات اور شیوخ کو دی جاتی تھی مغلوں کے عہد تک مدد معاش کے حق داروں میں بہت سے لوگ شامل کر لیے گئے مثلاً وہ ایرانی اور تورانی عورتیں جن کے شوہر ان کو بے سہارا چھوڑ کر مر جاتے تھے علمائے دین، مفتیانِ متین، اطبائے حاذق، اہل تنجیم اور دیگر کمالات میں ممتاز ہستیاں وغیرہ جن کو مجموعی طور سے اہل سعادت کہا جاتا تھا۔ ابتدا میں مدد معاش کا عطیہ حاصل کرنے والوں کا فریضہ بظاہر فقط اتنا سا ہوتا تھا کہ مسجدیں آباد رکھیے، نمازوں کی امامت کیجیے مکتب اور مدرسے کھولیے، لوگوں کو اللہ رسول کی باتیں بتائیے، علوم کی ترویج میں لگے رہیے اور ہر وقت جہاں بھی بیٹھے ہیں قال اللہ قال الرسول کے مشاغل سے کام رہنا چاہیے۔ ضمناً بادشاہ وقت اور حکومت کے لیے دعا بھی کرتے رہیے۔ جہانگیر تو زک میں سادات کو لشکرِ دعا کہتا ہے۔ قاعدہ یہ تھا کہ ایک دو گاؤں دیدیے گئے یا کسی گاؤں میں تھوڑی سی زمین کا عطیہ منظور ہو گیا جو گذر بسر کے لیے کافی

اور کفیل ہو۔ اس قسم کی زمین پر مال گزاری معاف تھی۔ اور دیگر محصولات بھی نہیں لیے جاتے تھے لہٰذا اصطلاحِ عام میں اس کو آراضی معافی کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ سادات و شیوخ کی اولادیں وہیں جاکر آباد ہو جاتی تھیں۔ سیّد محمود سبزواری کو جارچہ اور نواحی علاقہ، چھولس، نورپور وغیرہ، صوفی ہونے کے سبب سے نہیں ملا تھا۔ عموماً صوفی مدد معاش کی طرف دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ سید ہونے کی بناء پر عطا ہوا تھا۔ جو بعد میں ان کے بھتیجوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔

مدد معاش کی معنویت اور اہمیت بتدریج بڑھتی گئی اور حکومت اس طبقے سے بعض ضروری کام بھی لینے لگی۔ مدد معاش کا فرمان جاری ہونے سے پہلے سادات اور شیوخ کے حسب نسب کی باریک چھان بین اور شجرے کی خوب تحقیقات کر لی جاتی تھی پھر بھی مسلسل نظر رکھی جاتی تھی کہ وہ اپنے منصب سے گرنے نہ پائیں اور ان کی استعداد میں کمی واقع نہ ہو ورنہ مدد معاش کی ضبطی کا خطرہ بھی تھا۔

جارچہ چھولس کی زبانی روایات سے تصدیق ہوتی ہے کہ جس مرحلے پر میر سیّد حسن سبزواری کو سلطان دہلی سید مبارک شاہ کے دربار میں جگہ ملی وہ بڑا ہی نازک وقت تھا اور چاروں طرف بحران کی سی کیفیت نظر آتی تھی۔ سید مبارک شاہ کا سال وفات ۸۳۷/۱۴۳۴ء ہے۔ امور مملکت پر حکومت کا ہاتھ نہایت ڈھیلا ہو چکا تھا۔ خاص نواح دہلی میں پھیلی ہوئی بدامنی کو دبانا بھی حکومت کے اختیار کی بات نہ رہ گئی تھی۔ قصہ یوں ہوا کہ ایک دفعہ قصبہ ڈاسنا معمولہ دارالخلافت دہلی کے کچھ مسلمان دربار میں حاضر ہوئے اور مقامی راجہ کے ظلم و ستم کی شکایت کر کے رونے لگے۔ انھوں نے بڑے درد کے ساتھ اپنی سرگزشت سنائی کہ راجہ کے ہاتھوں ان کی عزت و ناموس بھی محفوظ نہیں ہے۔ ڈاسنہ دہلی سے کم و بیش بیس میل کے فاصلے پر ہو گا۔ راجہ مہلک کے قبضہ میں تین سو ساٹھ مواضع تھے۔ اس کے اقتدار کا مرکز لوہاگڑھ، موجودہ کلوندا، دیہاتی نوعیت کی چھوٹی سی جگہ تھی۔ مطلب یہ کہ راجہ کے پاس غیر معمولی فوجی وسائل نہ رہے ہوں گے پھر بھی

معاملہ سلطنت دہلی کے قابو سے باہر تھا۔ سلطان مبارک شاہ نے فریادیوں کی
المناک کہانی سن کر اہل دربار پر نظر ڈالی تو ہر طرف سکوت کا عالم نظر آیا۔ میر سید حسن
سبز داری کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں اس مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔
وہ حسب روایت معہ اپنے ساتوں فرزندوں اور ایک ہزار جوانان جرار آزمودہ کار
کے دریائے جمن کے پار اترے تو لشکر کفار جو سرحد پر تعینات تھا مقابل ہوا اور
ان کو روکا۔ کیونکہ اس سے پیشتر بھی سلطان دہلی نے فوج کشی کی لیکن ہر مرتبہ
لشکر کفار نے پسپا کر دیا بدیں وجہ لشکر کفار دلیر و شیر دل ہو گیا تھا۔ واقعات کا خلاصہ
یہ کہ اس مرتبہ راجہ نے ہزیمت پائی اور فتح میر حسن کے ہاتھ آئی۔ راجہ مہلک کے
ساتھ پہلا معرکہ اس لیے بھی فیصلہ کن ثابت نہ ہو سکا کہ علاقے میں گھنا جنگل تھا۔
معاملہ راجہ کے اقتدار کو ختم کرنے کا تھا۔ مدتوں کی زحمت کے بعد ایک دفعہ ایسا اتفاق
ہوا کہ راجہ مہلک گنگا اشنان کے ارادے سے چلا۔ جاسوس نے آکر میر سید حسن
کو خبر دی کہ راجہ مع اپنی دختر کے رتھ پر سوار ہے اور رتھ کے پیچھے ایک گھوڑی
کوتل جا رہی ہے جو ایسی برق رفتار ہے کہ راجہ اس پر سوار ہو گیا تو گرد قدم
پانا مشکل ہے صاف نکل جائے گا۔ میر سید حسن دوسری منزل تک تعاقب کرتے رہے
بالآخر گنگا کچھ دور رہ گئی تھی کہ میر سید حسن نے آدھی رات بعد اپنے سپاہیوں کی جمعیت
کو دو حصوں میں بانٹا اور راجہ کی سواری کو گھیرے میں لے کر جنگ کا آغاز کر دیا۔
راجہ کے ہمراہی کچھ دیر تک لڑے لیکن آخر ش پاؤں اکھڑ گئے اور جان بچا کر بھاگ
نکلے۔ میر سید حسن کی تدبیر ایک کارنامہ سمجھی گئی کہ راجہ مہلک کو زندہ پکڑ کر معہ دختر
سلطان مبارک شاہ کے سامنے رکھ دیا۔ سلطان نے اس دختر کو میر سید حسن کے
حوالہ کیا۔ وہ ایمان لے آئی۔ تابندہ بی بی نام رکھا گیا اور میر سید حسن نے اپنے بڑے
صاحبزادے سید ناصر سے اس کا عقد کر دیا۔ سید محمود سبز داری اس وقت تک حیات
تھے۔ وہ تشریف لائے۔ بھتیجے کو گلے لگایا اور تمنا ظاہر کی کہ فرزند تولد ہو تو ان
کے نام پر نام رکھا جائے اتفاقاً اس عفیفہ کے شکم مقدس سے لڑکا پیدا ہوا وہ بزرگ

سید محمود روحی یا روحانی کہلائے۔ اس لیے کہ اپنے جد امجد کی طرح وہ بھی پارسائی اور روحانی برکتوں کے لیے مشہور تھے۔ وہی سادات سبزوار کے پہلے فرد ہیں جو قصبہ جار چہ میں مدفون ہوئے۔ میر سید حسن اور میر سید علی نے دہلی میں سید محمود برقعہ پوش کے جوار میں مزاروں کی جگہ پائی۔ جہولس میں سب سے پہلا مزار میر سید علی کے بیٹے سید علی اصغر کا ہے۔

دہلی میں تغلق خاندان کے بعد سید سلسلے کی حکومت اس قدر مختصر رہی، یعنی چار حکمراں، کہ اکثر مورخین اس کو افاغنہ لودی کے ساتھ ملا کر ایک ہی عہد شمار کرتے ہیں اور سید و لودی ایک ساتھ زبان سے نکلتا ہے۔ اصل میں تغلقوں کے آخری زمانے میں زوال کے آثار صاف نمایاں تھے۔ دار السلطنت میں امرا کی کشمکش اور ہنگامہ پیکار میں افغان امرا کا پلہ ذرا سا بھاری ہو گیا تھا۔ وہی وقت تیمور کے حملہ کا ہے ــــ (۸۰۱/۱۳۹۸) جب تیمور لنگ دہلی کو تباہ اور غارت کر کے جانے لگا تو اس نے سید خضر خان نام کے ایک امیر کو بلا کر کہا کہ میں نے دہلی کی سلطنت تم کو بخشی۔ سید خضر خان کے حسب نسب کی روئیداد یہ ہے کہ ایک افغان امیر نے ان کو گود لے کر پالا جو بذات خود بے اولاد تھا۔ اس امیر نے ایک دن مشہور صوفی سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی دعوت کی اور اپنے گویا متبنیٰ بیٹے کو آفتابہ دے کر مخدوم جہانیاں کے ہاتھ دھلانے کھڑا کیا۔ حضرت مخدوم جہانیاں نے لڑکے کی صورت کو غور سے دیکھا اور ہاتھ کھینچ لیے۔ فرمایا، مجھے علم قیافہ بھی آتا ہے، میں اس سے ہاتھ نہ دھلواؤں گا یہ لڑکا سید ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں کی تصدیق اور شہادت کے نتیجہ میں خضر خان سید کہلانے لگے۔ سید خضر خان کے بعد ان کا بیٹا سید مبارک شاہ اور اس کے جانشین محمد شاہ اور عالم شاہ اور پھر سلطنت بہلول لودی کے پاس چلی گئی۔ سلطان بہلول کے جانشین سکندر لودی کو سیاسی صورتحال نے دہلی سے آگرہ منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔ (۹۱۰/۱۵۰۴) پھر کم و بیش کوئی ڈیڑھ سو برس تک آگرہ ہی مرکز سلطنت رہا، یہاں تک کہ شاہ جہاں کا دور آ گیا اور وہ

دوبارہ دارالخلافہ دہلی واپس لے آیا (۱۰۵۸/۱۶۴۸) حقیقت میں تغلق خاندان کے زوال اور تیمور کے حملۂ دہلی کے بعد بہت بڑی ذمہ داری افاغنۂ لودی کے سر آن پڑی ۔ سلطنت کا نام ونشان اور اس کی مرکزیت کم ازکم علامتی طور سے برقرار رکھنا ان کے لیے بھاری آزمائش بن گیا ۔ اول تو سلطان محمد بن تغلق کی عجیب وغریب عادتیں اور مضحکہ خیز حرکتیں دہلی سلطنت میں انتشار کا بیج بو چکی تھیں ۔ تیمور کے حملے نے رہی سہی جان نکال دی ۔صوبائی حاکم خود مختار ہو گئے اور الگ حکومتیں قائم کر کے بیٹھ گئے ۔ جن کے خاندانی سلسلے کم و بیش اگلی صدی تک چلتے رہے ۔ لودیوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو بنگال ، کشمیر، جون پور ، کالپی ، گجرات ، مالوہ ، بیدر اور گلبرگہ ، غرض کہ اتنے سارے علاقوں میں آزاد حکومتیں قائم تھیں اور سلطنت کی مرکزیت نہایت ضعیف ہو چکی تھی ۔ سلطان سکندر لودی دہلی کو خیرباد کہہ کر دارالسلطنت آگرہ لے گیا ۔ اس صورت حال پر نظر ڈالنے سے یہ بات تھوڑی بہت ضرور سمجھ میں آجائے گی کہ نواحِ دہلی کو بدانتظامی سے محفوظ رکھنا اور وہاں بدامنی روکنا جن لوگوں کے ذمّے تھا وہ مدّت تک کیسے مشکل مسائل سے جرأت کے ساتھ نمٹتے رہے ۔ انھوں نے خاموشی سے اپنی چھوٹی سی بساط کے مطابق سلطنت کی جو خدمت انجام دی ۔ اسے گرانقدر کہنا فرض کیجیے مبالغہ اور لفظی فضول خرچی ہو تو لائق ستائش اور قابل قدر کہنے میں کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہیے ۔ بہ حقیقت ایک قاعدہ کلیہ بن کر بہت پہلے سے روشن ہو گئی تھی ، اور آج کل کے مورّخین اس کا اعتراف بھی کرنے لگے ہیں ۔ کہ بار بار سلطنت کی گرتی ہوئی دیوار یا اپنے گاؤں کی زبان میں عرض کیا جائے ، پھسلتا ہوا چھپّر ، ہمیشہ وہ لوگ سنبھالتے رہے ، جو حادثاتِ زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے اصلی وطن ، یعنی مرکزی ایشیا اور ایران کے دور افتادہ مقامات کو ترک کر کے ہندوستان چلے آتے تھے ، ان کو عالم غربت کا غم دور کرنے ، جگہ جگہ ٹھکانے بنا کر رہنے ، اور اجنبی ماحول کو سازگار بنانے میں بہت کچھ دشواریاں پیش آتی تھیں اور طرح طرح کی سختیاں جھیلتے تھے ، مختصر یہ کہ اس طبقے کی جدّوجہد کے طفیل میں ہندوستان صدیوں تک دارالامان اور

جنت نشان کہلایا گیا۔ جدید دور میں تاریخ کے دانش وروں نے ایک اصطلاح وضع کی ہے جس کو وہ "تازہ خون یا نیا خون" کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب تک باہر کے لوگ برصغیر ہند میں آتے رہے مسلمانوں کی سلطنت کا پہیہ خوب لڑھکتا رہا۔ عالم گیر کے زمانے تک یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ مغلوں کے زوال کی متعدد اور تہ در تہہ وجوہات کے ضمن میں یہ بات زور دے کر کہی جاتی ہے کہ باہر سے "تازہ خون" وارد ہونا بند ہو گیا۔ اس کو بنیادی وجہ نہ سہی البتہ ایک سنگین اور دل میں کھٹکنے والی وجہ ضرور تصور کیا جاتا ہے۔ میر سید حسن سبزواری نے دہلی کے شمال مشرق میں جمنا سے اوپر جس طریقے سے راجہ مہلک کے خلاف کارروائی کی، اس کی شورش اور سرکشی کو دبایا۔ اور تقریباً دو ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے فتنہ و فساد کو رفع دفع کیا۔ وہ اس قاعدہ کلیہ کی صریحی مثال ہے کہ "تازہ خون" اپنے اپنے مرکزوں کی نبط ہر مختصر حدود میں کن مشکلات سے نبرد آزمائی کرتا تھا۔ اور حکومت کو کس طرح دردسر سے بچائے رکھتا تھا۔ سلطنت محض ایک سلطان یا شہنشاہ کی کارگزاری کا نام نہیں ہے۔ اس کی گاڑی چلانے میں لاکھوں آدمیوں کو جان لگانی پڑتی ہے جن کو تاریخ یاد بھی نہیں رکھ پاتی۔

جارچے کا افسانوں میں لپٹا ہوا ماضی اس نقطے سے سامنے آتا ہے کہ میر سید حسن سبزواری کا لشکر راجہ مہلک کے خلاف فوج کشی کرتے وقت وہاں ٹھہرا۔ جیسا کہ روایت بیان کرتی ہے۔ سپاہیوں نے ایک شب اور ایک روز تکالیف بے آبی کھینچی اور تشنہ لبی سے دم لبوں پر آیا۔ میر سید حسن کو خواب میں ان کے چچا نے بشارت دی کہ اے فرزند، وہاں چار کنوئیں موجود ہیں۔ فوج نے گھنے جنگل کی جھاڑیوں میں کنوؤں کو ڈھونڈا۔ ان کا پانی صاف کیا اور سیراب ہوئی۔ وہ مقام چہار چاہ کہلایا۔ بعد میں کثرت استعمال سے بگڑ کر جارچہ ہو گیا۔ کنوؤں کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے کبھی بستی آباد تھی۔ وہاں بن کھڑے ہو گئے۔ دوبارہ لوگ آ گئے اور اجڑے گاؤں کو پھر سے بسا لیا۔ مگر اندازہ ہوتا ہے کہ ڈیرا ان

ہوجانے کے باوجود کاغذات سرکار میں دیہہ کا اندراج چلتا رہا۔ وہی دیہہ اور اس کا ملحقہ علاقہ سید محمود سبزواری کے نام مدد معاش میں لکھ دیا گیا جس کو ان کے بھتیجوں کی اولاد نے آپس میں بانٹ لیا۔ حال میں (۱۹۸۲ عیسوی) سید مسعود الحسن اور سید آل نقی کی شائع شدہ کتاب "تذکرۃ الانساب سادات جارچہ" میں کنوؤں کے علاوہ مسجد کا بھی حوالہ ہے، یعنی ایک مسجد کی بنیادیں بھی پاس وہیں کہیں برآمد ہوئیں۔ ان بنیادوں پر دوبارہ مسجد تعمیر ہوگئی۔ اس کے معنی یہ کہ پہلے بھی مسلمان بستے تھے جو آبادی چھوڑ کر وہاں سے کہیں اور چلے گئے۔ چار کنوئیں برآمد ہونے کی روایت بیشک عام ہے۔ مسجد کی روایت ضعیف معلوم ہوتی ہے۔ جارچے کی موجودہ جامع مسجد کی کرسی نمایاں طور سے بلند ہے جس کا مغلوں سے پہلے طریقہ نہ تھا۔ مغلوں کے زمانے سے بلند کرسی کا رواج شروع ہوا۔ اس سے عمارت کی شان بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستانی عمارتوں میں یہ رعایت خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھی گئی۔ ہمارے فن تعمیر کے اصول ایران سے مستعار ہیں مگر بلند کرسی کو ہندوستانی اضافہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ ایران کی سب سے شاندار مسجد اصفہان میں واقع مسجد شاہ ہے۔ اس کی کرسی بہت اونچی نہیں ہے۔ وہیں نزدیک مسجد شیخ لطف اللہ ہے۔ اس کی کرسی بالکل زمین کے برابر ہے۔ شیراز کی قدیم جامع مسجد، جس کی بابت مشہور ہے کہ شیخ سعدی وہاں نماز پڑھتے تھے، اس کو بھی کرسی دے کر نہیں بنایا گیا۔ یہی بات مشہد مقدس میں حرم امام علی رضا علیہ السلام سے ملحقہ مسجد گوہر شاد کے لیے کہی جاسکتی ہے۔ یہ مسجد تیمور کی ملکہ گوہر شاد خاتون نے بنوائی تھی۔ جارچے کی جامع مسجد کا امتیازی وصف اس کی بلند کرسی کو سمجھنا چاہیے۔ یقیناً یہ سیدوں کی آمد کے بعد کی تعمیر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے گنبدوں سے بھی کچھ ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے۔ مغلوں کے وقت سے گنبد کے نیچے کچھ ردّے لگا کر الگ ابھار دیتے تھے اور گنبد کا بالائی حصّہ بھی اوپر کی طرف اٹھنے لگا تھا۔ شاہجہاں کے عہد تک پیاز کی سی شکل کے گنبدوں کا رواج عام ہوگیا۔ اور امتیاز کی خاطر وہ پیازی گنبد کہلانے لگے۔ دوسری قابل ملاحظہ بات یہ کہ ایک گنبد کے بجائے

تین گنبد بنائے جانے لگے۔ مغل عہد میں مسجد سازی کے فن کا مثالی نمونہ دہلی کی جامع مسجد ہے۔ البتہ چھولس سے متعلق کوئی قصّہ یا افسانہ نہیں ہے۔ وہاں آبادی میر سید علی کے پہنچنے سے قبل واقعی طور سے موجود تھی۔ ویسے بستی میں رہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہ رہی ہوگی۔ چھولس کی قدیم مسجد وہاں پہلے سے آباد پٹھانوں کی چھوڑی ہوئی یادگار ہے۔ مسجد کی بھاری دیواریں، چوڑے آثار، کم بلند نوک دار محرابوں کے تین در، درمیانی در ذرا سا اونچا، مگر اتنا نہیں کہ آدمی سر اٹھائے گذر جائے۔ پہلو کے اس قدر نیچے کہ نمازی خاصے جھک کر داخل ہوتے ہیں۔ کٹورے کی وضع کا ایک مدّور گنبد، اس کے دونوں طرف آگے والی دیوار کے اوپر دو مختصر اونچائی کے چوکور مینار جن کے آثار نیچے سے اٹھ کر بلند ہوتے گئے ہیں۔ یہ نقشہ عہد لودی سے قبل کے فنِ تعمیر کی گواہی دیتا ہے۔ درمیانی در کے اوپر مصنوعی محراب میں خاصا بلند ایک پتھر نصب ہے جس کی تحریر امتدادِ وقت کے ساتھ مٹ گئی ہے اور پڑھی نہیں جاتی۔ چھولس کے لوگ ہر سال رمضان میں تھوڑی سی مرمت اور سفیدی کرا لیتے ہیں۔ آج تک مسجد ویسی ہی صحیح سالم کھڑی ہے۔ جارچے میں ایک عمارت باون ڈیوڑھی بہت مشہور تھی۔ یعنی باون دروازوں کا مکان کہنا چاہیے۔ مدتیں گذریں اس کا وجود ختم ہوگیا۔ جہاں عمارت تھی وہ محلہ باون ڈیوڑھی کہلاتا رہا۔ اس سے سیدوں کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ چوپال کلاں اب بھی ہے مگر اس کی وضع بدل گئی ہے۔

میر سید حسن سلطان مبارک شاہ کے دربار کی مقتدر شخصیت تھے۔ مگر یحییٰ سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی میں ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔ یہ سوال ذرا سا صفائی کا محتاج ہے یحییٰ سرہندی مقدمے میں کہتا ہے کہ میرا مقصد سلطانِ عہد کے دربار میں رسائی حاصل کرنا تھا اور کوئی تحفہ ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کتاب سے زیادہ کوئی چیز قابل قدر نہیں ہوتی، اس لیے یہ تاریخ ترتیب دی اور اپنے مربّی کا نام زندہ رکھنے کی خاطر کتاب کا نام تاریخ مبارک شاہی قرار دیا۔ وہ معاصرین کے احوال پر خصوصی توجہ نہیں دیتا اور اپنے زمانے تک آتے آتے اختصار سے کام لینے لگتا ہے۔ اصول

بھی یہی بتاتا ہے کہ تاریخ ماضی کی روئیداد ہوتی ہے۔ ہمعصروں کے واقعات تاریخ نویسی کے زمرے میں نہیں آتے۔ اگر خاص سید مبارک شاہ کے عہد کی تاریخ لکھی گئی ہوتی تو اس میں میر سید حسن اور ان کی اولاد کو ضرور جگہ ملتی۔

ہندوستان ہمیشہ سے دیہات کا ملک تھا اور آج تک معروف اصطلاح ہے کہ اصلی ہندوستان گاؤں میں رہتا ہے۔ مسلمان شہری تہذیب لے کر داخل ہوئے اور شہر بساتے چلے گئے۔ البتہ تغلق سلسلے کے آخری زمانے تک تجربہ ان کو یہ نکتہ سکھا چکا تھا کہ امور ملکی کے بہتر نفاذ اور اطمینان بخش کارکردگی کے لیے دیہات پر کڑی گرفت اور اندرونی علاقوں میں اچھی طرح عمل دخل ضروری ہے۔ اسی زمانے سے مدد معاش کے عطیات میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ مدد معاش پانے والے سادات اور شیوخ کا شہری مرکزوں پر تعینات فوجدار اور دوسرے افسروں سے رابطہ رہتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر فوجدار ان کو مشورے کے لیے بلا بھیجتا تھا۔ وہ جو تجویزیں پیش کرتے تھے اور مقامی صورت حال جس عنوان سے بتاتے تھے اس پر غور سے سماعت ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر وہی لوگ مقامی آبادی کی احتیاجات اور عرضداشتوں سے فوج دار کو باخبر رکھتے تھے۔ ان کی نیک نیتی، شرافت و دیانت اور انصاف پسندی کی وجہ سے مقامی رعایا ان کا احترام کرتی تھی اور بالآخر ان کے اثر و اعتبار کا فائدہ حکومت کو پہنچتا تھا۔

سید مسعود الحسن اور سید آل نقی نے اپنے تذکرۂ سادات جارچہ میں بابر کا ایک فرمان نقل کیا ہے جو سادات جارچہ کے نام اس بادشاہ کی طرف سے جاری ہوا تھا۔ یعنی یہ پانی پت کی پہلی لڑائی (۱۵۲۶/۹۳۲) کے بعد کی دستاویز ہے۔ خوش نصیبی کی بات ہے کہ اس فرمان کا مسودہ محفوظ رہ گیا۔ اس وقت تک سادات جارچہ کے اجتماعی وجود کا ثبوت اس دستاویز نے فراہم کردیا۔ دوسرے اس کے ذریعے سادات کے سابق عطیات کی از سر نو توثیق اور منظوری ہو گئی۔ نیا بادشاہ اور نیا فرمان ایک قانونی تقاضا تھا۔ قاعدے کے مطابق ہر بادشاہ کی تخت نشینی کے بعد تجدید

فرمان ہوتی تھی۔ میرے والد سید علی ہادی کے پاس چھولس سے متعلق آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا فرمان موجود تھا۔ کوئی صاحب مانگ کر لے گئے کہ دیکھوں گا اور پھر واپس نہ دیا۔ میرے والد کو ان کا نام یاد نہ رہا۔ وہ اس فرمان کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ کسی کتاب خانے میں محفوظ ہو جاتا تو اچھی بات تھی۔ فرمان قیمتی ورثہ اور قومی امانت ہیں۔ ایک تو ان کی آبائی شرافت و نجابت ثابت ہو جاتی جن کے بزرگوں نے شاہی فرمان پائے۔ دوسرے جن شاہانِ سلف نے فرمان جاری کیے ان کی یاد کو باقی رکھنا ہمارا مقدس فریضہ ہے۔ اقبال نے کہا ہے: اپنے شاہوں کو یہ اُمّت بھولنے والی نہیں۔ بہر حال بابر کا فرمان خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ معاملہ یہ تھا کہ وہ لودیوں سے سلطنت چھین کر بالکل ہی نئے سلسلے کی بنیاد ڈال رہا تھا۔ بابر کے جانشینوں کا عہد ہندوستان کے معاشرتی نقشے میں نئی تبدیلیوں کا عہد تصور ہوتا ہے۔ مگر مدد معاش کی نوعیت ویسے ہی برقرار رہی اور اس کی افادیت کے پیش نظر کسی نے اس کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اکبر کے زمانے میں ذرا سی گڑبڑ ہوئی، مگر مجموعی طور سے مدد معاش سے استفادہ کرنے والے طبقے نے زیادہ استحکام کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ بابر کے بعد ہمایوں ٹھیک سے قدم جما بھی نہ پایا تھا کہ افغان سردار پھر سے اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شیر شاہ اور اس کے بیٹے سلیم شاہ کا عرصۂ حکومت تقریباً چودہ برس شمار ہوتا ہے۔ شیر شاہ کے زمانے میں بھی مدد معاش کی کیفیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ شیخ کبیر نام کا ایک افغان مورخ جہانگیر کے دور میں اپنی قوم کی تاریخ "افسانۂ شاہان" کے عنوان سے ترتیب دیتا ہے۔ اس نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ کہتا ہے کہ شیر شاہ کے دربار میں دو قاضی زادے آئے اور استغاثہ پیش کیا کہ فلاں علاقے کے عامل نے ہماری مدد معاش ضبط کرلی۔ شیر شاہ نے ان سے فقہ کے کچھ مسائل دریافت کیے اور علمی انداز کی گفتگو کی۔ وہ دونوں فقہ سے ناواقف بلکہ سراسر جاہل نکلے۔ بادشاہ بڑی کشمکش اور حیرت میں پڑ گیا، کہنے لگا۔ میں بھی اصل میں مدرسے کا فاضل ہوں اور باقاعدہ دستار بندی ہوئی تھی۔ حکومت کے مشاغل نے سب کچھ ذہن سے نکال دیا۔ پھر بھی

بنیادی اصول فقہ آج تک نہیں بھولا ہوں۔ تم لوگ کیسے قاضی زادے ہونے کے مدّعی ہو کہ فقہ کے مبادیات بھی نہیں جانتے۔ اگر لیاقت کا معیار یہ قرار پاگیا تو مسند قضا کیا زیب دے گی۔ میری تاکید ہے کہ ذاتی قابلیت بڑھاؤ اور خود کو اپنے آبائی منصب کا اہل ثابت کرو۔ علمی استعداد نہ رکھنے والوں کی مدد معاش چھین لی جائے تو تم خود انصاف سے بتاؤ کونسی زیادتی کی بات ہوئی۔ خیر، بہر حال تم میرے پاس تک آئے ہو تو مدد معاش بحال کیے دیتا ہوں۔ شیر شاہ کی اس تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ مدد معاش پانے والے کس درجے کے لوگ ہوتے تھے۔ اور حکومت کی نظر میں ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مدد معاش سے فیضیاب اور ممتاز طبقے کا سیاسی وزن اور اخلاقی وقار اپنی جگہ مسلم الثبوت حقیقت، مگر اقتصادی اعتبار سے وہ اکثر و بیشتر نہایت معمولی اور سادہ وضع کے لوگ تھے۔ ذاتی زندگی میں بالکل مفلس اور مفلوک الحال نہ سہی، پھر بھی ان کا معیار غریبوں کی سطح سے زیادہ قریب تھا، اور ان کے خاندانوں کی فی کس درآمد کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ واجبی سی رقم اور زرعی جنس ان کے گھروں میں آتی تھی۔ مقبوضہ آراضی بس یہ کہیے کہ گذر بسر کی کفیل تھی۔ بعض اخاص مقامات کے حضرات، مثلاً سادات بارہہ وغیرہ، اس زمرے میں شمار نہیں کیے جائیں گے۔ وہ منصب داری نظام میں جگہ پا گئے تھے اور بڑے بڑے فوجی عہدوں پر فائز تھے یا دیوانی کے اہم فرائض انجام دیتے تھے۔ محمد صالح کنبو صاحب شاہجہاں نامہ اپنی تاریخ میں شاہجہاں کی حکومت کے منصبداروں کی فہرست دیتے ہیں۔ اس میں ہفت ہزاری سے لے کر پانصدی تک چھبیس نام سادات بارہہ کے ہیں وہ بڑے لوگ تھے۔ عام طور سے ملک بھر میں پھیلے ہوئے سادات و شیوخ کا شیوہ اور دستور یہ تھا کہ قناعت کا دامن مضبوطی کے ساتھ ہاتھ میں تھامے رکھیے، عموماً تنگدستی تاک لگائے رہتی تھی اور ذرا سی بے احتیاطی پر آن دباتی تھی۔ قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ کچھ ایسے بھی ہوں جو تنگ دستی کو خاطر میں نہ لائیں اور فاقہ مستی سیکھ جائیں تو یہ ان کی ہنرمندی۔ اس سے بھلا کون رد کرتا

ہے۔ تاریخ کے طولانی پس منظر میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طبقہ کو بہت کم نشیب و فراز کا منہ دیکھنا پڑا۔ اکبر کے وقتوں میں ایک مرحلہ ضرور ایسا آیا جب یہ لوگ کچھ عرصہ کے لیے سختی اور پریشانی کی آزمائش سے گزرے، وہ بھی سب نہیں، ہوا یہ کہ اکبر کے بہت سے اقدامات سادات و شیوخ کو اچھے نہ لگے، مثلاً دربار میں بادشاہ کو سجدہ اور دین الٰہی کا اعلان وغیرہ۔ انھوں نے کھل کر بیزاری کا مظاہرہ کیا اور حکومت کا ناک میں دم کرنے کی نیت سے متحد ہو گئے۔ حکومت کی طرف سے انتقامی جواب یہ دیا گیا کہ اچھا، مدد معاش کی زمینوں کا پورے ملک میں حساب کتاب کیا جائے گا۔ ستم بالائے ستم اور ذلّت بالائے ضرب، ان پر مفت خور ہونے کی تہمت بھی لگی، اکثر بے چاروں کی آراضی ضبط ہوئی، کسی کی آدھی رہ گئی آدھی سرکار نے چھین لی، جو غریب اپنے معاملات ٹھیک کرانے کی امید میں دور دراز قصبات دیہات سے چل کر دار السلطنت تک آئے وہ در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرے بہت سے سفر کی صعوبت اور موسم کی شدّت نہ جھیل سکے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ معاصر مورخ ملا عبدالقادر بدایونی اس قضیے کی ساری تفصیلات بڑے دکھ کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ بالآخر بڑی مشکل سے معاملات سلجھے۔ اکبر کی حکومت سچ پوچھیے تو شیخ ابوالفضل کے ہاتھ میں تھی۔ شیخ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ یہی طبقہ مسلمانوں کی رائے عامہ کا رہنما ہے، جدھر بھی یہ ہو گئے مسلم رائے عامہ کو اسی طرف لے جائیں گے۔ بالآخر شیخ مبارک بھی اسی قافلہ کے رہ نورد تھے اور ابوالفضل کو اپنا بچپن خوب یاد تھا۔ پھر مختلف گوشوں سے دباؤ پڑنا شروع ہوا۔ مثلاً شیخ جلال تھانیسری ایک جیّد عالم وقت اور صوفی تھے۔ پنجاب کی چشتی جماعت ان کو اپنا شیخ اور قائد تسلیم کرتی تھی۔ شیخ جلال تھانیسری نے حالات سے متاثر ہو کر یا ممکن ہے بعض شیوخ کی ایما سے ایک رسالہ تحریر کیا جس میں فقہائے سلف کے قضایا و احکام جمع کیے اور ان کے فیصلوں سے استدلال و استنباط کر کے مدد معاش کا جواز ثابت کیا۔ خلاصہ یہ کہ اکبر کے عہد کا کچھ عرصہ سادات و شیوخ کے حق میں موافق و سازگار ثابت نہ ہوا، موضوع کافی کھسک گیا اور دور کی باتیں ہونے لگیں۔ اصل مقصود اس قدر عرض

کرتا تھا کہ جارچہ چھولس کے سیدوں کی سینہ بہ سینہ روایات کے دفتر میں کہیں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی کہ ان کی مدد معاش کسی بھی بادشاہ کے زمانے میں جانچ پڑتال کی زد میں آئی یا کسی موقع پر سرکاری اہل کاروں نے ان کے مقبوضات کے بارے میں سوالات کیے۔ حادثات کے طوفان گزرتے رہے۔ ان کی فراغت اور آسودگی میں فرق نہ آیا۔

مغلوں کے وقت سے سادات کے نفوذ و اثر میں نمایاں اور صریحی اضافہ نظر آتا ہے خصوصاً سادات بارہہ ایک تازہ اعزاز سے سرفراز کیے گئے اور ایسی صورت حال وجود میں آئی کہ نزدیک و دور کے سیدوں کی خاصی بڑی تعداد ان کے ساتھ لگ گئی۔ ضابطہ یہ تشکیل دیا گیا کہ مغل فوجوں کی نقل و حرکت کے وقت سیدوں کو سب سے آگے رہنا چاہیئے۔ سادات بارہہ ہراول ہو گئے۔ وہی ہراول دستے کی تنظیم و ترتیب کے ذمہ دار بنا دیے گئے انھوں نے توقع کے مطابق اعلیٰ درجے کی عسکری صلاحیت کا ثبوت دیا اور اپنی جوانمردی کا سکہ بٹھا دیا۔ کچھ رسم سی بن گئی کہ ساداتِ بارہہ کا رسالہ جب تک آگے نہ چلے فوج حرکت میں نہ آتی تھی۔ یہ عقیدہ مغل افواج میں عام تھا کہ سید اولادِ علیؑ ہیں، اور شجاعت علیؑ کا حصہ ہے۔ لہٰذا ان کا سب سے آگے رہنا برکت کا باعث ہوگا۔ ہراول دستے کا بڑا سا علم جس کا پھریرا دور سے نظر آتا تھا طمانیت قلب کی نشانی قرار پایا۔ ان کے سوار آگے آگے جھنڈے اڑاتے چلتے تھے۔ تو پوری فوج کو اطمینان رہتا تھا کہ فتح ضرور ہوگی۔ ہراولی کے ضابطے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے سید جو مدد معاش کی قلیل آمدنی پر تقریباً نیم بیکاری کے عالم میں پڑے رہتے تھے، آسانی سے فوجی ملازمتوں کے ذریعے متفرق عہدوں تک پہنچنے لگے۔ ان کی جماعت کے لیے سرکاری امور میں سرگرمی کے ساتھ شرکت کا امکان وسیع ہوگیا۔ اور ان کے نوجوانوں کو اپنے اندر نظم و ضبط پیدا کرنے کا مزید موقع ہاتھ آیا۔ جارچہ چھولس کے سید صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھا کر غیر معمولی ترقی تو نہ کر سکے۔ یقینی امر یہ ہے کہ ان کی خوش حالی اور فارغ البالی میں اضافہ ہوا۔ ایسی شہادت نہیں ملتی کہ کسی نے منصب پر ہاتھ مار دیا۔ خطاب ضرور ملے، یہ شہادت موجود ہے۔

سید مبارک شاہ اور بہلول لودی کے وقتوں سے لے کر عالم گیر کی وفات تک

جارچہ چھولس کے سادات نے مسلسل تقیّہ کیا اور سُنّی بن کر رہتے رہے۔ تقیّہ ایک عملی ضرورت تھی۔ شیعہ فقہا نے خاص حالات کو ملحوظ رکھ کر ایک مصلحت ایجاد کی تھی۔ ہندوستان کے ماحول میں اس سے خوب فائدہ ہوا۔ مثلاً سرکار دربار میں جہاں رسائی چاہیے وہاں آسانی سے پہنچیے اور ہر طرح کی مراعات بلا تکلّف حاصل کیجیے۔ ویسے سبزواری سادات کی بابت مشہور تھا کہ ان کا تقیّہ برائے نام اور واجبی سا ہوتا ہے۔ یعنی ایسی باریک نقاب جس کے نیچے اصل چہرہ غور سے دیکھیے تو صاف پہچان لیا جائے۔ ملّا عبدالقادر بدایونی، اکبر کے زمانے کا مورّخ، سادات سبزوار کے تقیّے کی مذمّت کرتا ہے اور مذاق اڑاتا ہے۔ کہتا ہے کہ اُن کے تعصّب کی سخت رگ کوئی تلوار کاٹ دے تو بڑی بات سمجھیے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد سادات جارچہ چھولس نے تقیّے کی نقاب اتار کر پھینک دی۔

## تیسرا باب

# قوسِ نزولی

جارچہ چھوس کے اجتماعی وجود کی بساط اور کائنات معلوم، البتہ ہندوستان بھر کے دیہات و قصبات میں بسے ہوئے تمام ہی سادات و شیوخ کی وضع ایک سی تھی۔ کسی بھی مقام یا بستی کو مثالی نمونہ تصوّر کر لیجیے۔ معلوم ہوگا کہ سِرِّ دلبران اور حدیثِ دیگران میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ عموماً مسلمانوں نے شہری مزاج پایا ہے۔ وہ برادریاں اور خاندان جو نسلی اعتبار سے ہندو تھے اور پھر اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے بھی اپنا تمدّن تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ مدنیت ان کی معاشرت میں پوری طرح سرایت کر گئی۔ یہ قاعدہ کلّیہ سادات و شیوخ پر خصوصیت کے ساتھ صادق آتا ہے۔ وہ دیہات میں جاکر آباد ضرور ہوئے، لیکن اُن کے مرد عورتوں نے اپنی بود و باش میں مدنی طور طریقے برقرار رکھے اور شہری خو بو کو ضائع نہ ہونے دیا۔ کہیں کہیں ان کی وضع قطع میں گاؤں کا رنگ شامل بھی ہوا تو بہت سطحی تھا۔ وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر لوگ تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ معیار اور مثال کا تعیّن ان کی ذات کرتی تھی۔ عمر کے ابتدائی دور میں تحصیل علم کی طرف لگنا ایک

فریضہ تھا جس کی تکمیل شوق اور محنت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ گاؤں میں رہائش ہو یا شہر میں کچھ عرصہ گزاریں کسبِ کمال ہر ایک کا مقصود اور منتہائے نظر تھا۔ اس کی خاطر کیسا بھی خونِ جگر کیوں نہ کرنا پڑے۔ جو لوگ مدرسے کی باقاعدہ نصابی تعلیم اور حصولِ سند سے رہ جاتے تھے۔ وہ ذاتی تربیت کی غرض سے مطالعہ انہماک کے ساتھ جاری رکھتے تھے۔ اربابِ ادب دآگہی سے فیضِ صحبت اور صالحین کی مجلسوں میں نشست ہر ایک کا لازمی معمول تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے کردار کی آراستگی میں مدد ملتی تھی۔ عورتیں بھی بیشتر پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ قرآن ختم کیا تو فارسی اُردو کی عبارت پہچاننے لگیں۔ پھر ذاتی شوق سے زندگی بھر کتابوں کے شغل میں لگی رہتی تھیں۔

عالمگیر کی وفات کے بعد مسلمانوں کے معاشرے میں انحطاط کی طرف لے جانے والے میلانات صاف نظر آنے لگے تھے۔ مگر سادات نے اپنی اخلاقی ساکھ کچھ دنوں اور آگے تک قائم رکھی۔ ان کے دنیاوی عروج کی آخری منزل جو ابھی تک نہیں آئی تھی اس کے بعد آئی۔ اصلاً ساداتِ بارہہ فوجی قیادت میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اسی بنا پر امورِ مملکت کے بست وکشاد میں ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ وہ اہم فیصلوں کے وقت موجود اور مسائل کے حل وفصل میں شریک رہتے تھے۔ اتفاق کی بات حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ پورے ملک کی سیاسی قیادت بھی ان ہی کے ہاتھ میں آگئی۔ حالانکہ انھوں نے بظاہر کوئی مربوط منصوبہ پہلے سے سوچ کر اس کام کے لیے نہیں بنایا تھا۔ عالمگیر اورنگ زیب کے پوتے، جہاندار شاہ کو ہٹا کر فرخ سیر کو تختِ سلطنت پر بٹھانا براہِ راست ان کا کارنامہ تھا۔ فرخ سیر کے زمانے میں سید عبداللہ قطب الملک وزیرِ اعظم ہو گئے۔ باقی ماندہ اقتدار ان کے چھوٹے بھائی سید حسین علی نے اپنی مٹھی میں دبائے رکھا۔ یہ سلسلہ تقریباً سات برس تک چلا۔ خواجہ حافظ شیرازی نے کاروبارِ سیاست کو "شعلۂ مستعجل" کہا ہے یعنی ایسا شعلہ جو بھڑکا اور جلدی سے بجھ گیا۔ ساداتِ بارہہ اور ان کے ساتھ وابستہ سارے سیدوں کا آخری نقطۂ عروج یہی مختصر زمانہ اور یہی مرحلہ ہے۔ جارچہ چھولس کے سید اس زمانے میں بھی، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ خاص ناموری حاصل

نہ کر سکے۔ وہی حسبِ دستور سپاہی پیشہ رہے۔ لہٰذا میزان کل یہ ہوئی کہ نہ بہت پایا نہ بہت کھویا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد ایسے پست و بلند درپیش آئے کہ معلوم ہوتا تھا شاید آسمان کو زنگ اور زمین کو کروٹیں بدلنے کی کچھ عادت سی پڑگئی ہے۔ عیسوی تقویم کی رو سے عالمگیر کی وفات اور غدر کے درمیان پورے ڈیڑھ سو برس کا عرصہ حائل ہے۔ نہ ایک برس زیادہ نہ ایک برس کم۔ وقت کے لاتناہی سلسلے میں وہ عرصہ کچھ بھی نہ سہی، مگر حیرت و عبرت کے عجیب و غریب سامان چھوڑ گیا۔ بالآخر دنیا کو عالم اسباب کہا گیا ہے۔ قوموں کے قافلے علت و معلول کی زنجیر کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ بڑی بڑی تہذیبوں کا ستارہ چمکا اور ڈوب گیا۔ اس بحث میں کون پڑے کہ افراد کی تربیت میں جماعت سے کچھ کوتاہی اور کسر واقع ہونے لگتی ہے یا ناقص افراد جماعت کو ٹھکانے لگانے اور تباہی کا راستہ دکھانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ فرد اور جماعت کا رشتہ بہر حال ناقابلِ تردید ہے۔ وہ جو بزرگوں کی زبان سے پرانی مثل سنتے آئے ہیں کہ ہر کمالے را زوال، تو اس کی عالمانہ تاویلیں گھما پھرا کر اتنے سارے مختلف طریقوں سے کی گئی ہیں کہ سمجھنے کی کوشش کیجیے تو بلا مبالغہ سر میں خشکی ہو جائے گی اور ماتھے پر شکنوں کا وہ ہجوم ہوگا کہ دیکھنے والے شکل نہ پہچان پائیں گے۔ اس قدر اعترافِ حقیقت کافی ہے کہ میعاد پوری ہونے پر رائج الوقت نظام اپنی افادیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ہر ادارہ ایک خاص وقت تک اپنا وجود مضبوط اور سالم رکھنے کے بعد از کار رفتہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ سلطنتوں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ انسانی فکر و عمل دونوں اس وقت اور بھی زیادہ مجبور ہو جاتے ہیں جب حادثات جلد جلد رونما ہونے لگیں اور تغیرات کی رفتار تیز ہو جائے۔

سادات بارہہ کی حیثیت کو مٹانے اور ان کی بالادستی کو نیست و نابود کرنے کی ذمہ داری حریف امرائے سلطنت کے باہمی عناد و حسد، رقابت، ریشہ دوانی، اور گروہ بازی پر تھی۔ عرصہ نہ گزرنے پایا کہ نادر شاہ بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوا۔

ایرانی سپاہیوں کے مقابلہ میں مغل فوج کو مکمل شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ سادات بارہہ پہلے ہی فوجی اور سیاسی امور سے بیدخل کیے جا چکے تھے۔ وہ اس بے عزتی میں شریک ہونے سے محفوظ رہے۔ نادر لوٹ کے مال میں تختِ طاؤس، کوہِ نور اور بے شمار خزانے کے علاوہ مغل سلطنت کی آبرو بھی ساتھ لے کر چلتا بنا۔ وہ عظمت و شوکت جو صدیوں کی جدّوجہد کا نتیجہ تھی ایک آن میں غارت ہوگئی۔ دارالسلطنت کا ہر آدمی جس کی جان قتل عام سے بچ گئی تھی یہ مصرعہ پڑھ کر روتا تھا: "شامتِ اعمالِ ماصورتِ نادر گرفت" امرائے کبار میں کوئی ایسا نہ رہا جو سلطنت کی سالمیت کو عزیز سمجھتا۔ جس کے دل میں وسیع قومی و ملّی مفادات کا درد ہوتا اور جو پست قسم کی ہوس سے طبیعت کو پاک رکھتا۔ مغل شہنشاہ مجبور، خزانہ خالی، اور فوج کا نام ندارد۔ دکن اور اودھ کے صوبائی ناظم عملاً آزاد ہو گئے۔ جاٹ نواحِ دہلی میں لوٹ مار مچانے لگے، مرہٹوں کا سیلاب دہلی تک آیا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ دکن میں عالمگیر کے ۲۰ سال فوجی اعتبار سے دیکھیے تو قطعی رائیگاں گزرے۔ مغل فوج بڑے پیمانے پر میدانی لڑائیاں لڑنے کا تجربہ اور حوصلہ رکھتی تھی۔ مرہٹے اپنے جغرافیائی ماحول سے فائدہ اٹھا کر جنگِ قزاقی پر اتر آئے اور مختصر وسائل کے باوجود لڑتے رہے۔ یہ طریقہ پہاڑوں میں قابل عمل ہے۔ نپولین کے آگے سارا یورپ گھٹنے ٹیک گیا مگر اسپین میں وہ کچھ نہ کر سکا۔ اور سارا تجربہ بیکار رہا۔ تاریخ گواہ ہے، اور مثالیں متعدد ہیں کہ دنیا کی زبردست اور منظم فوجیں اس طریقہ جنگ کے سامنے عاجز آ جاتی ہیں۔ غنیم کے ہتھکنڈے ایسی مضحکہ خیز صورت پیدا کرتے ہیں کہ مارنے کے آگے، بھاگتے کے پیچھے، اور دباؤ پڑے تو غائب، مرہٹوں کی کامیابی کا یہی راز تھا۔ وہ شمالی ہند میں داخل ہوئے تو پورا خطہ ان کی غارت گری سے پناہ مانگ گیا۔ بالآخر احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں پانی پت میں ان کی طاقت اور تقدیر کا فیصلہ ہو گیا۔ مرہٹہ تسلط سے نجات، ان کے ظلم و ستم سے قطع نظر، مغل سلطنت کے سابق نوکر اس غرض سے چاہتے تھے اور ان کی کوشش کا ہدف یہ تھا کہ سیاسی اقتدار کو اصل مرکز کی طرف واپس لے آئیں گے۔ روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو اس کی زیادہ فکر تھی۔ وہ جیسا کہ مشہور ہے شجاع الدولہ کے پاس

اَوَددھ پہنچا اور ملاقات کے وقت تلوار نکال کر سامنے رکھ دی۔ کہا یا تو میرے ساتھ پانی پت چلنے کو تیار ہو جائیے اور یا پھر اس تلوار سے میرا گلہ کاٹیے۔ آپ کو لے کر چلوں گا ورنہ یہیں مر جاؤں گا۔ انھوں نے ابدالی کا سہارا لیا، مگر ان کی امید صحیح ثابت نہ ہوئی اور حالات ان کی منشا کے مطابق آگے نہ بڑھ سکے۔ ابدالی کے پاس کوئی اعلیٰ نصب العین نہ تھا۔ وہ سیاسی تدبّر اور تربیت سے خالی الذہن آدمی تھا۔ اس نے دہلی کو نو دفعہ لوٹا۔ اور ہر دفعہ نادر کا سکھایا ہوا سبق دہرایا۔ فتنہ و یورش کے مسلسل جھٹکوں نے دہلی کو تو بالکل ہی اجاڑ دیا۔ پورے شمالی ہند کے لوگوں پر کیا کچھ نہ گذری۔ یہ دَردو الم کی روئیداد پڑھنے کے لیے تاریخ کی ورق گردانی کچھ ایسی ضروری نہیں ہے۔ سوداؔ و میرؔ سے لے کر غالبؔ و داغؔ تک اُردو شاعروں کے کلام میں جو تیر کی طرح چبھنے والے اشارے بکھرے پڑے ہیں ان کو یاد رکھنا ہی کافی ہوگا: "تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں۔ بلاغت کا مقصد اور اس کا کمال یہی ہے کہ جن افسانوں کو سُنانے میں راتیں گزر جائیں ان کو ایک مصرعے میں اَدا کر کے خاموش ہو جائیے: چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے۔ پنجاب حملہ آوروں کی گزرگاہ ٹھہرا۔ مرکزی عمل داری پر سب سے شدید ضرب وہیں پڑی۔ اس لیے کہ افغان لشکر آئے دن روندتا کھوندتا گذرتا تھا۔ اور ابدالی کی ریل پیل رہتی تھی۔ سکھ مدت سے مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ پنجاب ان کے قابو کا شکار ثابت ہوا۔ سیاست کی لغت میں خالی جگہ کو بھرنے کے معنی ذرا نازک ہوتے ہیں۔ یعنی نئے حکمرانوں نے سابق طبقۂ حاکم کے خلاف پہلے سے کوئی شکایت اور دشمنی کا کھاتہ کھول رکھا ہے تو وہ بدلہ لینے میں افراط و تفریط کی پروا نہیں کرتے اور نہ یہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ کس نقطے پر پہنچ کر حساب برابر ہو گیا۔ سکھوں نے مسلمانوں کو ذلیل کرنے کے لیے اور جو کچھ کیا وہ رفت و گذشت، مگر اپنی پوری قلمرو میں پشاور سے لے کر لاہور تک بشمار مسجدوں کے انہدام اور بےحرمتی سے بھی ہاتھ نہ روکا۔ حالانکہ عقاید کی سطح پر سکھ مذہب کے بانی کی تعلیمات اسلام سے زیادہ قریب ہیں۔ اس بات کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ خاص شہر لاہور میں مریم زمانی کی مسجد بارود سازی کے کارخانے میں تبدیل کر دی گئی۔ گلّو سقّہ رنجیت سنگھ کا ایک منہ

چڑھا ملازم بلکہ چھوٹا موٹا مصاحب تھا۔ اس کے کہنے اور خوشامد کرنے سے سنہری مسجد واگزار ہوئی مگر شرط یہ رکھی گئی کہ اذان نہ ہوگی۔ اور بالفرض ہو بھی تو یہ آواز بلند نہ ہوگی۔ مسجد شہید گنج پر تو ابھی کل پرسوں تک (۱۹۳۸ عیسوی) سکھوں کا قبضہ تھا۔ جہاں خوش باشی کے لیے بھنگ گھوٹی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ ابدالی کی بلا ختم ہوئی تو پنجاب کے مسلمانوں کو ایک نئی مصیبت کا منہ دیکھنا پڑا۔ جو پہلے سے بھی زیادہ شدید اور شرمناک تھی۔ وقت کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔ مظلوموں کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا دیکھ کر علمائے دین کی طرف سے جہاد کا فتویٰ جاری ہوا۔ سید احمد بریلوی اپنے ساتھیوں سمیت بالاکوٹ کے مقام پر لڑکر شہید ہوگئے۔ ضمناً ان کی شہادت ایسے شریر طبیعت مسلمانوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے جو حادثۂ کربلا کی عظمت گھٹانے کی مذموم نیت سے اکثر یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام بہتّر نفوس کو لے کر اپنے زمانے کی اتنی بڑی طاقت سے ٹکرا گئے، نتیجہ کیا نکلا۔ بنیادی اعتبار سے جہاد کا مفہوم محض یہ ہے کہ شعائرِ اسلام کی حفاظت کے لیے ہر وقت کمربستہ رہو اور کبھی ایسا وقت آجائے تو جان پر کھیل جاؤ، جہاد کا اصول ہرگز یہ نہیں بتاتا کہ پہلے خوب کامیابی کا اندازہ کرلو اور ذرا سا بھی کھٹکا ناکامی کا محسوس ہو تو چپ لگائے پڑے رہو۔ قدم آگے نہ بڑھاؤ۔ قابلِ ملاحظہ حقیقت یاد رہے اور یہی اسلام کا امتیازی وصف ہے۔ جس کی بنا پر وہ مذاہبِ عالم کے درمیان ممتاز ہے کہ انسان کو بعض حالات میں زندہ رہنے کے بجائے مرجانے کی تنر لبہ تعلیم اور اس کے ساتھ زندگانیِ جاوید کی بشارت دیتا ہے۔ جہاد و شہادت کی دنیاوی افادیت بھی کچھ کم نہیں ہے محکومیت اور مغلوبیت انسان کے کردار سے وہ جوہر چھین لیتی ہے جسے غیرت کہتے ہیں ایسی صورت میں چند سرفروش افراد کی قربانی کا فائدہ اتنا بھی بسا غنیمت ہے کہ باقی معاشرہ زوال اور تباہی کی زد میں آنے سے بچ گیا۔ ہم پنجاب کی مثال سامنے رکھتے ہیں۔ وہاں ایک طرف تو عوامی درجے کے سیدھے سادے اور غریب مسلمان تھے جن کے ایمان کو ابتلا و حوادث کی آگ نے اور زیادہ نکھار دیا۔ دوسری طرف المناک صورت حال کی گرفت میں وہ آئے جو بڑے لوگ کہلاتے ہیں۔ ان کا اخلاق

غلامی کے اثرات سے مدّتوں کے لیے تباہ ہوگیا۔ زمانہ گزرتے دیر نہ لگی۔ آگے چل کر جب منزلِ امتحان آئی توان کا سینہ جوانمردی کے احساس سے خالی تھا۔ سکھ دور کی بابت ایک ذراسی بات وطنِ مالوف کی نسبت سے اور کہنے کی رہ گئی۔ سکھوں کی تاخت و تاراج سے جمنا پار پنجاب کا ملحقہ علاقہ دور تک محفوظ نہ رہ سکا۔ ہماری بستیاں بھی متاثر ہوئیں۔ جھوپس میں محلہ گڑھی کی مسجد کے نزدیک راستے کی دوسری طرف ایک قبر ہے۔ جو حال میں نوتعمیر مدرسے کی حدود کے اندر آگئی ہے۔ مجھے بچپن کی بات یاد ہے کہ جب بھی اپنی ماں کے ساتھ وہاں سے گزرتا تھا وہ قبر کی طرف انگلی اٹھاکر السلام علیک یا شہید کہتی تھیں اور تاکید کرتی تھیں کہ سلام کرو یہ شہید ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ سنا ہے کسی زمانے میں سکھوں کے دھاوے آنتے تھے۔ یہاں لڑائی ہوئی تھی۔

ہندوستان کا دورِ جدید خاص اس دن سے شروع ہوتا ہے جب انگریزوں کا تجارتی جہاز، ہیکٹر، (۱۶۰۸ء) ہوگلی کی بندرگاہ پر آکر لنگر انداز ہوا۔ اس وقت کلکتہ ماہی گیروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اکبر سے لے کر عالم گیر کے عہد تک یورپ کے اکثر سیاح اور تاجر پیشہ لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ تقریباً تمام بڑے مرکزی شہروں پر ان کی تجارتی کوٹھیاں قائم تھیں۔ وہ دربار میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ جہاں ان کی رسائی اور رفت و آمد خوب تھی۔ مغل شہنشاہوں سے تجارتی مراعات حاصل کرنا بظاہر ان کا واحد اور خاص مقصد تھا۔ جب تک سلطنت میں دم خم رہا یہی ان کا مفاد تھا۔ اس سے زیادہ اور آگے کچھ نہیں۔ عالمگیر کی وفات کے بعد انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان سونے کی چڑیا ہے ملکی غیر ملکی جس کا جی چاہے آئے اور لوٹ کر لے جائے، تو ان کی نیت میں بھی فتور آنا شروع ہوا۔ پانی پت کی تیسری جنگ جس سال ہوئی اور جس سال ابدالی نے مرہٹوں کا قصّہ نمٹایا، اس سے ٹھیک چار برس پہلے اور پھر ٹھیک چار برس بعد، دو حادثات ایسے رونما ہوئے کہ صاف نظر آگیا ہندوستان مستقبل میں کدھر جائے گا،

اور مسلمانوں کا، جو صدیوں سے حکومت کے مزے مار رہے تھے، اب کیا حشر ہوگا، پہلا حادثہ جنگ پلاسی، اور دوسرا حادثہ جنگ بکسر ہے، جنگ پلاسی میں بنگال کا آخری مغل ناظم (صوبیدار) سراج الدولہ، انگریزوں کی سازش کے نتیجہ میں کام آیا۔ اور بنگال کا صوبہ ہمیشہ کے لیے مغل سلطنت کے احاطۂ اقتدار سے نکل کر انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ جنگ بکسر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تھوڑے سے سپاہیوں نے مغل بادشاہ اور شجاع الدولہ والئی اودھ کی مشترکہ فوجی طاقت کو شکست دے کر ثابت کر دیا کہ فوجی صلاحیت کے اعتبار سے ہندوستان کے حکمراں مغربی استعمار اور نوآبادیاتی نظام کے سیلاب کو روکنے میں قطعی بے بس اور ناکام ہیں۔ بحری طاقت کی اہمیت اور برتری پرتگالی پہلے ہی واضح کر چکے تھے۔ عسکری دفاع سیاسی آزادی برقرار رکھنے کی پہلی شرط ہے۔ مقامی والیانِ حکومت یہ شرط پوری کرنے کے قابل نہ رہ گئے تھے اور معاملات ان کے اختیار سے باہر تھے۔ آئینہ ایام میں مستقبل کی پرچھائیں لمبی پھیلنے لگی۔ سب کو اندازہ ہوگیا کہ وہ شمع جو دہلی کے لال قلعے میں دھیمی سی روشنی دے رہی ہے اس کا گل ہوجانا اب کوئی دن کی بات ہے۔ دراصل اسلامی ایشیا مغربی عیسائیوں کے مقابلے میں کیوں پسماندہ رہ گیا، اس سوال کا جواب مختلف زاویوں سے سوچا گیا ہے۔ ہمارے دانش منداس موضوع پر بڑی بڑی موشگافیاں دکھانے کے ماہر ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس مسئلے کی جستجو میں پوری پوری تحریکیں اٹھیں جن میں سے کچھ تو ٹھنڈی پڑ گئیں اور بعض میں اب بھی گرمی ہے۔ لبِّ لباب فقط اتنا سا ہے، کہ مغربی رینا سانس احیائے ثانیہ، کے بعد وجود میں آنے والے جدید علوم، خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے سرمایہ سے مسلمانوں کی جیب خالی رہ گئی۔ باقی دیگر تاویلات، مثلاً خالص اسلامی زندگی چھوڑ بیٹھے۔ عیش و عشرت میں ڈوب گئے۔ سخت کوشی کی عادت جاتی رہی، ایسی ویسی حرکتوں میں پڑ گئے وغیرہ، یہ سب زیبِ داستان کی باتیں ہیں جو بڑی بوڑھیاں کہیں تو کوئی مضائقہ نہیں، سنجیدہ بزرگوں کی زبان سے سن کر ہنسی آتی ہے۔ ماضی میں مسلمانوں کا علمی اور تہذیبی کارنامہ کچھ بھی رہا ہو، یہ صحیح ہے کہ فنونِ حرب میں بھی وہی

آ گئے تھے۔ جنگ میں بارود کی توپوں کا استعمال سب سے پہلے ترکوں نے کیا، البتہ اٹھارھویں صدی کے آغاز سے نیا زمانہ طلوع ہوا۔ تو مشرقی علوم کی کم مائیگی ایک مسلّمہ صداقت بن کر سامنے آگئی۔ آج اہلِ مغرب اپنی تہذیب پر فخر کریں اور مشرقی دنیا کو حقیر سمجھیں تو کچھ بے جا نہیں، حقائق ان کے دعوے پر حجّت ہیں۔ ہندوستان میں حالات نے کوئی انوکھی یا نئی منطق اختیار نہیں کی۔ وہی سب کچھ ہوا جس کا پیش آنا توقع کے مطابق تھا۔ انگریز بے دھڑک اپنا سیاسی دائرۂ اختیار بڑھاتے چلے گئے۔ ابتدا میں مغربی ملکوں کے لوگ، خاص طور سے انگریز، تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ تاجروں کا ایک خاص کردار اور خاص مزاج ہوتا ہے۔ یورپ میں ایشیا اور ایشیائی باشندوں کی بابت بہت سے عوامی تصوّرات بلکہ کہنا چاہیئے بازاری تعصّبات پھیلانے کا ذمّہ دار تاجر پیشہ طبقہ ہے۔ وہاں منجملہ دیگر ایک عام تصوّر یہ ہے کہ ایشیا کا آدمی بہت چالاک اور مکّار ہوتا ہے، ہندوستانیوں سے انگریزوں نے اپنے معاملات، یعنی سیاسی معاملات، کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی کہ ہم کو چالاک لوگوں کے ماحول میں ویسی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ چالاکی کے کرتب دکھانا ہیں۔ انھوں نے مقاصد کے حصول اور کامیابی کی ہوس میں وہ روباہ بازیاں اور حیلہ سازیاں اختیار کیں اور ایسی لالچ اور بدنیتی کا مظاہرہ کیا کہ ابلیس بھی حیران رہ گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ذہن میں رکھ کر انگلستان کا ایک معاصر فلسفی یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے اور اس کا یہ مقولہ مشہور ہو گیا کہ "تاجر کبھی اچھے حکمراں نہیں ہوتے۔" بات بالکل صحیح تھی۔ تجارت سود و زیاں سے آگے نہیں دیکھتی۔ حکومت کے لیے ہمّتِ عالی شرط ہے۔ ایک اور بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ مغل سلطنت محض نام کی تھی اور ہندوستان واقعی طور سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ یہاں یورپ کے بہت سے ماجرا پسند لوگ آزاد اور آوارہ گھومتے تھے۔ انھوں نے مختلف علاقائی حاکموں کے پاس جا کر کہا کہ آپ کو انگریزوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت، ہم موجود ہیں۔ تنخواہ، مزدوری، کرایہ، جو عنایت فرمایئے قبول ہے۔ ہم آپکے سپاہیوں کو ویسی ہی جنگی تربیت دے سکتے ہیں اور وہی سامانِ جنگ ہم بھی بنانا

جانتے ہیں۔ جو انگریزی فوج کے پاس ہے، ہمیں وہ کمال آتے ہیں کہ توپ کے گولے سے گولا لڑا دیں۔ آپ کا سپاہی انگریز سے جم کر ٹکر لے گا۔ ذرا آزما کر دیکھیے تو سہی۔ یہ جھانسہ دے کر ان لوگوں نے خوب دولت کی لوٹ مار مچائی۔ اور یہاں جو طرح طرح کے واہیات ذوق، اور بد مستیوں کا بازار گرم تھا اس میں شریک ہو کر سب سے دو ہاتھ آگے ہو گئے۔ غرضکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز نوکروں کی اندھیر گردی نے ناقابل برداشت صورت حال پیدا کر دی۔ آخری نتیجے کے طور پر وہ حادثہ پیش آیا جو میرٹھ چھاؤنی کے دیسی سپاہیوں کی بارگ سے شروع ہوا اور پھر پورا شمالی ہندوستان اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ انگریزوں نے اس کو مصلحتاً غدر کہا، عوام بھی غدر ہی کہنے لگے۔ سید احمد خاں پہلے ہندوستانی ہیں جو اس حادثے کو غدر نہیں بغاوت کا نام دیتے ہیں، اور جرأت کے ساتھ اس کے اسباب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان کی کتاب "اسباب بغاوتِ ہند" ایک اہم دستاویز ہے۔

غدر سنہ ۱۸۵۷ عیسوی ایک انقلابی موڑ ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا لال قلعے سے رخصت ہونا محض ہندوستان کی نہیں بلکہ ایشیا کی ایک عظیم تہذیب کے زوال کا سانحہ تھا، جس کی ضرب پورے اسلامی ایشیا پر پڑی اور ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ صدیوں سے دریائے جیحون اور دریائے دجلہ کے درمیانی خطّے میں بسنے والی لاتعداد انسانیت کے گھروں تک دہلی کی شہرت پہنچ رہی تھی۔ اس شہر کا ان کے دلوں پر ویسا ہی نقش اور ذہنوں میں وہی وقار تھا، جو کبھی بخارا اور بغداد کو حاصل تھا۔ وہاں کا ہر با استعداد اور صاحب جوہر آدمی دہلی کو اپنی آخری منزلِ شوق سمجھتا تھا اور اس کی آنکھیں اس شہر کی طرف ارمان و امید کے ساتھ لگی رہتی تھیں، اہل ہنر کے لیے، خواہ وہ کسی بھی میدان کے ہوں، اپنے کمال کا پروانۂ سند حاصل کرنے کی خاطر دہلی آنا لازم تھا حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ لوگ اپنے کمالات کی حسب دلخواہ داد اور صلہ یہاں آکر پاتے تھے۔ اس شہر میں وارد ہونا گویا ان کے خوابوں کی تعبیر اور زندگی بھر کی آرزوؤں کی معراج تھی۔ وہ دور ہمیشہ کے لیے ختم ہوا اور زمانہ رنگ بدل گیا۔ دارالسلطنت دہلی کی بربادی پر داغ نے مرثیہ کہا: فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی۔ غدر کا دوسرا المناک منظر

دہلی سے باہر دیکھنے میں آیا۔ شمالی ہندوستان کے تمام مسلمان، خصوصاً جن کا تعلق طبقۂ اشراف سے تھا، انگریزوں کی نظر میں باغی قرار پائے، اور ہر چھوٹے بڑے شہر میں ان کو پکڑ کر پھانسی کی سزائیں دی گئیں۔ صبح سے لوگوں کی دارو گیر شروع ہوتی تھی، اور ان کو گھروں سے پکڑ کر لایا جاتا تھا۔ جب شام تک لاشوں کا ڈھیر لگ گیا تو پھانسی روک دی جاتی تھی۔ اگلے دن سویرے سے پھر وہی سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔ یہ خونیں روداد تمام شہروں میں مہینوں چلتی رہی۔ غدر کی پھانسیوں کے اعداد و شمار رکھنے کا کس کو ہوش تھا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ کسی شہر اور قصبے میں شریفوں کا کوئی خاندان ایسا نہ بچا جس کے دو چار افراد پھانسی کے تختے پر نہ لٹکائے گئے ہوں۔ انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف شک اور خوف ایسا بیٹھا کہ کبھی نہ گیا۔ نئی حکومت کو جستی اور پھرتی کے سارے داؤ یاد تھے۔ مزید کارروائی فوراً یہ عمل میں آئی کہ بڑے پیمانے پر ان لوگوں کی جائیدادیں اور آراضیات، اور بعض جگہوں پر معقول آمدنی کی ریاستیں، ضبط ہو گئیں جو بغاوت کے ملزم ٹھہرائے گئے تھے اور ان کو منتقل کر دی گئیں جنھوں نے خیر خواہ ہونے کا ثبوت دیا۔ آراضی کی ضبطی نے مسلمانوں کو وسائل زندگی سے محروم اور اقتصادی اعتبار سے قطعی تباہ کر دیا۔ بڑے بڑے صاحبانِ حیثیت اور نمایاں افراد کہیں کے نہ رہے۔ وہ جن کو کل تک ہر طرح کی فراغت اور آسودگی کے دن میسر تھے۔ یکایک شدید تنگ دستی، بدحالی اور پریشانی میں پھنس گئے۔ ایسی نادر روزگار ہستیاں جو بقول غالبؔ، اپنے حضور میں گستاخیِ فرشتہ گوارا نہ کرتی تھیں، ان کو دنیا نے ذلت برداشت کرتے اور محرومی کے عالم میں حیاتِ مستعار کی سختیاں جھیلتے دیکھا۔ اس سے زیادہ المناک صورتِ حال اور بدنصیبی کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی نان شبینہ کو محتاج ہو جائے۔ بھوک اور فاقہ شیروں کو روباہ مزاج بنا دیتا ہے۔ میرزا سوداؔ جو عام مہاجرت کے زمانے میں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے، عموماً ہنسنے ہنسانے والے شاعر تھے۔ ان کا لہجہ بھی کہیں کہیں نہایت درد انگیز ہو جاتا ہے۔ وہ ایک نظم میں جو بظاہر بڑی دلچسپ ہے،

سارا عبرت انگیز نقشہ پیش کر کے کہتے ہیں کہ نجیب زادیاں سر سے پاؤں تک برقعہ اوڑھے، گود میں گلاب کا سا پھول، بچہ دبائے، عجیب حسن طلب کے ساتھ بھیک مانگتی ہیں: کہ خاکِ پاک کی تسبیح ہے جو لیجیے مول۔ مولانا حالی اور ان کی نسل کے دل میں یہ احساس اور زیادہ گہرے صدمے کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ شریفوں کی اولاد در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے امور ملکی یعنی حکومت کے معاملات جو پہلے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے اب انگریزوں کے پاس چلے گئے۔ اعلیٰ اختیارات کی نوکریاں درکنار، چھوٹی موٹی ملازمتوں کے لیے بھی وفاداری پہلی شرط تھی جو بصورتِ موجودہ یعنی غدر کے فوراً بعد، مسلمان پوری نہ کر سکتے تھے۔ اکثر اشراف کے خاندانوں میں یہ خیال سرایت کر گیا کہ انگریز کی نوکری کرنا غیرت کے خلاف اور عزتِ نفس بیچنے کے برابر ہے۔ ہمارا ایمان اس کی اجازت نہیں دیتا۔ بدیہی طور سے اس طرز فکر کا انجام پس ماندگی تھا اور یہاں سے سیدھی راہ بغیر موڑ گھمائے افلاس کی طرف جاتی تھی۔

جارج چھوس میں اب سے ایک پشت اوپر بزرگوں کو غدر کے واقعات خوب یاد تھے۔ قاری جعفر علی دہلی میں اعتماد الدولہ کے مدرسے میں استاد تھے وہاں پڑھانے والوں کا شمار دہلی کی معتبر اور مقتدر شخصیات میں ہوتا تھا۔ ان کا ملازم، عبداللہ صبح حسبِ معمول گھر کا ضروری سامان اور کھانے پینے کی چیزیں خریدنے بازار گیا اور بہت دیر سے واپس آیا۔ عورتوں نے پوچھا کہاں تھا، آخر کھانا کس وقت پکے گا۔ عبداللہ نے غمگین آواز میں جواب دیا، کوئی چیز نہیں ملی، گورا فوج شہر میں داخل ہو گئی ہے، گولیاں چل رہی ہیں اور راستے میں جگہ جگہ لاشیں پڑی ہیں۔ فوراً ہی سپاہیوں نے زبردستی گھروں میں گھس کر لوٹنا شروع کر دیا۔ قاری جعفر علی کی ذات پورے شہر میں معروف تھی۔ اکابرین سے دوستانہ روابط تھے۔ ان کو اپنا انجام نظر آ گیا کہ حتماً الزام میں ماخوذ ہونا ہے اور گرفتاری سے بچنا محال ہے۔ وہ دارالسلطنت کے ممتاز شیعہ عالم تھے۔ سپاہیوں نے دہلی میں داخل ہوتے ہی علما سے فتوائے جہاد پر دستخط حاصل کیے اور نعرۂ حیدری پکارتے تھے۔ مشاہیر دہلی میں گرفتار ہونے سے بچا ہی کون تھا۔ صہبائی، شیفتہ حتیٰ کہ کہتے ہیں کہ غالب بھی، جن کی بابت مشہور لطیفہ

ہے کہ انگریز حاکم نے پوچھا تم بھی مسلمان ؟ فی البدیہہ جواب دیا، حضور آدھا، یعنی شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔ غرض کہ ایسی صورت میں قاری جعفر علی نے سوچا کہ اہل وعیال کو ساتھ رکھنے کے بجائے وطن روانہ کر دینا زیادہ مناسب رہے گا۔ یہ اقدام مشکلات اور خطرات سے خالی نہ تھا۔ اوّل ڈر اس بات کا کہ کہیں باغیوں کو یہ گمان نہ گذرے، انگریز عورتیں برقعے اور چادریں لپیٹ کر شہر سے باہر فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ دوسرے، دہلی سے شمال مشرق کی جانب، جارچہ چھولس تک سڑک کے دونوں طرف گوجر قبیلے کے گاؤں درمیان میں پھیلے پڑے ہیں۔ گوجروں نے بدامنی پھیلادی تھی اور لوٹ مار میں لگ گئے تھے۔ قصّہ مختصر یہ کہ جو دشواری بھی پیش آئی ہو، اور جو جتن بھی کرنے پڑے ہوں، وطن کے عزیز جاکر عورتوں کو دہلی سے نکال لائے، اور قاری جعفر علی حسب اندیشہ گرفتار ہو گئے۔ یہ قافلہ چھولس کے کچھ برہمنوں کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ برہمن ہمیشہ اپنا سلوک یاد دلاتے رہتے تھے۔ سب لوگ راستے بھر بتاتے ہوئے آئے کہ کون سواریاں ہیں، کہاں تھیں، کہاں جا رہی ہیں اس داستان کا نہایت دل دکھانے والا باب یہ ہے کہ عورتوں کی روانگی سے قبل دہلی کے ایک معزز بزرگ جو مقتدر طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے قاری جعفر علی کے پاس آئے اور کہا کہ ہمارے گھر کی تمام عورتیں کنوئیں میں کود چکی ہیں۔ میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔ انگریز سپاہیوں سے ابھی تھوڑی دیر میں سامنا اور مقابلہ ہونے والا ہے مجھ سے اس لختِ جگر کو اپنی آنکھوں کے سامنے کنوئیں میں کودتا دیکھا نہ گیا۔ مولانا، اب یہ امانت آپ کے سپرد ہے۔ قاری صاحب نے اس لڑکی کو بھی وطن بھجوا دیا۔ جب یہ کچھ سیانی ہوگئی تو اپنے ایک بھانجے سے اس کا نکاح کر دیا۔ وہ بھانجے صاحب راقم الحروف کی ماں کے ننھیالی بزرگ تھے۔ میری ماں بیان کرتی ہیں کہ میں ذرا سی تھی۔ ننھیال میں آنا جانا تھا۔ وہ بی بی مجھے خواب وخیال سی یاد ہیں بہت بوڑھی تھیں۔ جیسے سر کے سفید بال، ویسے ہی چہرے کا رنگ تھا۔ غدر کے واقعات کبھی جی چاہتا تو سنانے لگتیں تھیں، ہمیں بالکل تمیز اور سمجھ نہ تھی، کوئی لڑکی ہنس پڑتی تو ناراض ہو جاتی تھیں اور آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی، کہتی تھیں۔ لڑکیو، یہ باتیں یاد کر کے میرے سر میں ایسا شور اٹھتا ہے کہ کسی دوا

سے آرام نہیں ہوتا۔ تم میرے پاس خاموش بیٹھ کر سنا کرو، ورنہ میرے سر میں درد اٹھ کھڑا ہوگا۔ چھولس میں ایک بی بی اور تھیں برادری کے سب لوگ، عورتیں مرد، چھوٹے بڑے ان کو دادی اماّمن کہتے تھے۔ انھوں نے سو سال سے اوپر کی عمر پائی۔ دادی امامن کہتی تھیں، مجھے غدر یاد ہے۔ لیکن کسی کو کچھ سناتی نہ تھیں، خاموش رہنے کی عادت تھی، گویا طے کر چکی تھیں کہ اس ناگفتنی غم کو اپنے سینے میں چھپا کر لے جانا ہے۔

غدر ایک حدِ فاصل ہے۔ اس وقت تک پرانی روایات سالم اور باقی تھیں۔ مدتوں سے جو قواعد و ضوابط یا سادہ زبان میں کہنا چاہیے طور طریقے رائج چلے آرہے تھے ان سے شہری دیہاتی سب واقف تھے، ان پر خوشی سے عمل کرتے تھے، ان کی بجا آوری میں کسی کو تکلف اور اعتراض نہ تھا، نہ انحراف کی مجال ہوتی تھی۔ علم قانون یہی سکھاتا ہے کہ عرصے تک معاشرے میں نافذ اور جاری رہنے والے احکام لوگوں کی عادتِ ثانیہ بن جاتے ہیں۔ ان کی نوعیت رسومات یا دستور کی سی ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر قانون کی زبان میں دستور کے لفظ نے وسیع معنے پہن لیے۔ اگر خلاف معمول واقعات پیش نہ آئیں تو معاشرے کے اختیار کیے ہوئے چلن دیر تک برقرار رہتے ہیں اور تسلیم شدہ آئین و آداب کے خلاف ردّ و قدح کا قضیہ آسانی سے کھڑا نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کی آبادیاں دیہات میں ایک تعمیری مقصد کی تکمیل کرتی تھیں۔ خصوصاً سادات و شیوخ کو وہاں سوچ سمجھ کر حکمت عملی کے تحت بسایا گیا تھا۔ غدر تک وہ منشا و مقصد حسب دستور سابق تسلسل کے ساتھ انجام پاتا رہا۔ غدر میں بساط الٹ گئی۔ جارچہ و چھولس کے سید بھی انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے اور مرگِ انبوہ جشنے دارد کا مصداق درست ثابت ہوا۔ ان پر بغاوت کا الزام لگا۔ اور ساری جائدادیں یعنی جارچہ و چھولس، نور پور، وغیرہ، جو صدیوں سے ان کے تصرف میں تھے سب چھین لیے گئے۔ سید عرصہ دراز سے امن و قانون کے محافظ سمجھے جاتے تھے۔ ان کا پورے علاقے پر رعب اور اثر تھا۔ غدر کی افتاد ایسی پڑی کہ صورت حال ان کے قابو سے نکل گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ابدمنی کی رو تھام اچھی طرح نہ کر سکے۔ شیر شاہ کی مشہور شاہراہ جو عرف عام میں سڑک اعظم کہلاتی ہے، دہلی سے نکل کر تقریباً

پینتیس میل شمال مشرق کی طرف آگے بڑھتی ہے تو قصبہ سکندرآباد میں پہنچ جاتی ہے جس کو سلطان سکندر لودی نے بسایا تھا۔ جارچہ چھولس سڑک اعظم سے تین چار میل ہٹ کر شمال میں رہ جاتے ہیں۔ سکندرآباد ضلع بلند شہر کی ایک تحصیل ہے۔ جارچہ چھولس کچھ عرصہ پہلے تک اس سے متعلق تھے۔ تحصیل مذکور کی حدود جمنا کے کنارے جاکر ختم ہوتی تھیں، یعنی جمنا پار کیجیے تو دہلی میں داخل ہوجایئے۔ یہ علاقہ زیادہ بڑی تعداد میں گوجروں کا مسکن ہے۔ وہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے تک مندرجۂ فہرست قبیلوں کی ردیف میں شامل تھے۔ مویشیوں کی چوری ان کا خاص پیشہ اور شیوہ تھا۔ انگریزوں کو جنگ عظیم میں سپاہیوں کی ضرورت پڑی تو گوجروں کو رعایتاً جرائم پیشہ قبیلوں کی فہرست سے نکال دیا گیا۔ یہ ایک پرانا تجربہ اور ہمیشہ کا قاعدہ ہے کہ دہلی میں ذرا سی کوئی بات ہوئی، یعنی حکومت کی انتظامی گرفت میں معمولی سا فرق آیا، اور گوجروں نے لوٹ مار شروع کردی۔ اس رنگ میں ہنوز کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ غدر کے موقع پر ایسا ہونا امید کے خلاف نہ تھا۔ گوجروں نے سکندرآباد کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا اور وہ ہنرمندی دکھائی جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ ہندوستان کی مجموعی آبادی کا نقشہ غدر تک اس انداز کا تھا کہ شہروں میں زیادہ تر مسلمان اور دیہات میں ہندو رہتے تھے۔ یہ تبدیلی غدر کے بعد کی ہے کہ ہندو شہروں کی طرف منتقل ہونے لگے اور شہر میں آکر بستے چلے گئے، ورنہ چند تجارت پیشہ بنیوں کے علاوہ شہر میں ہندو آبادی برائے نام ہوتی تھی۔ بنارس اور متھرا جیسے قدیم شہروں کو اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے مگر ایسی مثالیں کم تھیں۔ سکندرآباد کا قصبہ بھی عام شہروں کی طرح مسلمانوں سے آباد تھا۔ وہاں انصاری برادری کو ہمیشہ نمایاں اور غالب عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ انصاریوں نے اعلان کیا کہ دیکھیں بھلا ہمارے ہوتے ہوئے قصبہ کیسے لٹ جائے گا۔ بدقسمتی سے اپنی روایتی سادگی اور سیدھے پن میں ایک جملہ شرطیہ بھی منہ سے نکال بیٹھے کہا کہ جارچہ چھولس کے سید آگئے تو مجبوری، ورنہ کوئی ہمارے سامنے نہ ٹھہر سکے گا۔ گوجروں کے کان تک یہ بات پہنچ گئی۔ انھوں نے پہلے تو شہرت پھیلائی کہ سید لوٹنے آرہے ہیں۔ پھر حملہ کرتے وقت ایک دوسرے کو

فرضی ناموں سے پکارا۔ مشہور ہے کہ بعض نے ڈاڑھیاں بڑھالی تھیں اور اکثر دھوتی کی جگہ پائجامے پہنے ہوئے تھے۔ انصاری سپر انداختہ ہوگئے اور سکندر آباد لٹ گیا۔ حکومت کی طرف سے لوٹ کی ذمہ داری سیّدوں پر ڈالی گئی۔ حقیقت یہ تھی کہ سیدوں کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی، اور جب ان تک اطلاع پہنچی تو حادثہ گزر چکا تھا۔

جارچہ عطیۂ شاہی اور معافی دوام تھا۔ لہٰذا تمام ضبط ہوگیا۔ چھولس بھی پورا ہی ضبط ہوا تھا مگر ملکہ وکٹوریہ کے اعلان امن کے بعد میر علی رضا نے مقدمہ لڑایا اور دستاویزی شہادتیں پیش کیں کہ آدھا گاؤں عطیہ شاہی تھا اور نصف دیگر ہمارے مورثِ اعلیٰ نے اپنے زرِ خاص سے خریدا تھا۔ وہ حصّہ جو زر خرید تھا، عطیۂ شاہی نہ تھا، مقدمہ بازی کے نتیجہ میں سیّدوں کو واگذار ہوگیا۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ جارچہ ضبطی کے بعد پچاس ہزار روپیہ میں نیلام ہوا۔ مولانا ظہیر عباس بتاتے تھے کہ ہمارے اہل برادری مالی اعتبار سے بااستطاعت لوگ تھے اور ان کی ملکیت میں فقط آم کے درخت ہی اتنے سارے تھے کہ فروخت کرتے تو لاکھ روپیہ کی رقم جمع اور فراہم ہوسکتی تھی۔ مگر خوف ودہشت کے علاوہ طبیعتوں پر آشفتگی اور مایوسی طاری ہوگئی تھی۔ سب دل شکستہ گھروں میں بیٹھے جان کی خیر مناتے رہے۔ نیلام کی بولی پر کون جاکر کھڑا ہوتا۔ مسلمانوں کا ہر جگہ یہی عالم تھا اور ہر طرف افسردگی و ہراس کی فضا چھاگئی تھی۔ سکندر آباد کے سب سے مقتدر زمیندار وہاں کے شیخ زادے تھے۔ علی گڑھ میں اس خاندان کے ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ وہ سنانے لگے کہ غدر کے بعد انگریز حاکم سکندر آباد آیا تو میرے جدامجد موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر قصبے کے باہر ایک مسجد میں جا بیٹھے۔ انگریز سے ہرگز ملنے نہ گئے۔ کائستھوں نے اپنے کو خیرخواہ اور وفادار بناکر پیش کیا۔ انگریز ہماری زمینداری ان کو بخش کر چلا گیا آزادی کے بعد خاتمہ زمینداری ہوا تو وہاں کا کائستھ زمیندار تقریباً ستر ہ یا بیس دیہات کا مالک تھا۔ وہ بزرگ اکثر لائبریری میں نظر آتے تھے۔ سیّد احمد خان کی سی رعب دار ڈاڑھی اور سر پہ ہیٹ جو کبھی ٹوپ کہلاتا تھا۔ میری بابت معلوم ہوا کہ چھولس کا رہنے والا ہوں تو ملاقات کے لیے تشریف لائے اور اپنا پتہ دے گئے۔ علی گڑھ بقول امیر مینائی ایک میکدۂ بیخودی ہے

جہاں کسی کو کسی کا ہوش نہیں۔ میں ان سے ملنے نہ جا سکا۔ فرماتے تھے سکندر آباد کی تاریخ لکھنا چاہتا ہوں۔ مآخذوں کی تلاش اور مطالعے کی غرض سے لائبریری آتا ہوں آپ بھی کچھ بتائیے کونسی کتابوں میں مفید مطلب اطلاعات مل سکتی ہیں۔ مجھے ان کے سامنے کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ میں بھی اپنے عزیزانِ وطن سے کم و بیش اسی قسم کا دعارہ کیے پھرتا ہوں۔

مصیبت آتی ہے تو کہاوت ہے کہ تنہا نہیں آتی۔ پیچیدگی اور الجھن بڑھانے کے لیے دو چار اسباب و عوامل ساتھ لاتی ہے۔ سمندِ ناز کو ایک زور دار تازیانہ اور لگا۔ ہوا یہ کہ چھولس میں ایک سیّد صاحب تھے جن کا تعلق خاطر سکندر آباد کی کسی طوائف سے تھا۔ میرے والد ان کا نام بتاتے تھے۔ میں بھول گیا۔ جب چاروں طرف افراتفری پھیلتی نظر آئی تو وہ طوائف کو لینے کے لیے پہنچے۔ یہاں غیر ضروری طولِ کلام کی معذرت کے ساتھ اور صفائی کے طور پر عرض کرنا مناسب ہوگا کہ زمینداروں کے طرز بود و باش میں طوائفوں سے میل جول اور ان کے گانے بجانے سے لطف اندوز ہونا کوئی عیب کی بات نہ تھی بلکہ نہایت لازمی شوق تھا۔ رنڈیاں زمینداروں کی شان میں اضافے کا باعث تھیں۔ جس قدر زیادہ کوئی رئیس ابنِ رئیس اور خانِ عالیشان رنڈیوں سے جی بہلاتا تھا، رقص و سرود کے جمگھٹ لگاتا تھا، زبانِ خلق ویسے ہی جوش و خروش اور مبالغہ آرائی کے ساتھ اس کی تعریفوں کے نقارے بجاتی تھی۔ مسلمانوں نے خصوصاً شمالی ہندوستان میں، بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ اپنے زوال کی سختیاں اور تلخیاں شاعری اور طوائف کے سہارے مستی سے گزارے گئے۔ نغمہ و نشاط اور مشاعرے کی محفلوں نے کوئی دو سو بلکہ ڈھائی سو برس تک طبیعتوں کو باغ و بہار بنائے رکھا، ورنہ واقعی خراب حشر ہوتا پوری قوم بے جان اور بدمزاج ہو کر رہ جاتی۔ بہر حال نفسِ مضمون یہ تھا، شیطان دخل دینے کے لیے آ کھڑا ہوا، کہ چھولس کے میر صاحب سکندر آباد تشریف لے گئے۔ وہاں خیال آیا کہ تحصیل دار سے بھی ملتے چلیں۔ میر صاحب سے دوستی کے اعتماد پر تحصیلدار نے کہا کہ سکندر آباد خطرہ میں ہے، آپ میرے بال بچوں کو چھولس لے جائیے۔ سیّد صاحب وہاں سے وعدہ کر کے

اُٹھے۔ مگر وہ جو ضرب المثل اردو یا کسی اور زبان کی سنتے ہیں کہ دل کی بھی اپنی ایک جداگانہ منطق ہوتی ہے، شاید کوئی کتاب بھی ایسی روئیداد پر مشتمل کبھی مشہور تھی، وہی معاملہ درپیش آیا۔ میاں کی سواری تو دراصل رنڈی کے لیے گئی تھی ــ وہ پاندان سمیت ٹھسّے سے بیٹھی، چاروں طرف اس کے بھڑوے شہد کی مکھیوں کی طرح چپک گئے۔ میاں نے گھوڑے میں ایڑھ لگائی اور قافلہ جھوسی جا پہنچا۔ میر صاحب جو وعدہ تحصیلدار سے کر کے آئے وفانہ کرسکے۔ طوائف کی محفلوں میں لگ گئے کچھ یاد نہ رہا۔ فیثا غورث حکیم یونانی کا قول ہے کہ موسیقی کی تاثیر سے روح اپنے مبداءِ اصلی یعنی عالم الست کی طرف چلی جاتی ہے۔ اور اہلِ راز اضافہ کرتے ہیں کہ روح کو جانے میں دیر لگے تو جنت خود وہیں اتر آتی ہے جہاں سارنگی طبلہ اور رقاصہ کے گھنگرو ہنگامہ مچائے ہوں۔ غرضکہ تحصیلدار کے دل میں شکایت پیدا ہوئی اور اس نے انتقام لیا۔ انگریز حاکم سکندر آباد کا معائنہ کرنے آیا تو تحصیلدار نے بیان میں کہا کہ میں تحصیل کی چھت پر سے ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ یقیناً جارچہ جھوسی کے سید لوٹ میں شامل تھے۔ وہ بیان جارچہ جھوسی کی ضبطی کا سبب بنا اور اسی گواہی کی بدولت سرکاری کاغذات میں آج تک سیّدوں کا نام لوٹ کے مجرموں کی حیثیت سے درج چلا آتا ہے۔ یہ دعویٰ کیا بھی مضبوط سہی کہ تاریخ سچ کو جھوٹ سے علیحدہ کر کے چھوڑتی ہے، پھر بھی خدا جانے کتنے بے شمار جھوٹ اس کے دفتر میں لگے رہ جاتے ہیں

غدر سے برصغیر کی آزادی اور تقسیم کے سانحے تک نوّے برس کا عرصہ ہوتا ہے اس زمانے کو فیصلہ کن اور تاریخ ساز، بلکہ کچھ زیادہ، یعنی تقدیر ساز کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ غدر کے بعد سیّد احمد خان کی قیادت نے مسلمانوں میں نئے سرے سے اعتماد اور زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ وہ ان کو پرانی دنیا سے کھینچ کر عہد جدید کی روشنی میں نکال لائے۔ یہی اُن کے کارنامے کا خلاصہ ہے۔ ان کی تحریک میں اوّل دن سے سادات جارچہ جھوسی کی نسل کا ایک فرد شامل ہے۔ علی گڑھ کالج قائم کرنے کے بعد سیّد احمد خان نے کالج کے اساتذہ کی پہلی کھیپ کا تقرر اپنے ذاتی انتخاب سے کیا تھا۔ مولانا عباس حسین ان کی دعوت پر اساتذہ کالج کی برادری میں شامل ہوئے۔ ہندوستان کو تاج برطانیہ کا حصہ بنانے کے بعد انگریزی حکومت نے اعلان کیا کہ ہندوستانیوں

کو جمہوری طرزِ حکومت سکھایا جائے گا اور بتدریج اختیارات دیے جائیں گے تاکہ ہندوستانی اپنی حکومت آپ چلانے کے اصول سیکھیں۔ انگریز حاکموں کے ایماسے انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی ہندوستانیوں کو سیاسی تربیت دینا اور جمہوریت کے طریقے سکھانا پارٹی کا ابتدائی مقصد تھا۔ سید احمد خاں کو اپنی حیاتِ مستعار کے آخری دنوں میں مستقبل کا نقشہ نظر آگیا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے بچا کر دور رکھنے میں خیریت سمجھی۔ دو وجوہات میں سے ایک عارضی اور دوسری مستقل نوعیت کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ابھی تو غدر کی تباہی سے ہوش بجا نہیں ہوئے ہیں۔ فوراً سیاست میں کود پڑے تو تمہارا کیا بھروسہ کدھر منہ اٹھے اور کہاں پہنچ گے۔ دوسرے یہ نکتہ ان کی بصیرت سے پوشیدہ نہ رہ سکا کہ جمہوریت؟ یعنی کہ یہ تو اکثریت کی مطلق العنانی کا دوسرا نام ہے مسلمان ایک مستقل اقلیت ہیں۔ جمہوری نظام میں قطعی طور سے قوت فیصلہ اکثریت کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ کانگریس پچانوے فیصدی ہندوؤں کی جماعت ہے۔ وہ مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کہاں سے کرے گی۔ مسلمانوں کا سیاسی شعور محدود تھا پھر بھی جمہوری اور آئینی سیاست کے داؤ پیچ سمجھنے میں ان کو زیادہ وقت نہ لگا۔ کانگریس پارٹی سنہ ۱۸۸۵ عیسوی میں قائم ہوئی تھی۔ سرسید نے اگلے سال مسلمانوں کے لیے جداگانہ سیاسی پلیٹ فارم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے مہیا کر دیا اور پھر اکیس برس بعد (سنہ ۱۹۰۶ء) جداگانہ پارٹی مسلم لیگ کے نام سے قائم ہوگئی۔ مسلمان اس ارادے پر جم گئے کہ اپنا آزاد سیاسی وجود باقی اور برقرار رکھنا ہے۔ ان کو جدا انتخاب کا حق حاصل ہوگیا۔ میدانِ سیاست کے ہنگاموں کا لب لباب یہ ہے کہ آخری وقت تک مسلمانوں کو یہی کھٹکا لگا رہا اور سنہ ۱۹۴۷ عیسوی تک ان کی سیاسی سرگرمی محض اس اندیشے کے گرد گھومتی رہی کہ انتقالِ اقتدار کی صورت میں حق بہ حق دار کا اصول مجروح نہ ہونا چاہیے اور وہ اپنے حصے سے محروم نہ رہ جائیں۔

ہندوستانی تاریخ کا وہ دور جو تحریک آزادی کہلاتا ہے، مستقبل کی نسلوں کے لیے ہمیشہ سوالیہ نشان بنا رہے گا اور ان کو برابر جستجو رہے گی۔ البتہ یاد رکھنا چاہیے کہ حقائق کی گرہ کشائی کے لیے شہادتیں بہت زیادہ موجود ہیں۔ وہ انگریز جو امور مملکت

کے سلسلے میں ہندوستان سے وابستہ رہے، وہ ہندو اور مسلمان لیڈر جنھوں نے سیاست میں حصہ لیا۔ وہ بزرگ جنھوں نے شخصاً حصہ نہ لیا مگر دلچسپی اور غور سے سارا کھیل دیکھا۔ ان سب کا بیان تحریری موجود ہے۔ موقف کسی کا کچھ بھی ہو ان کی شخصی معلومات اور سوانحی انداز کی یادداشتیں بہرحال ایک اہم ورثہ ہیں۔ دانش گاہی اور صحافتی حلقوں نے الگ کتابوں کے انبار میں اضافہ کیا۔ طالب علم روزی روزگار کی خاطر موضوع کو کھنگالنے میں لگ گئے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ، اور بعض اوقات خصوصی، اجلاسوں کی کارروائیاں، مباحثے اور قراردادیں، سب محفوظ ہیں۔ انڈیا آفس کی خفیہ دستاویزات کا ذخیرہ فی الحال بارہ ضخیم جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ اتنے سارے ماخذوں کے ہوتے ہوئے معاملات کی اصلیت تک پہنچنا دشوار نہیں رہ گیا ہے۔ مزید یہ کہ ہندوستان کی سیاست وقت کے ساتھ جن مرحلوں سے گزری اور رفتہ رفتہ جو اتار چڑھاؤ آئے ان کو آسانی سے انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

فی الجملہ، ساری داستان کا لب لباب یہ ہے کہ اقلیتی قیادت مسلسل اپنے حقوق کے تحفظات اور آئینی ضمانت پر اصرار کرتی رہی۔ دوسری طرف، اکثریتی قیادت کسی طرح بھی اپنے ساتھ اقلیت کو اقتدار میں حصہ دار بنانے کے لیے آمادہ اور راضی نہ ہوئی۔

اگر کوئی پوچھے کہ مسلمانوں کا موقف اس قدر سیدھا سادا، معصومانہ، اور صاف ستھرا تھا تو پاکستان کا مطالبہ کہاں سے آ گیا اور تقسیم کا قضیہ کس نے کھڑا کیا، تو اصل بات یہ ہے کہ کانگریسی لیڈرشپ کو جھپکی دینے کے لیے اور ان کے غرور کا پارہ نیچے اتارنے کی غرض سے ایک حربہ ایجاد کیا گیا تھا۔ مقصد اتنا سا تھا کہ تقسیم کے نتائج سوچ کر کانگریسی لیڈر اپنی ضد سے باز آ جائیں گے اور مسلمانوں کے ساتھ کوئی مناسب قسم کا سودا کرنے کی صورت نکل آئے گی۔ معاملہ کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۳۰ عیسوی الہ آباد میں منعقد ہوا۔ جس کے صدر علامہ اقبال تھے۔ انھوں نے اپنا خطبۂ صدارت اس معذرت کے ساتھ پڑھا کہ مجھے سیاست داں نہ سمجھیے، میں تو اسلامی

علوم کا ایک طالب علم ہوں. فکر و مطالعے کی سوجھ بوجھ کے نتیجہ میں میرا اندازہ یہ ہے کہ ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ کبھی نہ کبھی ایک آزاد مسلم ریاست بن جائے گا. خطبۂ صدارت بنگال کے ذکر سے خالی ہے کہ وہاں جس چیز کو رینیاسانس کے نام سے شہرت دی گئی اس سے فقط ہندو اقلیت فیضیاب ہوئی، صوبے کا اکثریتی طبقہ، یعنی مسلمان، جاہل اور مفلس رہ گیا۔ ایک طرف رینیاسانس جاری تھا دوسری طرف مسلمان تہمد باندھے تالابوں میں مچھلیاں پکڑتا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۷ عیسوی میں صوبائی وزارتوں کی تشکیل کا موقعہ آیا اور کانگریس نے مسلمانوں کی رائے عامہ کو ٹھوکر دیا تو ردعمل کے طور پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سنہ ۱۹۴۰ عیسوی (لاہور) میں ایک قرارداد منظور ہوئی جس کو قرارداد پاکستان کہا جاتا ہے. مگر اس قرارداد کی سنجیدگی اور وزن کا اندازہ لگانے کے لیے یہ حقیقت کافی ہے کہ مسلم اکثریت کے مغربی صوبوں میں مسلم لیگ کبھی وزارت نہ بنا سکی. عین حصول آزادی کے موقعے پر مسلمانوں کی قیادتِ اعلیٰ کے ارادے اور نیت کا ثبوت اس بات سے واضح ہے کہ اس نے برطانوی کابینہ کے مشن (سنہ ۱۹۴۶ عیسوی) کی پیش کردہ تجاویز کو کھلے دل سے مان لیا تھا. کانگریسی رہنماؤں کی طرف سے اعلان ہوا کہ انگریزوں کے جانیکے کے بعد ہم کسی معاہدے کے پابند نہ رہیں گے اور یہ اصرار انھوں نے کیا کہ پاکستان دے کر مسلمانوں سے نجات حاصل کرلینا بہتر ہے. انگریز لاٹ صاحب کی نیک چلن بیوی، بیوی کے ذریعہ لاٹ صاحب، لاٹ صاحب کے ذریعہ انگلستان کی لیبر حکومت، نہرو کے قبضے میں تھی. سیاست دانوں کو سب کام آتے ہیں. آخرکار پاکستان منظور ہو گیا تو مسلم قیادتِ اعلیٰ کے موقف میں ایک دم نئی اور عجیب تبدیلی رونما ہوئی، جو اس کے کردار کو بلاتبصرہ آئینہ کر دیتی ہے. یعنی پاکستان منظور، مگر بنگال اور پنجاب کی تقسیم منظور نہیں. بنگال اسمبلی کے مسلم اراکین کو صوبے کی تقسیم کے خلاف ووٹ دینے کی ہدایت جاری کی گئی اور انھوں نے متفقہ طور سے اس ہدایت پر عمل کیا. ہندو اراکین اسمبلی کی اکثریت، یعنی اناسی (۷۹) میں سے اٹھاون (۵۸) ووٹ تقسیم کے حق میں گئے. پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ اقتدار سے محروم تھی، وہاں قیادتِ اعلیٰ کا حکم کون مانتا؟ البتہ اسمبلی کے سکھ اراکین کو تقسیم پنجاب کے خلاف ووٹ دینے اور پاکستان میں شامل

رہنے کی پیش کش کی گئی اس وقت سکھوں کی سمجھ میں رموزِ مصلحت نہ آسکے۔ خواہ مخواہ کسی ضرورت کے بغیر پنجاب میں دس لاکھ آدمی مارے گئے۔ دہلی کا شہر بھی نزولِ بلا سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اقبال نے ایک موقع پر خواجہ حافظ کی پھبتی دہلی پر چسپاں کی تھی: کہ آں عجوزہ عروسِ ہزار داماداست۔ دہلی اجڑی اور وہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ جارچہ چھپلس کے سادات کا خون بھی حسب بساط مسلمانوں کے خون ناحق میں شامل ہے۔ جارچے کے اختر میاں، ان کا بیٹا قیصر حسین، اور چھپلس نور پور کے رضی محمد دہلی کی خونریزی میں جاں بحق ہوئے۔ حفاظت حسین نام کے ایک نوجوان کو دہلی سے جارچے آتے ہوئے راستے میں بلوائیوں نے ظلم کا نشانہ بنایا۔

میثاق لکھنؤ (سنہ ۱۹۱۶ عیسوی) کی اصل مصلحت اور اس میں خاص فائدے کی صورت یہ تھی کہ کانگریس نے مسلمانوں کی آزاد سیاسی حیثیت تسلیم کرلی تھی، بعد میں انکار کر دیا۔ اس وقت سے لے کر برطانوی کیبنٹ مشن کی آمد تک (سنہ ۱۹۴۶ عیسوی) متعدد مرحلے آئے جب اقلیت نے دستِ سوال بڑھایا۔ اکثریتی قیادت ہر دفعہ ان کے مطالبات کو سیاسی داؤ پیچ، روباہ بازی اور گرمئ گفتار کے زور سے جھمیلے میں ڈالتی رہی۔ مسلمانوں کا سوال فقط یہ تھا کہ ملک کے اقتدار میں لطور اقلیت ان کا حصہ کتنا ہوگا اور کن شرائط پر ملے گا۔ جمہوری طریقہ خاصا پیچیدہ تھا۔ حق رائے دہندگی کے قانون میں جائیداد[۱] اور دولت[۲]، یعنی مال گزاری اور انکم ٹیکس اور اعلیٰ[۳] تعلیم کی رکاوٹیں لگی تھیں۔ مسلمان ان تینوں باتوں میں ہندوؤں سے پیچھے تھے۔ مسلم اکثریت کے صوبوں کی اسمبلیوں میں بھی ہندو اراکین کی تعداد غالب تھی۔ جناح نے ایک دفعہ بنگال اور پنجاب کی اسمبلیوں میں علی الترتیب مسلمانوں کی اکتیس[۳۱] اور بتیس[۳۲] فی صدی نمائندگی مانگی۔ اکثریتی قیادت راضی نہ ہوئی۔ دونوں صوبوں کے مسلمان لیڈرانِ قوم الگ برہم ہوئے کہ تم ہماری طرف سے ایسا کمزور سودا کرنے والے کون ہوتے ہو۔ بنگال میں جناح کو سیاہ جھنڈیاں دکھائی گئیں۔ لاہور میں سیاہ جھنڈیوں کا انتظام تھا۔ اقبال نے بمشکل لوگوں کو اس نامعقول حرکت سے باز رکھا۔ سنا ہے اقبال کے ملازم میاں علی بخش، ان کا پیغام

سے لاہور شہر میں بھاگتے پھرے۔

کانگریسی قیادت اول دن سے (سنہ ۱۸۸۵ عیسوی) دو مقصد لے کر اٹھی تھی۔ پہلا ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانا، جس میں وہ مسلمانوں سے شرکت اور تعاون کی اپیل کرتی تھی۔ مسلمان برابر اس اپیل کا مثبت جواب دیتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کا ایک طبقہ مستقل طور سے کانگریس کا بلا شرط ہمنوا اور وفادار بن گیا۔ دوسرا مقصد، جس کی خاطر کانگریسی قیادت پورے جوش اور سرگرمی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ہندو تہذیب کا احیا اور قدیم ہندوستان کی عظمت کی بازیافت کرنا تھا۔ بنگال میں راجہ رام موہن رائے کا شروع کیا ہوا رینا سانس ہوتے ہوتے سارے ہندوستان کا رینا سانس بن گیا۔ قدرتی طور سے یہ مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کا اشتراک مشکل بلکہ صریحاً ناممکن بنا دیتا تھا۔ اگر مسلمان امور مملکت میں شریک کی حیثیت سے گھس جاتا، یعنی فرض کیجیے آئین و دستور کے تحت تہائی یا چوتھائی حصہ ہی سہی، مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں، اور پھر حکومت کے نظم ونسق میں لے بیٹھتا تو ہندو تہذیب کو رونق بخشنے کا خواب کہاں سے شرمندۂ تعبیر ہوتا اور کس میں ہمت تھی کہ مسلمانوں سے چھ سو برس کے قرضوں کا حساب طلب کرتا۔ متحدہ ہندوستان کی خاطر اتنی بڑی قربانی دینے کے لیے برادران وطن تیار نہ تھے۔

بنگالی صحافی، نیرد چودھری کی رائے میں (سوانح حصہ دوم) ہندوستانی سیاست کی طویل اور پیچیدہ رودیاد میں سب سے زیادہ صاف ستھرا کردار محمد علی جناح کا ہے۔ وہ ہمیشہ عوامی سیاست کی کسوٹی پر کھرے ثابت ہوئے، کبھی جھوٹ نہ بولا، کسی موقع پر ہیر پھیر کی بات نہ کی، مکروفریب سے کام نہ لیا اور کسی کو دھوکا نہ دیا۔ وہ اپنی سیرت کو موقع پرستی، مصلحت کوشی اور ان ساری کمزوریوں سے بچائے رہے جن سے اہلِ سیاست کا بچنا مشکل ہے۔ معاصرین نے ان کو نفرت کا ہدف بنایا، بے دھڑک توہین کی، صدمے پہنچائے اور مایوس کیا۔ غیروں کی بدسلوکیاں جانے دیجیے، اپنوں کی مہربانیاں ہی اس قدر کافی تھیں کہ بقول خواجہ آتش:
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا۔ پنجاب میں سر محمد شفیع، میاں فضل حسین، سکندر حیات،

اور خضر حیات کی مسلسل اور بے لچک کارفرمائیاں یاد کر کے پنجابیوں کو شرم آئے نہ آئے ان بزرگوں کی روحیں ضرور شرماتی ہوں گی، خدا ان پر رحمت نازل کرے. جناح کی توقعات اور مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا مرکز یوپی کا صوبہ تھا مگر وہ دیار آسائش بھی وقتاً فوقتاً پریشانیوں کے چکّر سے خالی نہ رہا. ایک دفعہ لیاقت علی خان مُسلم لیگ چھوڑ کر نواب صاحب چھتاری کی ایگریکلچر پارٹی میں چلے گئے۔ جناح اصرار و سماجت سے واپس لائے. کانگریسیوں نے مذاق اڑایا کہ ملاحظ فرمائیے، پارٹی کے صدر کو تنہا چھوڑ کر مدیر عمومی بھاگ گیا۔ جناح کے سوٹ کیس میں پوری پارٹی ہے، تمام شد۔ دوسری دفعہ کی ایک مثال اور ہے. بہرائچ حلقے کے ضمنی انتخاب کو جناح نے اپنی عزت اور وقار کا سوال بنا لیا۔ چودھری خلیق الزماں نے استادی کا ہاتھ دکھایا. مسلم لیگ کا امیدوار کھڑا ہی نہ کیا اور کانگریس کے امیدوار رفیع احمد قدوائی کو بلامقابلہ کامیاب کرا دیا۔ جناح نے اس حرکت کو معاف نہ کیا. خلیق الزماں ہوشیار وکیل تھے، کتاب لکھ کر صفائی پیش کی. مسلم لیگی لیڈروں کا یوپی کے اندر نہایت دلچسپ قسم کا ہجوم تھا، مگر تنہا ذات مہاراجہ محمود آباد کی تھی جس نے جناح کو کبھی شکستہ خاطر نہ ہونے دیا اور ان کا حوصلہ برابر بڑھاتے رہے. مہاراجہ نے ساری جدّوجہد کو سیاسی تحریک نہیں بلکہ خدمت، مقصد اور فریضہ سمجھا. انھوں نے اپنی دولت جھونک دی اور اپنے اوپر آرام حرام کر لیا۔ مہاراجہ کے اس کاروبار شوق میں ان کے سب سے مستند ہمنوا، ہمراز، مشیر، دم کے ساتھی، پرانے اتالیق اور شوق کے ترجمان، جو کچھ بھی تھے مولانا ابن حسن جارچوی تھے. لکھنؤ کے لوگ ابن حسن جارچوی کو مہاراجہ کا سیاسی دماغ کہتے تھے۔ اور یہ خطاب صحیح تھا۔ ابن حسن جارچوی مذہبی تربیت کے انسان تھے. مہاراجہ کے اندر بھی خداداد طور سے پاکیزگی اور دردمندی کی ایسی صفات موجود تھیں کہ رئیسوں کے مزاج میں کم ہوتی ہیں. دونوں کی طبیعتوں کا سچ پوچھیے تو مبادیاتِ سیاست، یعنی جاہ طلبی، دنیاداری اور مکروفریب سے قطعی جوڑ نہ تھا۔ وقت کی نزاکت اور غیر معمولی رفتارِ زمانہ ان کو اس بیابانِ خطرناک میں اتفاقاً لے آئی تھی۔

**خلاصہ:** غدر کے بعد ہوا یہ کہ دہلی سے لے کر مرشد آباد تک بسنے والے مسلمانوں کے دل میں ایک زبردست حسرت جاگ اٹھی، اور یہ لہر بندھیاچل سے نیچے اتر کر بحیرۂ عرب اور خلیج بنگال کے ساحلوں تک پھیل گئی، کہ ہماری حکومت جو ہاتھ سے جاتی رہی ایک دفعہ پھر قائم ہونی چاہیے۔ آخر وقت نے سوال کیا کہ ایسا نقشہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں بن سکے گا، اور تم اس نقشے سے قطعی باہر ہندو اکثریت کی جوتیاں کھانے، ذلت اٹھانے اور تباہ ہونے کے لیے رہ جاؤ گے، تو وہ بیچارے اس پر بھی راضی ہو گئے، سر بازار ز سوالی نشستم تا چہ پیش آید، کانگریس کی وزارتوں نے اس شوق اور تمنا کو (۱۹۳۷ء) اور زیادہ بڑھانے کے اسباب پیدا کیے، جو لوگ اس باریک نفسیاتی نکتے سے واقف نہیں وہ حیرت کرنے اور مذاق اڑاتے ہیں کہ ہندو اکثریت والے علاقے کے مسلمانوں نے دیدہ ودانستہ پاکستان کا غل مچایا، کیا سوجھی؟ شمال مغربی خطے کی مسلم اکثریت نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بنگال مسلمان کی مجبوری دوسری تھی، وہ اپنے صوبے کی ہندو اقلیت کی ایڑھی کے نیچے دبا تھا۔ اصل میں افراد ہوں یا اقوام، جینے کی تمناؤں کا سہارا چاہیے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ بہت سارے انسان مل کر کسی کام کی آرزو کریں تو اس کام میں خدا کی مرضی شامل ہو جاتی ہے۔

جناح نے قرار دادِ پاکستان منظور کرائی (۱۹۴۰ء) تو دوسری عالمی جنگ شروع ہوئے سال بھر ہو چکا تھا۔ وہ استقامت کے ساتھ اپنے موقف پر جم گئے تاکہ مناسب وقت پر مناسب سودا کر سکیں۔ جنگ نے تبدیلیوں کی رفتار امید سے کہیں زیادہ تیز کر دی اور اندازے کا تیر نشانے پر بیٹھنے سے رہ گیا۔ گاندھی جی کا طریقہ مختلف تھا۔ جنگ کے دوران حالات جس قدر تیزی سے بدلے اس سے زیادہ سیمابی کیفیت کے ساتھ ان کا ذہن حرکت کرتا نظر آتا ہے۔ ابتدائی موقف: پاکستان میری لاش پر بنے گا (ہریجن)۔ آخری موقف: لالہ جیت رائے تجویز سمجھا چکے تھے (۱۹۲۱ء)۔ پنجاب تقسیم کرو، اور باقی علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ میں پکڑا کر ان کی جھک جھک نمٹاؤ۔ ماہر شمشیر باز کی طرح پھرتی سے پینترا بدلنا اور پہلی پوزیشن چھوڑ کر ایک سو اسّی ۱۸۰ درجے گھوم جانا یہی سیاستداں کا کمال ہے۔

## چوتھا باب

# گلشنِ سبزوار (جارچہ)

جارچہ جب سے سادات سبزوار کا مسکن بنا اس وقت سے لے کر تقسیم ملک و ازادی سنہ ۱۹۴۷ عیسوی تک، کتنی پشتیں گزر گیئں، یہ حساب پرانے زمانے کے لوگ شجرے کے ذریعے محفوظ رکھتے تھے. شجرہ ماضی وحال کی چولیں ایسی بٹھاتا ہے کہ دونوں کا امتیاز غائب کر ڈالتا ہے. آپ لمحہ بھر میں سارے بزرگوں سے ملاقات کر لیجیے بلکہ حضرت آدمؑ تک پہنچ جایئے۔ طریقہ نہایت آسان: شجرے کو ایک دفعہ نیچے سے اوپر تک آنکھیں جما کر دیکھتے چلے جایئے اور پھر آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے کی طرف نظر کھسکاتے آیئے۔ یہ مشق مکرر کی جائے تو اور اچھی بات ہے، ذرا سی دیر میں ساری کیفیت روشن ہو جائے گی. جاہلی عرب علم الانساب سے واقف تھے اور ہر قبیلہ اپنا نسب یاد رکھتا تھا. مسلمانوں نے تاریخ کا فن وہیں سے سیکھا ہے. شجرے میں قباحت کا پہلو بھی مضمر ہے. مثلاً گدا علی، مست علی، قربان علی کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اتفاقاً سہو کاتب

سے یا کسی اور وجہ سے ایک دو کڑیاں درمیان سے نکل جائیں یا بصورت دیگر خواہ مخواہ ایک پہلوان علی کا اضافہ ہو جائے تو کوئی نہ سمجھ پائے گا اور کسی کو گمان بھی نہ گزرے گا کہ کیا گھپلا ہو گیا۔ مسلمان دانش مند اپنی تہذیب کے اتنے طولانی عرصے میں علم الانساب سے متعلق دو تین کتابوں سے زیادہ ترتیب نہ دے سکے۔

تاج الدین سمعانی کی کتاب الانساب" پہلی کوشش ہے۔ فخر مدبر کی " شجرۃ الانساب" دوسری اور فارسی زبان میں اس سلسلے کی ابتدائی کتاب ہے۔ مولف سلطان محمد غوری اور سلطان قطب الدین ایبک کا معاصر تھا۔ صوفیوں کے مسلک میں شجرہ نہایت ضروری نوعیت کی چیز بن گیا۔ وہاں قاعدہ یہ ہے کہ ہر صوفی صبح کی نماز کے بعد اپنے پیر طریقت کا شجرہ پڑھ کر مصلے سے اٹھتا ہے۔

چھولس جارچہ کے سیدوں کا شجرہ قاری جعفر علی اور انکے بیٹے مولانا عباس حسین کے کتابخانے میں موجود تھا۔ سنا ہے دو تین پلنگ ملا کر بچھائے جاتے تھے تب کہیں لمبا پھیلتا تھا۔ ہماری یاد میں ابھی کچھ برس پہلے مولانا کے مکان میں جو نہایت وسیع و عریض ہال کمرہ تھا، جس میں پوری مجلس کا مجمع آجاتا تھا۔ برسات میں اس کی چھت گر گئی اور کتابوں وغیرہ کے ساتھ شجرہ بھی تباہ ہو گیا۔ سید مسعود الحسن اور سید آل نقی دونوں حضرات تحسین و آفرین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دوبارہ شجرہ ترتیب دیا۔ ان کی جانفشانی کے نتیجے میں ضائع شدہ شجرے کی تلافی پوری طرح نہیں تو کافی حد تک ہو گئی۔ مسعود الحسن اس مقصد کی تکمیل میں دس سال لگے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کام مسلسل انہماک کے بغیر انجام نہیں پاتے۔ راقم الحروف کے چچا، اشتیاق حسین نے کراچی میں مذکورہ شجرے کا ایک نسخہ کہیں سے اپنے بیٹے، منتظر حسین کے ذریعہ منگوا کر مہیا کر دیا جو بہت کام آیا۔ " تذکرۃ الانساب سادات جارچہ" سے پرانی روایت اور مانوس ضابطے کی پابندی واضح ہے۔ یعنی معاملہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوتا ہے۔

سید لئیق الحسن کا رسالہ " جارچہ " اس موضوع سے متعلق ایک قابل ذکر بلکہ قابل سپاس و ستائش اقدام ہے۔ انھوں نے سادات جارچہ کے سب ہی خاندانوں کے نسب

تلاش وکوشش سے جمع کر دیے ہیں۔ مولانا ابن حسن کی سوانح حیات اور دیگر ضروری معلومات کے اضافے نے کتاب کو مزید سودمند بنا دیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی افادیت کا احساس بڑھتا جائے گا۔

مذکورہ بالا دونوں تالیفات کا لبّ لباب اور خلاصہ یہ ہے کہ جارچہ میں سیّدوں کے آٹھ خاندان آباد تھے: خاندان چہارم، خاندان نوگھریا، خاندان بندگی معظم، خاندان شاہ نعمت اللہ، خاندان شاہ جعفر قانع، خاندان شاہ یعقوب، خاندان شاہ ابراہیم دلوالی یعنی دلّی والے اور خاندان جعفری، قصبے میں جو محلے سادات کی آبادی پر مشتمل تھے وہ بھی تعداد کے اعتبار سے آٹھ ہی تھے: چوپال کلاں، کاٹھا گڑھی، چھتہ، راجو پٹّی، دمدمہ، پوستی خانہ، اور زین خانی ٹاپ۔ مسعود الحسن کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ مجموعی طور سے آٹھ خاندانوں میں بعض کا تعلق براہِ راست سید جلال بیہقی کی نسل سے ہے، اور بعض وہ ہیں جو وقتاً فوقتاً ازدواجی راہ و رسم یا دیگر مناسبات کی بنا پر باہر سے آکر جارچے میں آباد ہو گئے۔ البتہ شجرہ واضح کرتا ہے کہ خواہ مرحلہ بمرحلہ آئے، بیشتر بیہقی سادات ہیں جن کی بڑی جمعیت آج تک کشمیر اور خصوصاً سری نگر میں آباد ہے۔

جارچہ کسی زمانے میں شاندار قصبہ تھا۔ غدر کے بعد تنگیٔ معاش کے حالات پیدا ہوئے اور بتدریج لوگوں نے روزی روزگار کی فکر میں باہر نکلنا شروع کیا۔ متفرق مقامات پر جس کو جہاں سازگار حالات میسر آئے وہیں بود و باش اختیار کرلی۔ پھر بھی یہ معمول برقرار رہا کہ محرم کی عزاداری کے موقع پر یا خاندانی تقریبات کے سلسلے میں اکثر اہل برادری وطن واپس آکر اپنے گھروں کے قفل کھولتے تھے۔ اور صفائی مرمت وغیرہ میں لگ جاتے تھے۔ عموماً سیدوں کے رہائشی مکانات کا طرز تعمیر پرانی وضع کا تھا۔ اور چھوٹی اینٹ کے بنے ہوئے تھے۔ جن کی گرفت نہایت مضبوط ہوتی ہے۔ دنیا کی گم گشتہ اور غروب شدہ تہذیبوں کے آثار کا سُراغ اسی چھوٹی اینٹ کے ذریعہ ملتا ہے۔ قدیم روم کی یادگاروں کو بھی اینٹ آج تک سنبھالے ہے جن کو دیکھ کر اقبال نے دلّی کی عظمتِ پارینہ کو یاد کیا تھا: سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دِلّی یاد آتی ہے۔ جارچے میں چھوٹے پیانے

پر سہی، مگر شاہجہانی طرز کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہاں رہائش کے لیے آگے پیچھے دالان در دالان کا رواج عام تھا۔ جاڑوں میں استعمال کے لیے دالانوں کی بغل میں دونوں طرف کمرے، ورنہ آگے والے دالان پر موٹے پردے پڑ جاتے تھے۔ اگر کسی گھر میں ایک دالان ہے تو جواب کا قاعدہ ملحوظ رکھتے تھے، یعنی ایک دالان مشرق کی طرف اور دوسرا اس کے مقابلے میں مغربی رخ پر۔ یہ طریقہ طرز معماری میں جواب کہلاتا ہے، درمیان میں صحن چھوڑ دیا جاتا تھا، جو کشادہ ہو یا تنگ، نیم کا ایک درخت ضرور، جس کے نیچے گرمیوں میں عورتوں کی محفل جمی رہتی تھی۔ دیواروں کو گچ اور چونے سے ڈھکنے کا رواج کم تھا۔ گلیاں اور راستے کھڑی اینٹ کے فرش سے آراستہ تھے جس کو کھرنجا کہتے ہیں۔ کھرنجا گذرنے والوں کو آہستہ اور دبے پاؤں چلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آدمی کی رفتار دوسروں کو متوجہ کرتی ہو یا نہ کرتی ہو۔ وہ خود ہر قدم پر اپنے وجود کا احساس کرتا تھا کہ میں ہوں۔ بالآخر میں کچھ ہوں۔ راقم الحروف نے استاد محترم مولانا احمد ظہیر عباس قبلہ سے اکثر پوچھا کہ نصف صدی پہلے کا جارچہ جو بچپن میں دیکھا تھا اس کا نقش تصور میں باقی ہے۔ اکثر حویلیاں اپنے مکینوں کی رہائش سے کچھ خالی سی اور نیم شکستہ حالت میں نظر آتی تھیں۔ مناسب احتیاط اور نگرانی سے محروم ہونے کے باوجود ان کی ڈیوڑھیوں کے طاق و رواق، دلانوں کی محرابیں، دیواروں کے آثار، اور عموماً صدر دروازے کی اونچائی، سب مل کر گواہی دیتی تھیں کہ ان کے مالک خوش حال بلکہ معیار کے اعتبار سے متمول لوگ تھے۔ آخر ان کے وسائل کیا تھے؟ معلوم ہوا کہ غیر معمولی بڑی زمینداریاں تو سب کے پاس نہ تھیں لیکن لوگ بڑے رقبوں پر کاشت کرتے تھے۔ اور باغات کثرت سے سب کی ملکیت میں تھے جن کے ذریعہ معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ معاشرہ فارغ البالی، خوش حالی، اور تمول کی بنا پر جو مزاج اختیار کرتا ہے اس کا عکس جارچے کی زندگی میں خوب جھلکتا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دو تین دہائیوں تک پرانی روایات زندہ رہیں۔ اہل جارچہ اپنے مورث اعلیٰ سید محمود درجی کا عرس بڑے زور شور سے منانے کے عادی تھے۔ مزار پر مجرا گانے کے لیے نزدیک

کے شہروں سے طوائفیں پہنچتی تھیں۔ مشہور یہ تھا کہ جو طوائف ہمارے دادا کے مزار پر حاضری دینے نہ آئی، سال بھر کے اندر بیمار ہوگی اور ٹانگوں سے مجبور ہو جائیگی سمجھیے کہ ناچنے سے گئی۔ اور یا ایک آنکھ پھوٹے گی، چہرے کی خوب صورتی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اصل میں یہ افواہ تھی تو سیّدوں کے ذہن کی اختراع، مگر جارچے کے نقال، جن کا طوائفوں سے چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس کو دُور تک شہرت دیتے پھرے۔ طوائفیں اس پر اعتبار کرتی تھیں اور ڈر کے مارے ضرور آتی تھیں۔ اگر زیادہ ہجوم ہوگیا تو سیّد کہتے تھے سَب کو دادا کے مزار پر موقع دیا جائے گا۔ اور اس طرح کئی رات رقص و سرود کے ہنگامے سے طبیعت کو مَست رکھتے تھے۔ وہ افراد ابھی زندہ ہیں، یہ اور بات کہ ساٹھ سے متجاوز ہیں، جنھوں نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو محسوس کیا کہ عہد گزشتہ کے جارچے کی رونق کوئی دم کی مہمان ہے اور رخصت ہوا چاہتی ہے۔ جدید صنعتی دور کا آغاز دیہات قصبات پر شہر کی مکمّل برتری کا اعلان تھا۔ اس کے بعد پرانے قصبے پسماندگی، غربت، اور جہالت کے مترادفات بن کر رہ گئے۔ قصباتی معاشرے میں انسانی شخصیت کا بھرپور فروغ جس طرح پہلے ہوجاتا تھا اب بہت مشکل ہو گیا۔ مجبوراً لوگ گذر بسر کے لیے چھوٹی موٹی نوکریوں پر قناعت کرنے لگے۔ نوکریوں سے محروم ہوئے تو بالکل مزدوری پر آ گئے۔ سیّدوں کی آبادی کا آخری نقطۂ انحطاط سنہ ۱۹۴۷عیسوی کو سمجھنا چاہیے جب کہ جارچہ تقریباً اجڑ گیا۔ قصبہ دوبارہ بس گیا ہر کچھ سیّد بھی رہتے ہیں، مگر سادات کا وہ معروف جارچہ ہمیشہ کے لیے مرحوم ہوا۔ تاریخ اپنے کو دہرایا نہیں کرتی۔

انسانی حافظہ تین پشت تک مدد کرتا ہے۔ اس سے آگے کی یادیں محفوظ نہیں رکھ پاتا۔ انفرادی طور سے ایسے روشن اور چوکس دماغ کے لوگ شاذ و نادر ہوتے ہیں جو کئی پشتوں کے بزرگوں کو پہچانتے ہیں، ان کو بھولتے نہیں اور ان کے حالات سے باخبر رہتے ہیں "تذکرۃ الانساب سادات جارچہ" میں صورتحال

برعکس ہے۔ حضرت آدمؑ ابوالبشر سے شجرہ چلتا ہے۔ مدّتوں بعد حضرت نوحؑ آ جاتے ہیں۔ دنیا غارت ہو جاتی ہے۔ سفینۂ نوح کے باقی ماندہ اصحاب کی برکت اور محنت سے دوبارہ آباد ہو جاتی ہے۔ ایسی بے پناہ ہڑبونگ اور ہجوم میں ہم اُن بزرگانِ جارچہ کو کہاں ڈھونڈیں جو ابھی دو تین نسل پہلے تک مانوس و معروف تھے یعنی جن کو زمانہ رخصت کر چکا پھر بھی ہمارے دل سے نہیں گئے ہیں۔ مسعود الحسن کا مرتّب کیا ہوا شجرہ غور سے ملاحظہ فرمائیے تو واضح ہوگا کہ وہ نہایت انضباط و احتیاط کے ساتھ دائرہ دل کے اندر سید لعل، سید پھول، سید راجو، سید گھاسی، سید جھبوا، سید جھنڈو علی سید پہلوان علی، سید چاند علی، اور سید خیر علی کو بٹھاتے چلے گئے ہیں۔ ان دائرہ دل کو دیر تک دیکھ کر دماغ میں تارے سے چمکنے لگتے ہیں۔ بیشک وہ سب ہمارے اجداد و اسلاف تھے، ہم ان کے اخلاف، ان کی یادگار، اور ان کا نام باقی رکھنے والے ہیں خدا ان بزرگوں کو غریقِ رحمت فرمائے اور جنّت کے انعام سے نوازے، مگر ملحوظ خاطر رہے کہ وہ ہماری یادوں کا حصّہ نہیں رہ گئے ہیں۔ ماہ و سال کی گردشوں نے ان کو ہم سے دور پہنچا دیا ہے۔ فی الحال جن کی یادیں ابھی تک ذہنوں میں تازہ ہیں اور جن کے نام کی گونج ندائے کوہ کی طرح کانوں میں ہنوز ہلکی سی آ جاتی ہے، وہ وہی گزشتہ دو تین پشتوں کے بزرگ ہیں۔ مستقبل کی نسلوں کے لیے ان کا احوال کیا بھی اختصار کے ساتھ سہی، یقیناً آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن جائے گا۔ عزیزانِ جارچہ کو مختصراً تین خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے: وہ جنھوں نے مستقل طور سے وطن چھوڑا اور باہر سکونت اختیار کر لی۔ وہ جو روزگار کے سلسلے میں باہر رہتے تھے اور عمر کے آخری دور میں واپس چلے آتے تھے، جیسا پرندوں کا قاعدہ ہے کہ شام ہوئی اور آشیانہ یاد آیا، تیسرے ایسے لوگ تھے اور ابھی تک ہیں جو وطن میں کھیتی کیاری کے ذریعے گزر اوقات کرتے تھے اور کہیں نہ جاتے تھے۔ وہ وہیں بیگھے بسوے کے حساب میں دل و جان اور بقدر ضرورت ایمان لگائے رہتے تھے۔ آئندہ باب میں تبرکاً معدودے چند کے ذکر خیر پر اکتفا کرنا ہے۔ جسکو محاورے کی

زبان میں مشتے نمونہ کہتے ہیں ۔ پھر بھی داستان کافی لمبی پھیلے گی :

شبے باید دراز و ماہتابے

تاریخ اپنا مطالعہ عظیم ہستیوں کی ذات تک محدود رکھتی ہے. مگر بڑی شخصیتوں کے واقعات عام خلقِ خدا کے اطوار و ہنجار کا آئینہ نہیں دکھاتے ۔ وہ معمولی لوگ ہیں جنھیں ہم یاد کریں تو جماعت کی زندہ اور چلتی پھرتی تصویریں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں. ہمیں اپنے مانوس حلیے اور اپنی سی شکلیں جہاں بھی نظر آئیں زیادہ اچھی لگتی ہیں. مثال کے طور پر عربی قواعد کی گردان میں زید عمر و بکر کی مارپیٹ کو لے لیجیے. جن بزرگوں کا ذکرِ خیر آگے مقصود ہے وہ کسی بھی دور میں اور کہیں بھی ہوتے یاد رکھنے کے قابل اور دلچسپ لوگ تھے ۔ دوسرے یہ کہ نیکیوں اور خوبیوں سے بھی خالی نہ تھے. آدمی کا دلچسپ اور ساتھ ہی نیک ہونا واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی فائدے اور برکت کی بات ہے.

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

# پانچواں باب

# عزیزانِ جارچہ

## قاری جعفر علی

قاری جعفر علی کی شخصیت ساداتِ سبزوار کی نسل میں سب سے زیادہ برگزیدہ اور نمودار ہے. شہرت وعزت کے اعتبار سے اوّلیت کا شرف ان ہی کو حاصل ہے وہ ایک جیّد عالم دین، علوم متداولہ کے فاضل اور علم تجوید وقرائت کے ماہر تھے. سارا ہندوستان قاری کی حیثیت سے ان کو جانتا تھا بلکہ ہندوستان سے باہر بھی دنیا ان کے کمال سے واقف تھی. جارچہ ان کی بدولت مردم خیز سرزمین کہلانے لگا جعفر علی کی طالب علمی کا زمانہ لکھنؤ میں بسر ہوا۔ یہ آصف الدولہ کا عہد تھا جب کہ دہلی اجڑ چکی تھی اور لکھنؤ ایک تہذیبی مرکز بنتا جا رہا تھا. غفرانمآب کے بیٹے سلطان العلما سید محمد کے حلقۂ درس میں جعفر علی کے تعلیمی مرحلے مکمل ہوئے غفرانمآب

کا نام تاریخ میں اس اعتبار سے اہم ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے شیعہ عقاید کی باقاعدہ اور علانیہ ترویج کی۔ ان کے دم سے شیعوں کو ایک آزاد معاشرتی اکائی کا درجہ حاصل ہوا، اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے ان کے جداگانہ وجود کو ایک تلخ مگر ناگزیر حقیقت سمجھ کر صبر کر لیا۔ شمالی ہندوستان میں پہلی دفعہ شیعوں کی علیحدہ نماز جماعت، لکھنؤ میں بروز جمعہ ۲۷ رجب ۱۲۰۰/ ۱۷۸۶ء، غفرانمآب کی امامت میں ادا ہوئی۔ وہ ہندوستانی شیعوں کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا۔ ویسے جب ایران میں صفوی حکومت کا قیام عمل میں آیا اور وہاں، ۹۰۸/ ۱۵۰۲ء، مسجدوں میں آئمۂ اثنا عشر کا خطبہ پڑھا گیا، اس کے صرف دو سال بعد، ۹۱۰/ ۱۵۰۴ء، بیجاپور دکن کے فرمانروا، یوسف عادل شاہ نے اپنی قلمرو میں نماز جمعہ کا خطبہ تبدیل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ شیعہ اصولِ فقہ کے مطابق بارہ اماموں کے نام خطبے میں داخل اور صحابہ، یعنی خلفائے ثلاثہ کے نام خطبہ سے خارج کر دیے گئے۔ البتہ شمالی ہندوستان کے شیعوں کو یہ سعادت سیکڑوں برس بعد غفرانمآب کے ذریعے نصیب ہوئی۔ سید محمد سلطان العلماؔ اپنے پدرِ بزرگوار کی طرح ایک بلند پایہ عالم تھے۔ ویسا ہی وقار و اعتبار ان کے شاگردوں کے حصّے میں آیا۔ خصوصاً جعفر علی نے فنِ قرآت میں بڑا نام پیدا کیا۔ وہ ابتدائی عمر میں جب نوجوان طالبِ علم تھے اس فن کو اچھی طرح سیکھ چکے تھے۔ اتفاقاً لکھنؤ میں بعہدِ آصف الدولہ ایک ایرانی بزرگ مرزا محمد علی تبریزی اصفہانی نام کے آکر رہنے لگے جن کو تجوید و قرأت میں عبور حاصل تھا۔ جعفر علی نے ان کی شاگردی اختیار کی اور شوق کے ساتھ کسبِ فیض کیا یہاں تک کہ خود عملاً کاملِ فن کی حیثیت سے معروف ہو گئے۔

مسلمانوں کے تعلیمی نصاب میں تجوید ایک آزاد شعبہ رہا ہے۔ علمی اور عملی دونوں اعتبار سے اس کی اہمیت مسلّم الثبوت ہے۔ علمی سطح پر تجوید کا رشتہ علم الاصوات اور لسانیات سے ملتا ہے۔ دوسری طرف عملی صورت یہ ہے کہ تجوید کے میدان میں تھوڑی سی مہارت کے لیے بھی مدّتوں کا ریاض اور مسلسل

مشق و مداولت چاہیے۔ صدرِ اسلام میں سارے صحابائے کرام حافظ اور قاری تھے اسلام سرزمینِ حجاز سے باہر نکل کر اقصائے عالم میں پھیلا تو فطری طور سے قرآن مجید کی قرأت کے لہجے بدلے اور آوازوں کا نمایاں فرق ظہور میں آیا۔ علمائے لسانیات کی تحقیق کے مطابق آدمی کے حلق میں نیچے کی طرف دو عدد آواز کی رِباطین واقع ہیں ان کی ساخت کمانیوں سے مشابہ ہوتی ہے یعنی لچکتی ہیں۔ یہ رِباطین آدمی کا لہجہ مشخّص اور متعیّن کرنے کی ذمّہ دار ہیں۔ جغرافیائی ماحول کا تھوڑا سا فاصلہ اور آب و ہوا کے اثرات رباطوں کی ساخت بدل دیتے ہیں۔ اس فرق کی بنا پر مختلف مقامات کے لوگوں کا لہجہ پہچانا جاتا ہے۔ غرض کہ اسلام کرۂ ارض کے حدود و ثغور عبور کرتا گیا۔ زمانہ بدلتا گیا اور رفتہ رفتہ قرآن مجید کی تلاوت کے سات معیاری لہجے قرار پائے۔ قاری کا لازمی کمال یہ سمجھا گیا کہ اس کو ساتوں متداول لہجوں پر حاوی ہونا چاہیے۔ مسلمانوں میں دو ہستیاں ایسی گزری ہیں جن کو علمِ تجوید کا منتہی اور امام تصوّر کیا جاتا ہے۔ ایک امام ابوالقاسم شاطبی، ۵۹۰/۱۱۹۴، جن کا وطن اندلس تھا اور دوسرے شیخ محمد ابن الجزری، ۸۳۳/۱۴۲۹، جن کی کتاب "حصن حصین" صوفیوں کے حلقے میں نہایت مقبول رہتی آئی ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کے آخری دور تک تجوید سے متعلق مسلسل کتابیں لکھی جاتی رہیں اور اس علم سے شغف برابر قائم رہا۔ ہمارے معاشرے میں جب تک پرانی قدریں باقی تھیں تجوید کے دقائق کا جاننا ملزوماتِ تہذیب میں شامل تھا۔ سورۂ مزّمل میں حکم ہے کہ قرآن ترتیل سے پڑھا کرو۔ اہلِ لغت جانتے ہیں کہ ترتیل کے معنی خالص موسیقی تو نہیں، البتہ ایسا لحن مطلوب ہے جو موسیقی کے تمام تقاضوں کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن پڑھنے کے لیے غیر معمولی تربیت اور تہذیب ضروری ہے۔

جعفر علی لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی چلے آئے۔ دارالسلطنت میں اعتمادالدولہ کا مدرسہ ایک معتمد ادارہ اور ہندوستان کی معروف درس گاہ تھا۔ وہ استاد کی حیثیت سے وہاں مامور ہوگئے۔ عربی زبان و ادب کا نصاب

پڑھانے کو ملا، اور فقہ جعفری (شیعہ دینیات) کے درس بھی ان ہی کے سپرد کردیے گئے۔ نگران کے شوق و ریاضت کا خاص موضوع فن تجوید تھا، اور عملاً قرأت کے میدان میں ان کو تخصیص حاصل تھی۔ اس فن کا حق ادا کرنے کے لیے کردار کی پاکیزگی لازمی شرط اور نفس کی طہارت اوّلین تقاضا ہے۔ فطری طور سے دہلی کے عوام و خواص قاری جعفری علی کا نہایت احترام کرتے تھے۔ انکی ذات شائقینِ تجوید کے لیے استفادہ اور برکت کا مرکز تھی اور ان کے شاگردوں کی ردیف میں شیعہ نوجوانوں کے علاوہ سنّی بھی نمایاں تعداد میں شامل تھے۔ غدر سے پہلے تک: دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب، وہ غارت گردں کی مسلسل یورش کے بعد بھی حرارت و حرکت کے آثار سے بالکل خالی نہ ہوا تھا۔ میر تقی میرؔ کا درپردہ اور بلیغ اشارہ درست سہی: یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا۔ پھر بھی وہاں طرح طرح کے ہنگامے جاری رہتے تھے۔ ایک طرف تمدّن زوال کی زد میں آچکا تھا اور لوگ ایسی مخرّبِ اخلاق عادتوں میں گرفتار تھے جو پورے معاشرے کو تیزی سے تباہی کی طرف لیے جارہی تھیں۔ سالارِ جنگ کا مرقعۂ دہلی پڑھ کر سنجیدگی منہ پھیر لیتی ہے۔ دوسری طرف وہ برگزیدہ ہستیاں شہر کی زینت تھیں جن کو دیکھ کر انسانی شرافت پر یقین تازہ ہوجاتا تھا آخری دور کی دلّی میں خواجہ میر دردؔ جیسے افراد بھی نظر آتے ہیں جن کی ذات سے بےشمار مایوس و مجروح قلب تسکین حاصل کرتے تھے۔ قاری جعفر علی کا حساب بھی اسی زمرۂ خاص کے بزرگوں میں ہوتا ہے جن کے دم سے اخلاق صالح کا نصب العین زندہ تھا اور اسلامی شریعت کی قدریں روشن تھیں۔

معاشرے کی اخلاقی پستی اور ذہنی انتشار کے ساتھ مذہبی رواداری کا فقدان اور فراخدلی کا خاتمہ ناگزیر عمل تھا۔ غدر سے پہلے کی دلّی میں سنّی شیعہ اختلافات کا طوفان بھی زوروں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مغل سلطنت کے زوال کی داستان طبقۂ امرار کی گروہ بندی سے شروع ہوتی ہے۔ امرار کے دو گروہ ایرانی اور تورانی کہلانے لگے۔ جو سلطنت کے اعلیٰ مقاصد د مفادات کو بھول کر ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑ گئے۔

یہ رقابت آگے چل کر خالص اور کھلم کھلا سنّی شیعہ مناقشات میں ڈھل جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی شیعہ فرقے کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔ میرزا سودا شاہ صاحب کی مفصّل ہجو لکھ کر حساب برابر کر دیتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کی "تحفۂ اثنا عشریہ" سے سنّی بیحد خوش ہیں۔ سب کہتے ہیں کتاب کیا ہے بارودی توپ ہے، شیعہ عقاید کو اڑا کر رکھ دیا۔ دیکھتے جاییے کوئی رافضی نظر نہ آئے گا، پھر تقیّہ کر کے غائب ہو جائیں گے مولانا کامل دہلوی این جواب آن غزل کے عنوان پر "نزھۂ اثنا عشریہ" لکھتے ہیں اور بعض صحابہ کی خبر لیتے ہیں۔ مآخذوں کے استناد سے ان کو خدا و رسولؐ کے احکام کی صریحًا خلاف ورزی کا مرتکب اور روگردانی میں ملوّث دکھاتے ہیں۔ بالآخر بنی اُمیّہ کی حکومت کے قیام کی ذمہ داری ان کے دانستہ اقدامات پر عاید کرتے ہیں۔ مولانا کامل کی پراسرار طریقے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ شیعہ ان کو شہید رابع کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف کتابوں اور رسالوں کی بھر مار میں لگے ہیں۔ سید احمد شہید کا دبیر خاص اور معرکۂ بالاکوٹ کا شاہد عینی جس نے بعد میں تاریخ لکھی، ایک جگہ کہتا ہے، "میرے پاس تقاضوں کے خطوط آ رہے تھے کہ روافض کے خلاف رسالے بہت تیار ہو گئے ہیں، جلدی آؤ اور ان کو چھاپنے کے کام میں لگ جاؤ، میں جہاد کے شوق میں دوسری طرف چل دیا۔" غفرانمآب اور سیّد احمد شہید دونوں ایک جگہ، یعنی نصیر آباد۔ جائس ضلع رائے بریلی اودھ میں پیدا ہوئے اور ایک ہی جدّ اعلیٰ کی اولاد تھے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سیّد احمد تعزیہ داری کے شدید مخالف تھے۔ میرزا مظہر جانجاناں پر محرّم کے زمانے میں قاتلانہ حملہ ہوتا ہے جس سے وہ جانبر نہیں ہو پاتے۔ وہ نقشبندی طریقے کے صوفی تھے جن کے مسلک میں عزاداری اور تعزیہ و علم کے جلوس کفر و بدعت کے مترادفات ہیں۔ دوسری طرف میرزا تولّائے علی کے بھی قائل تھے۔ اس بات پر انتہا پسند سنّیوں کی بھنویں اونچی ہو جاتی تھیں۔ مولانا محمد حسین آزاد صاحب آبحیات شاہد ہیں کہ میرزا مظہر جانجاناں کے سانحے پر دہلی میں کئی دن ہنگامہ برپا رہا۔ سنّی کہتے تھے کہ شیعہ مار گیا۔ شیعوں کا خیال تھا ضرور کسی سنّی نے مارا ہے۔ میرزا نے دمِ آخر ایک پاک باطن صوفی

کے کردار کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے بسترِ مرگ سے دہلی کے حاکم اعلیٰ میرزا نجف خان کے پاس پیغام بھجوایا کہ میں نے اپنے قاتل کو معاف کیا۔ میرے خون کا قصاص کسی سے نہ لیا جائے۔ اور کسی کو بازپرس کے لیے پکڑا نہ جائے۔ یہ میری آخری وصیت ہے۔ میرزا کا شعر تھا:

نہ کرد مظہر ما طاعتے و رفت بخاک    نجاتِ خود بہ تولائے بوتراب گزاشت

فریقین کی ختم نہ ہونے والی بحث و تکرار سے میرزا نجف خان کی جان آفت میں مبتلا تھی، وہ خوشامدیں کرتا تھا کہ سلطنت ہاتھ سے جا رہی ہے، آپ لوگوں کو اختلافات یاد آئے ہیں اور کبھی دھمکاتا تھا کہ جھگڑے ختم نہ کئے تو سب کو دہلی سے نکال دوں گا اس ہنگامہ و پیکار اور بقول شیخ سعدی: "رشیم بگرفت زنخاز انش تسکتم" کے گئے گذرے ماحول میں قاری جعفر علی کا کردار آئینے کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ احتیاط سے کام لیا اور حیاداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ پورے خلوص اور دردمندی کے ساتھ افتراق بین الملّت کو ایک تکلیف دہ صورتِ حال سے تعبیر کرتے تھے۔ مولانا کے گھر میں سُنّی شاگردوں کا مجمع ان کی صلح پسندی اور رنیک نفسی کا ثبوت تھا جو علی الصبح ان کے گھر پہنچ جاتے تھے، اور حلقے میں بیٹھ کر دیر تک ان کے سامنے قرآت کی مشق کرتے تھے۔ مولانا کو احساس تھا کہ ان کی وسیع القلبی اور رواداری ایک مہنگا سودا بن سکتی ہے، پھر بھی وہ اپنی اختیار کردہ روش سے نہ ہٹے۔ دنیا ایسے اہلِ ہمّت سے کبھی خالی نہیں رہی جو وقت کی ہوا کے خلاف اپنی کشتی کا بادبان موڑ دینے میں تکلّف نہیں کرتے۔ صورتِ حال یہ ہوئی کہ خود مولانا کے ہم مذہب ان پر اعتراض کرنے لگے۔ ان کی اعتدال پسندی اور سلامت روی بعض شیعہ معاصرین کی سمجھ میں نہ آئی، پھر کیا تھا علانیہ طنز و تضحیک کے وار ہونے لگے۔ حریفوں نے جی بھر کے مذاق اڑایا اور یہ قضیہ بہت دن تک چلتا رہا۔ آغا محمد باقر دہلی کے نہایت فاضل، مقتدر اور صاحبِ حیثیت بزرگ تھے۔ محمد حسین آزاد ان کے ہی فرزند ہیں۔ اتفاق ہے کہ شہرت بیٹے کے حصے میں آئی۔ علم و کمال اور دینی کردار کے اعتبار سے باپ کا مقام کہیں زیادہ بلند تھا۔ شیعہ علما کا تذکرہ "درِّ بے بہا"

تالیف محمد حسین، بیسویں صدی کے بالکل اوائل میں تکمیل کو پہنچا۔ غدر کی نسل کو دنیا سے سدھارے پچاس برس بھی نہ ہوئے تھے۔ "دربے بہا" کے مؤلف نے آغا محمد باقر اور قاری جعفر علی کی خچپک کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دونوں کے برجستہ اور لطیف فقرے سامعین کے لیے ذہنی تفریح کا موضوع بن جاتے تھے۔ لطفِ بیان کا خاص اور انوکھا پہلو یہ تھا کہ عالمانہ وقار میں کسی طرف سے فرق نہ آتا تھا۔ پھر بھی برسرِ منبر دلچسپ اشارات اور ملیح کنایات کا سلسلہ ایک دوسرے کے خلاف چلتا رہتا تھا۔ ان بزرگوں کی باہمی رقابت نے دلّی کے شیعوں کو دو گروہوں میں، یا جدید اصطلاح میں کہا جائے، دو خیموں میں بانٹ دیا تھا۔ جو لکھنؤ کے انیسیوں اور دبیریوں کی طرح باقریہ اور جعفریہ کہلاتے تھے۔ آغا محمد باقر عالم باعمل، خطیب، اور ذاکر اہلبیت تو تھے ہی، مزید خوبی یہ کہ مجالسِ عزا اپنے ذاتی مصارف سے کرتے تھے۔ ان کا تبرک پورے شہر میں مشہور تھا اور بریانی کا طباق شاہانِ اودھ کی فیاضی سے ٹکر لیتا تھا۔ انسانی روابط میں نہایت مخلص اور باغ و بہار شخصیت کے انسان تھے۔ قاری جعفر علی بھی تقویٰ و پرہیزگاری کے باوجود حاضر جوابی اور مزاج کی شگفتگی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ آغا محمد باقر "دہلی اخبار" نام کا ایک ہفتگی جریدہ بھی نکالتے تھے جو اردو صحافت کی تاریخ کے نقوشِ اول میں شمار ہوتا ہے۔ یہ خبر سب سے پہلے ان ہی کے اخبار میں چھپی تھی کہ غالب جوا کھیلتا پکڑا گیا، کوتوال شہر بہت شریف آدمی ہے، جواریوں کا صفایا کرنے میں لگا ہوا ہے، رشوت کے پاس نہیں جاتا۔ البتہ اس خبر کے سلسلے میں دو نکتے ملحوظِ خاطر رہنے چاہئیں۔ اول تو مولانا محمد باقر کی استاد ذوقؔ کے ساتھ دوستی بہت تھی۔ دوسرے وہ شمالی ہند کے ابتدائی اخبار نویس تھے۔ محفل میں گرمی پیدا کرنا صحافیوں کا فن ہوتا ہے اور ان کے ضابطہ اخلاق میں مبالغے کی بے احتیاطی جائز ہے۔ صحافت کا ضروری تقاضا یہ ہے کہ جس کی ٹوپی پر ہاتھ پڑ جائے اچھالنے میں دیر نہ کیجیے۔ افراد سے واسطہ اور سروکار رکھنا کافی نہیں، نزدیک و دور کی حریف حکومتوں کو بھی ترچھی نظر سے دیکھتے رہیے۔ صحافیوں کا مشہور مقولہ ہے کہ جھگڑے آسمان سے نازل نہیں ہوتے زمین پر پیدا کیے جاتے ہیں۔ کوئی جھگڑا نہ ہو

تب بھی کہیں ڈھونڈ کر لانا چاہیے۔ جدید یورپ کی بعض لڑائیاں محض صحافت پیشہ حضرات کے قلم کی کارگزاری اور ان کی استادی کا نتیجہ ہیں۔ غرضکہ "دہلی اخبار" کی خبروں میں اکثر و بیشتر زبردست گرمیٔ محفل کا سامان ہوتا تھا۔ غدر میں آغا محمد باقر نے شہادت پائی۔ قاری جعفر علی انگریز کی قید میں رہے لیکن کسی طرح جان سلامت لے کر نکل آئے۔ ایسی جامع کمالات ہستیاں پھر پیدا نہ ہوئیں۔ مغلوں کی دلّی مٹنے سے پہلے آخر دم تک اپنے باکمالوں کا تماشا دنیا کی چشم حیرت کے سامنے اس انداز سے پیش کرتی رہی جیسے کوئی ماہر تیر انداز یہ سوچ کر چابکدستی دکھائے کہ ترکش خالی کرنا ہے۔

غالبؔ کے مجموعۂ خطوط میں میر مہدی کے نام ایک مکتوب ہے، جمعہ ۶ اپریل سنہ ۱۸۶۰ء کو بھیجا گیا ہے۔ میرزا لکھتے ہیں کہ میں رامپور سے چل دیا اگرچہ نواب صاحب کا روکنے پر اصرار تھا۔ رمضان کی چاندرات کو دہلی آ پہنچا۔ یک شنبہ کو غرّۂ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جاکر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ آج کل کے غالبؔ شناس اس مضمون کو محض خیالی عبارت آرائی قرار دیتے ہیں۔ دلیل براہ راست یہ کہ غالبؔ کو روزہ نماز سے کیا مطلب، جدید زمانے کے نقاد ایک بات بھول جاتے ہیں۔ احکام و فرائض کے معاملہ میں غالبؔ ڈھیلے آدمی سہی، واجبات کی ادائیگی میں یقیناً پابندی کم اور غفلت زیادہ تھی۔ لیکن یہ تصوّر کرنا سراسر غلط ہوگا کہ وہ علم تجوید کی تاریخی، جمالیاتی اور تھوڑی بہت فنّی حیثیت سے واقف نہ تھے۔ غدر کے بعد جہاں مسلمانوں کے دامن میں جدید علوم آئے وہاں قدیم علوم کی متاع سے جیب خالی بھی ہوئی۔ فائدہ نقصان کی میزان کچھ بھی رہی ہو تغیّر فطرت کا قانون ہے سیّد احمد خان کے بہت سے سنجیدہ معاصرین کا خدشہ بالکل بے بنیاد نہ تھا کہ ان کا نیچری زور شور اور ان کا کالج ہمیں نقصان پہنچائے گا۔ ہماری علمی روایات رخصت ہو جائیں گی۔ اکبرؔ الہ آبادی کی طنزیہ شکایت کو منطق اور مفہوم سے خالی نہ سمجھنا چاہیے۔ کالج سے امام ابو حنیفہ نکلے۔ غدر سے قبل کی نسلوں کے ذہن میں ماضی کے اسلامی علوم کا پس منظر زیادہ روشن تھا جس سے بعد کی نسلیں محروم ہوگئیں۔ تجوید و قرأت کی تاثیر سحرِ حلال بلکہ اس سے بھی

زیادہ اعلیٰ درجے کی چیز ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد اس نکتے کو ہم سے زیادہ اچھی طرح سمجھتے تھے ان کا سابقہ عربی زبان کی مبادیات سے لازمی رہتا تھا۔ قرآنی آیات کی شانِ نزول اور معانی و مواقف تک رسائی کے معاملہ میں جو ذہنی نزدیکی ان کو حاصل تھی وہ ہم نہیں رکھتے محمود غزنوی سترہ لڑائیوں میں نہ گھبرایا اور ایک دفعہ قرآن کی ایک آیت کا خفیف سا تادیبی اور تعزیری اشارہ سن کر بیہوش ہوگیا۔ زمانہ جیسے جیسے گزرتا گیا۔ مسلمان نص قرآن کی تفہیم سے دور ہوتے چلے گئے۔ غالبؔ کے سلسلے میں بہرحال اس قدر اعتراف تو سب کو ہے کہ وہ ایک باکمال آدمی تھے اور پرانے وقتوں کے کمالات کا بھرپور شعور رکھتے تھے۔ ایسے رندِ ہزار شیوہ سے کچھ بعید نہیں کہ رمضان کے مہینے میں قاری جعفر علی کی قرأت سننے کے لیے عمداً نہ سہی اتفاقاً کبھی کبھی جا نکلتے ہوں۔

قاری جعفری علی کے ایام اسیری کا ایک واقعہ اہلِ وطن میں نہایت معروف تھا۔ وہ نماز کی نیت سے اللہ اکبر کہتے تھے تو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں جسم سے علیحدہ ہوجاتی تھیں نماز ختم کرنے کے بعد اس زیور کو جو غیرت مندی و جانفروشی کی علامت اور جذبۂ ایمان و آزادی کی آزمائش تھا، خود ہی پہن لیتے تھے۔ ایسے قصّے آگے کی نسلیں مشکل سے یاد رکریں گی۔ وقت کے ناگزیر عمل کا دوسرا نام سیف قاطع ہے اور عقیدت مندی کا رشتہ بھی اس کی زد سے محفوظ و مستثنیٰ نہیں ہے۔ البتہ اس سلسلے میں معتزلہ کی طرف نظر جاتی ہے۔ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں اصحاب علم کا ایک گروہ معتزلہ کے نام سے مشہور تھا وہ معجزے کے قائل نہ تھے، کرامات اولیا تو دور کی بات ہے، بلکہ ماورائے فطرت مظاہر کو خالص تعقّل کے ذریعہ سمجھنے پر زور دیتے تھے۔ انبیائے ماسلف کے معجزات کی بابت ان کا استدلالی انداز خاصا جامع اور دلچسپ ہوتا تھا۔ معتزلی مذکورہ واقعے کو معجزۂ داؤدی کی ردیف میں رکھے گا، یعنی فولاد نرم ہوگیا، اور کہے گا کہ وہ شخص جس نے زندگی بھر خلوص و طہارت کے ساتھ ذہن و زبان کو قرآن کی آیات میں منہمک رکھا اس کے لیے یہ کونسی عجیب بات ہوئی۔ آخر کلام الٰہی کی توقیر و تاثیر اور اسم الٰہی کی عظمت کا سوال ہے۔ قاری جعفر علی نے سنہ ۱۳۱۴/۱۸۹۶ میں وفات پائی اور جارچے کی خاک کا پیوند ہوگئے

# عبّاس حسین

مولانا عباس حسین کی ذات میں ان کے والد گرامی قاری جعفر علی کی ساری صفات موجود تھیں۔ وہ صحیح معنوں میں خلف الصدق تھے۔ غدر کے بعد شمالی ہندوستان میں مسلمان اہل کمال کے لیے رامپور، ٹونک، بھوپال اور بھاولپور جیسے ٹھکانے زیادہ باقی نہ بچے تھے۔ البتہ بندھیاچل سے نیچے دکن میں وسائل کے اعتبار سے حیدرآباد بہت بڑی ریاست تھی۔ اور وہاں اکثر و بیشتر ہنرمند افراد کو پناہ مل جاتی تھی۔ مولانا عباس حسین کی زندگی میں وہ مرحلہ آیا جب معاش کی فکر آدمی کو گھر کے محفوظ ماحول سے باہر نکال کر جدّوجہد کے راستے پر لگاتی ہے تو اس وقت حیدرآباد میں سالار جنگ میر تراب علی کا زمانہ تھا۔ عباس حسین مشہور باپ کے بیٹے تھے۔ ان کو حیدرآباد میں مفتیِ ریاست کا عہدہ تفویض ہوا۔ مشاہرہ پانچسو روپیہ ماہوار تھا۔ مولانا کا عقیدہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ انھوں نے اپنی عدالت میں فقہ شافعی کی رو سے مقدمات فیصل کرنے کی شرط پیش کی۔ فرمانروائے ریاست نے اس پر منظوری کا اظہار فرمایا اور تقرر کی توثیق کر دی۔ حیدرآباد کی ملازمت روشن مستقبل کی ضمانت تھی اور فقہ و قانون کے پیشے سے جو اعزاز و اکرام کا روایتی تصوّر وابستہ ہے، وہ بھی قطعی طور سے حاصل تھا۔ مگر عباس حسین کے لیے کاتبِ تقدیر کچھ اور ہی لکھ چکا تھا۔ حیدرآباد کے لیل و نہار خوب سازگار تھے۔ جاہ و مقام اور آسائش و آرام میں کسی طرح کی کمی نہ تھی۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب دنیا نگاہِ شوق سے حیدرآباد کی طرف دیکھتی تھی۔ حالات کا تقاضا دیکھ کر شمالی ہند کی اکثر صاحبِ لیاقت ہستیاں وہاں پہنچ رہی تھیں اور واقعی ریاست کو ان کی خدمات کی ضرورت بھی تھی۔ مولانا عباس حسین کی ذات سب سے انوکھی اور الگ تھی کہ انھوں نے سرزمین دکن میں مستقل اقامت کے بجائے شمالی ہند کی طرف مراجعت کو ترجیح دی، اور علی گڑھ پہنچ کر سید احمد خان کے قافلے میں شامل ہو جانے کو خیر العمل سمجھا۔ جب حیدرآباد کے مخلص احباب کو ان کی نیت کا علم ہوا تو سب نے کہا کہ اعلیٰ مشاہرہ ہاتھ سے دے کر قلیل بضاعت پر جا پڑنا ہرگز مناسب نہ ہوگا۔ وہ بھی ایسا وسیلۂ معاش جس کا

دارو مدار فی الحال چندے پر ہے، یعنی کبھی مل گیا اور کبھی کوشش کے باوجود ہاتھ خالی رہ گئے۔ کچھ دوستوں نے بے تکلفی سے کام لے کر سپاٹ لفظوں میں منع کیا کہ مولانا، علی گڑھ میں کیا رکھا ہے وہاں لڑکے پڑھائیے گا، یہاں آپ ریاست کے مفتی ہیں، ذرا غور تو فرمائیے۔ عباس حسین کی نظر میں سود و زیاں کے پیمانے دوسرے تھے۔ ان کی طبیعت کا پوشیدہ تقاضا تھا اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا کچھ بیجا نہ تھا، کہ وہیں چل کر رہیے جہاں تاریخ کے فیصلہ کن ہنگامے ہمیشہ ہوتے آئے ہیں، اور جس سرزمین پر نہایت دلچسپ ڈرامہ حال میں شروع ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے اور تاریخ کے دفتر میں مثالوں کی کمی نہیں کہ آدمی کا باغی کے گھر میں پیدا ہونا کوئی اچھا شگون نہیں ہوتا۔ وہ زندگی بھر ماجرا طلب بن کر رہنا پسند کرتا ہے۔ عباس حسین کے خون میں یہ احساس گردش کرتا تھا کہ میرے باپ نے قیدِ فرنگ جھیلی ہے۔ فطری طور سے ان کے لیے دنیا کی فراغت و عافیت بے معنی چیزیں تھیں۔ شعور کا اضطراب ایسے لوگوں کو ضرور خطر پسندی کی طرف لے جاتا ہے۔ احباب کا اصرار مولانا کے پائے استقامت کو جنبش نہ دے سکا۔ ان کی طرف سے یہ دلیل دی گئی جسے سن کر دوست خاموش ہو گئے، کہ میری عدالت میں بعض اوقات ایسے مقدمات پیش ہوتے ہیں جن کے فیصلے سنا کر ضمیر مطمئن نہیں ہوتا۔ میرے لیے تعلیم و تدریس کا مشغلہ زیادہ موزوں رہے گا۔ مجھے ایمان سلامت لے کر جانا ہے، عہدہ اور مشاہرہ کیا کروں گا۔

مولانا عباس حسین اور سرسید کی پہلی ملاقات حیدرآباد میں ہوئی (سنہ ۱۸۸۲ عیسوی) جب سرسید نے حیدرآباد کا پہلا سفر کیا تھا۔ غدر سے پہلے دلی میں رہنے والے سارے اشراف و اکابر کو سرسیّد اچھی طرح جانتے تھے اور قاری جعفر علی سے ان کی ذاتی ملاقات تھی۔ مولانا کی خاندانی روایات کے مطابق، جیسا کہ راقم السطور کو ان کے پوتے حسین احمد صاحب مدظلہٗ نے بتایا، سرسید عباس حسین سے ملے اور کہا کہ مفتی صاحب میں حیدرآباد میں بذاتِ خود سُنّی عمائدین کے دروازے پر فقیرانہ صدا لگاتا پھرا۔ آپ کی مساعی شامل ہوں تو شیعہ حضرات سے چندے کی زیادہ مناسب رقم مل سکے گی۔

مولانا نے جواب دیا، آپ پہلے سے میرے پاس تشریف لاتے تو میں سُنّی اور شیعہ دونوں سے حسبِ دلخواہ رقم دلواتا۔ آپ نے خواہ مخواہ سُنّی شیعہ کا تکلّف برتا۔ بالآخر میں پوری ریاست کا مفتی ہوں۔ سرسیّد کو یہ بات بہت پسند آئی۔ انھوں نے مولانا سے علی گڑھ آکر تدریس کا منصب سنبھالنے اور اپنے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی۔ مولانا نے وعدہ کرلیا اور سنہ ۱۸۸۲ عیسوی کے اختتام سے قبل علی گڑھ آکر مدرستہ العلوم سے وابستہ ہو گئے۔ حالیؔ "حیاتِ جاوید" میں لکھتے ہیں کہ سرسیّد کو اپنی صداقت کی بدولت ایسے اعوان و انصار ملے جو نادرالوجود اور عجائب روزگار لوگ تھے۔ حالیؔ کی عبارت میں زیر زبر کی ترمیم کیے بغیر یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ اس جماعت میں عباس حسین بھی تھے۔

علی گڑھ میں عباس حسین اور شبلیؔ کے ورود کا سال ایک ہی ہے۔ دونوں بزرگ ۱۸۸۲ عیسوی میں تشریف لائے۔ عباس حسین نے آخری دم تک وفاداری بشرط استواری کا اصول ملحوظ رکھا۔ وہ ہمیشہ سرسیّد کے وفادار اور اُن کے اقدامات کی تائید و حمایت میں سرگرم رہے۔ نہ کبھی کسی بات پر اعتراض کیا اور نہ ایک دن کے لیے دل برداشتہ ہو کر کالج چھوڑا۔ شیخ عبداللہ بانی زنانہ کالج، یعنی علی گڑھ کی طالبات کے پاپا میاں، مولانا عباس حسین کو اپنے استادوں میں شمار کرتے ہیں اور شبلیؔ سے ان کے مزاح المومنین کا ایک واقعہ لکھتے ہیں (مشاہدات و تاثرات) "مولانا شبلیؔ کیلے کھا رہے تھے کہ عباس حسین داخل ہوئے۔ شبلیؔ نے کہا، مولانا کیلے کھائیے۔ انھوں نے فی البدیہہ جواب دیا، آپ اکیلے ہی کھائیے۔" دراصل معانی و بیان کا علم لفظی و معنوی رعایتوں پر منحصر ہے۔ عباس حسین اس طرح کی بلیغ نزاکتوں کے ذریعہ محفل کو شگفتہ بنانا اور رنگ جمانا جانتے تھے۔ اردو قواعد کے ضابطوں میں ان ترکیبوں کو ضلع جگت کہتے ہیں۔ ضلع عربی اور جگت ہندی، معنی کرتب، مجموعی مفہوم تلازمۂ لفظی کے ذریعے ندرت معنی پیدا کرنا ہوا۔ شیخ عبداللہ نے مولانا عباس حسین کے اور بھی کئی لطیفوں کو اپنی خود نوشت میں محفوظ کیا ہے۔ سرسیّد نے ان کو باغات کا نگراں مقرر کیا جن کو سرسبز کرنے میں سرسیّد نے شدید محنت جھیلی تھی: "وہ کالج کے باغ کی تیاری میں پہروں دھوپ اور لوؤں میں پھرتے تھے۔"

رحالی)، گویا کسی کو باغات کا نگراں بنانا سر سید کی طرف سے خاص اعتماد و عنایت کا اظہار تھا۔ عباس حسین نے کلاس میں آکر لڑکوں کو خبر سنائی: "ہم اب باغی ہو گئے۔ مالی کی گوشمالی ضروری ہے۔ اس کا کوئی مالی نقصان ہرگز منظور نہیں۔" (مشاہدات و تاثرات) ویسے تو بذلہ سنجی کے مختلف عنوان مولانا کو یاد تھے مگر لفظی و معنوی رعایتوں کی مدد سے نکتہ آفرینی ان کی خاص ادا تھی۔ ایک دفعہ کسی نے آکر کہا: مولانا آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ ان کی زبان سے برجستہ نکلا: ضرور کہیے، طول نہ ہو۔ شیخ عبداللہ کا بیان ہے کہ لڑکے مولانا کی تقریر سے بہت خوش ہوتے تھے اور وہ ایک مقبول مقرر تھے۔ جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو محفل پہلے ہی سے تازہ و شاداب ہو جاتی تھی۔ لڑکے مشتاق رہتے تھے کہ مولانا خوب ضلع بولیں گے اور مزیدار فقرے سنائیں گے۔

مدرسۃ العلوم میں مولانا کا تقرر خالص تدریسی مقصد کا نہ تھا بلکہ ذرا سی مصلحت بھی شامل تھی۔ گویا مانوس اصطلاح میں سیاسی رنگ کا تقرر تھا۔ "مسلمان انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے اور سخت نفرت و وحشت رکھتے تھے۔" (حالی)۔ لہذا سر سید نے ابتدائی مرحلے پر دو شعبوں کی گنجائش نکالی: "اورنٹیل ڈپارٹمنٹ اور انگریزی ڈپارٹمنٹ"۔ دراصل اوّل الذکر محض مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے اور مخالفت کے طوفان کو روکنے یا حتی المقدور کم کرنے کی خاطر قائم کیا گیا تھا۔ مولانا عباس حسین اس کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ اس شعبے کا بتدریج جو حشر ہوا وہ حالی، شیخ عبداللہ اور میر ولایت حسین (آپ بیتی) کے بیانات سے واضح ہے۔ "اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کو کوئی پسند نہ کرتا تھا۔ اس کا روز بروز تنزل ہوتا گیا اور انگریزی ڈپارٹمنٹ ترقی کرتا گیا۔ اورنٹیل ڈپارٹمنٹ سے طالبعلموں اور ان کے مربیوں کو کوئی امید دنیاوی فائدے کی نہ تھی۔" (حالی) شیخ عبداللہ مزید اضافہ کرتے ہیں کہ اس کو چلانے کی کوشش میں مولانا عباس حسین کچھ عرصے تک اپنے وطن سے طالب علموں کو لاتے رہے۔ مگر جب نوبت یہ آئی کہ استادوں کی تعداد طلبا کی تعداد سے زیادہ ہوگئی تو وہ شعبہ بند کر دیا گیا۔ مولانا عباس حسین کالج اسٹاف میں شامل ہو گئے۔

مدرسۃ العلوم سے وابستگی بظاہر کوئی اچھی ابتدا اور امید افزا امکانات کی نقیب نہ تھی۔

جس شعبے کی سربراہی سپرد ہوئی وہ چل نہ سکا اور بند ہو گیا، مگر مولانا حیدر آباد سے معروف اصطلاح میں لنگر توڑ کر اور کشتی جلا کر علی گڑھ آئے تھے۔ اب جائے ماندن نہ پائے رفتن کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ حوصلہ شکن وہ حالات تھے جو مولانا کی آمد کے وقت اُن کے شفیق مربی کو جھیلنے پڑ رہے تھے۔ مسلمانوں کی رائے عامہ پر ہمیشہ سے قابو رکھنے والے طبقے میں چاروں طرف کھلبلی سی مچی تھی: "سرسید کو ملحد، لامذہب، کرسٹان، نیچری، دہریہ، کافر، دجال اور نہ جانے کیا کیا تذلیل و تحقیر کے خطاب تھے جو مولویوں کی طرف سے مل چکے تھے۔ ساٹھ جید عالموں نے کفر کے فتوے پر دستخط کیے تھے اور مہریں ثبت کی تھیں" (حالی) "یہ مدرسہ جس کو خدا برباد کردے اور اس کے بانی کو ہلاک کرے، اس کی مدد ہرگز جائز نہیں" (فتویٰ) علمائے کرام نے مکہ معظمہ سے مذاہب اربعہ کے مفتیوں سے بھی فتوے منگا لیے تھے: "یہ شخص ابلیس لعین کا خلیفہ ہے۔ اس کا فتنہ ابلیس کے فتنے سے کم نہیں" (خلاصہ) فتوے کی سب سے خطرناک شق یہ تھی کہ سرسید کو واجب القتل ٹھہرایا گیا تھا، جس کی وجہ سے ان کے رفقائے کار کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ مدرسہ (ایم اے او کالج) کے بارے میں عجیب افواہیں پھیلی تھیں۔ ان سخن سازیوں کا خلاصہ بے محل نہ ہوگا۔

۱۔ سید احمد خان کا بت رکھا جائے گا۔ ۲۔ شیعوں کی مذہبی کتابیں پڑھائی جائیں گی۔ ۳۔ لڑکوں کو انگریزی لباس پہنایا جائے گا۔ ۴۔ اولاد مسلمان نہ رہے گی، لڑکے انگریزی پڑھ کر کرسٹان ہو جائیں گے۔ ۵۔ چندہ بنک میں رکھا جاتا ہے، بنک سود دیتا ہے سود حرام ہے۔ علیٰ ہذا القیاس، ایسی صورت حال میں سرسید کا ہم سفر بننا گویا بازار رسوائی میں داخل ہونا تھا۔ مگر ان کا تحمل و استقلال دوسروں میں جمال ہم نشیں کی سی متعدی صفت بن کر سرایت کر جاتا تھا۔ محسن الملک نے جو فی الحال مہدی علی تھے، ایک دفعہ سرسید کو رات کے وقت روتے دیکھا اور یہ دریافت کرنے پر کہ کیا خدانخواستہ کسی عزیز کے مرنے کا تار آگیا، سرسید کا جو جواب سنا اس سے ہمیشہ کے لیے ان کے غلام ہو گئے۔ غرضکہ کچھ لوگ حمایت پر کمربستہ ہوئے اور آگے بڑھے۔ حریفوں کی طرف سے ان کو طنزیہ خطابات سے نوازا گیا۔ عباس حسین بھی اس اعزاز میں شریک ہوئے۔ یعنی سرسید کی

خواہشوں پر آمین کہنے والے۔

غدر کے بعد سے انیسویں صدی عیسوی کے بالکل اختتام تک برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا محور تنہا ایک آدمی کی ذات ہے۔ اس کی اور اس کے رفیقوں کی زندگی کے حالات ہی مسلمانوں کی تاریخ ہیں۔ مختصر طور سے سر سیّد کے مقاصد و عزائم کو چھ عدد عنوانات کے تحت رکھ دیا جائے تو چھوٹی موٹی باتوں کو چھوڑ کر تقریباً سارے اہم معاملات نظر کے سامنے واضح ہو جاتے ہیں۔ غدر کے زمانے سے اُس وقت تک جب مولانا عباس حسین علی گڑھ میں وارد ہوئے (سنہ ۱۸۸۲ عیسوی) پچیس برس کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس چوتھائی صدی میں سر سیّد پانچ محاذ کھول چکے تھے۔ (۱) غدر کے ہنگامے نے انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف گہری نفرت بٹھادی تھی۔ اس کی صفائی پیش کرنا چاہیے تاکہ نئے حاکموں اور مسلمانوں کے درمیان اعتماد و موانست بحال ہو، جائیدادوں کی ضبطی اور ملازمتوں سے محرومی کی بنا پر مسلمان افلاس میں پھنس گئے تھے۔ اس سے نکلنے کی صورت پیدا کرنا ہے۔ یہ مقصد سامنے رکھ کر سر سیّد "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھتے ہیں۔ اس کتاب پر انگلستان کے دار العوام میں بحث ہوئی اور اس کی روشنی میں وائسرائے کی آئندہ پالیسی کے خطوط مرتب ہوئے (۲) موجودہ حالات سے خوف زدہ اور پست ہو کر مسلمان اپنی گزشتہ عظمت اور شاندار میراث کو نہ بھول جائیں۔ لہٰذا ایسی چند کتابوں کی آسان دسترس ضروری ہے جو اُن کی عظمت رفتہ کا آئینہ ہیں۔ سر سیّد تاریخِ فیروز شاہی، آئین اکبری، اور تورک جہانگیری کے نسخے درست کر کے شائع کرتے ہیں اور اپنے قلم سے آثار الصنادید کا اضافہ کرتے ہیں (۳) یورپ کی مسیحی دنیا میں اسلام کے خلاف جو گمراہ کن اور مکروہ تصورات پھیلائے گئے ہیں اور جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے ان کا جواب دینا اور سدِّباب کرنا لازم ہے۔ خطباتِ احمدیہ اور دیگر متعدد مضامین اسی کا نتیجہ ہیں۔ تفسیر قرآن بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ یعنی اسلام میں جدید زمانے کی ہدایت اور ترقی کا راستہ دکھانے کی صلاحیتیں موجود ہیں (۴) صدیوں کی حکومت و دولت نے جو اخلاقی برائیاں مسلمانوں میں پیدا کر دی ہیں ان کو رفع دفع کیے بغیر معاملہ آگے نہ

بڑھے گا۔ یہ تہذیب الاخلاق کی شانِ نزول ہے۔ اس رسالہ نے چھ برس تک ایک تیز برقی لہر کا کام کیا" جہاں اس کے مضامین سے بعض بزرگوں کو نفرت ہوئی وہاں کچھ ہم خیال بھی پیدا ہوئے۔ اور تھوڑی سی زمین ہموار ہوئی" (حالی) (۵) ماضی میں علوم کی امامت مسلمانوں کے پاس رہی ہے۔ وہ جدید علوم میں اہلِ مغرب سے پیچھے نہ رہنے پائیں۔ سائنٹیفک سوسائٹی قائم کرنے کا محرک یہی جذبہ تھا۔ سنہ ۱۸۶۳ عیسوی۔ اس کے جلسوں میں علومِ جدید کے موضوعات پر بحث و مذاکرہ ہوتا تھا اور سائنس کے اصول و مسائل سمجھانے والے مقالات پڑھے جاتے تھے۔ دوسری بات اس مقصد سے متعلق سرسید کے ذہن میں یہ آئی کہ جدید مغربی طریقے کی ایک دانش گاہ قائم کرنی پڑے گی۔ انھوں نے یہ خیال سب سے پہلے دہلی میں اپنے ایک عزیز نواب امو جان کے سامنے ظاہر کیا کہ مجھے دس لاکھ روپیہ چاہیے۔ نواب صاحب نے صلواۃ سنائی "تم کیا دیوانوں کی سی باتیں کرتے ہو مسلمانوں سے دس پیسے وصول نہیں ہو سکتے۔" (حالی) مگر واقعی سید احمد خاں ان لوگوں میں سے تھے جو ناممکن کا لفظ اپنی لغت سے نکال پھینکتے ہیں (۶) آخری عنوان یا کہہ لیجیے کہ آخری محاذ کا تعلق اگرچہ مذکورہ دور سے (سنہ ۱۸۸۲ عیسوی) نہیں ہے اور ذرا آگے کی بات ہے لیکن ربطِ بیان کا تقاضا ہے کہ یہیں بیان کر دیا جائے۔ ہوا یہ کہ سنہ ۱۸۸۵ عیسوی میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ اس کے سال بھر بعد سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی، جس کو حالات کی رفتار اور نزاکت نے فوراً ہی ایک سیاسی پلیٹ فارم میں تبدیل کر دیا۔ موسم سرما کی تعطیلات کے موقع پر (دسمبر سنہ ۱۸۸۷ عیسوی) کانگریس کا تیسرا سالانہ اجلاس مدراس میں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ عین اسی وقت سے فریقین کے درمیان نظریاتی اختلافات ابھر کر سطح پر آ گئے۔ متعدد پیچیدہ وجوہات میں سے خاص الخاص یاد رکھنے کے قابل ہیں: ۱۔ کانگریس اوّل دن سے ہندو اکثریت کی جماعت تھی۔ جمہوریت کے نظام اور نمایندہ اداروں کے قیام سے کون کتنا فائدہ اٹھائے گا، یہ سوال اور اس کا جواب سرسید کے سامنے آئینے کی طرح روشن تھا۔ اصولاً منتخب شدہ مجلس یعنی کاؤنسل میں ایک مسلمان ہو گا تو چار ہندو ہو جائیں گے۔

عملاً اکثریتی ووٹ کی حمایت حاصل نہ ہوئی تو ایک مسلمان بھی نہ پہنچ پائے گا۔ سرسیّد دو دفعہ لارڈ لٹن اور لارڈ رپن کے عہد میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے۔ انھوں نے وضاحت کے ساتھ ہندوستان جیسے ملک میں جمہوری نظام مستعار لینے سے پیدا ہونے والی قباحتوں کو سمجھایا اور آگاہ کیا کہ اس کے تحت مسلمانوں کے سیاسی مفادات مجروح ہونے کا صریحی اندیشہ ہے۔ ۲۔ سول سروس کا امتحان جس پر کانگریس نے سب سے پہلے زور لگایا انگلستان میں ہو یا ہندوستان میں، مسلمانوں کے لیے کیا فرق، تاوقتیکہ ان کی معتدبہ تعداد انگریزی پڑھ کر امتحان کے لائق نہ ہو جائے۔ ۳۔ عدالتی اور دفتری زبان کی حیثیت سے فارسی منسوخ کر دی گئی (سنہ ۱۸۳۷ عیسوی) اور اس کی جگہ انگریزی نے حاصل کر لی۔ میکالے کی رپورٹ جو منٹ کے عنوان سے مشہور ہے۔ ایک یادگار اور دوررس نتائج کی حامل تاریخی دستاویز ہے۔ البتہ چھوٹی ملازمتوں کی سطح پر شمالی ہند میں اردو برقرار رہی۔ ہندوؤں نے مطالبہ کیا (سنہ ۱۸۶۷ عیسوی) کہ اردو کی جگہ سرکاری اور عدالتی زبان کا درجہ ہندی کو ملنا چاہیے۔ یہ مطالبہ بار بار کیا گیا اور امتدادِ وقت کے ساتھ زور پکڑتا گیا۔ ہندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت کے قضیے نے قطعی طور پر مسلمان اور ہندو کے مفاد اور موقف کی علیحدگی کو ثابت کر دیا۔ سرسیّد کی تاریخی گفتگو جو ایک انگریز دوست (کمشنر بنارس) سے ہوئی تھی اور انھوں نے پیشین گوئی کے طور پر کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہ رہ پائیں گے۔ اسی موقعے سے متعلق ہے۔ مختصر یہ کہ ایجوکیشنل کانفرنس سرسیّد کی وفات تک (سنہ ۱۸۹۸ عیسوی) بلکہ قیامِ مسلم لیگ کے وقت تک (سنہ ۱۹۰۶ عیسوی) گوناگوں سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ "مسلمانوں کا میلہ تھا جو ہر سال علی گڑھ میں یا کسی دوسرے شہر میں ہوا کرتا تھا" (حالی) اس قسم کے طولِ کلام کا موقع محل تھا یا نہ تھا بقول میرزا سودا: اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں، یہ فیصلہ پڑھنے والے کریں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ سرسیّد کے کسی رفیق کا ذکرِ خیر ہوگا تو ناگزیر طور سے وہ سب قصّے بھی درمیان میں آئیں گے جن کی جانب اوپر اشارے کیے گئے ان کو دُہرائے بغیر یہ اندازہ نہ ہو سکے گا کہ وہ بزرگ کیسے گہرے نقش قدم چھوڑ گئے۔

مولانا عباس حسین علی گڑھ میں کوئی خاموش تماشائی یا محض ملائے مکتب نہ تھے۔ وہ سرسید کے شریک وسہیم تھے اور اس عزم راسخ کے ساتھ حیدرآباد سے علی گڑھ آئے تھے۔ کہ جس کی دعوت پر جارہا ہوں اسی کے ساتھ ڈوبنا اور تیرنا ہے۔ یونیورسٹی کے ذخیرۂ آثار میں سرسیّد کے ساتھ ان کی ایک تصویر موجود ہے۔ ہر سال یوم سرسید (۱۷ اکتوبر) کے موقعے پر اس تصویر کی نمائش ہوتی ہے۔

عباس حسین جس محاذ کے لیے موزوں تھے وہ اجتماعی رسومات کی اصلاح، صالح معاشرے کی تعمیر، اور مجموعی طور سے پوری زندگی کی نہج میں ترمیم و تغیّر سے متعلق تھا۔ مگر تہذیب الاخلاق چھ برس جاری رہ کر مولانا کے ورود سے چھ برس پہلے ہی بند ہوچکا تھا۔ پوری روئیداد کا اجمال یہ کہ سرسیّد تقریباً ڈیڑھ برس لندن میں رہ کر واپس آنے کے بعد تہذیب الاخلاق کی بنیاد ڈالتے ہیں (سنہ ۱۸۷۰ء) اور اپنے مقاصد کا اعلان شروع کرتے ہیں۔ علمائے کرام برافروختہ ہوجاتے ہیں اور مخالفت کا محاذ کھُل جاتا ہے۔ پانچ برس بعد مدرستہ العلوم مسلمانان' ایم اے او کالج، وجود میں آتا ہے۔ "بولا یہ ملہم غیب اٹھارہ سے پچھتّر" ابجد کے حساب سے "اٹھارہ سے پچھتر" کے عدد بارہ سو بانوے ہوتے ہیں، جو ایم اے او کالج کا ہجری سال تاسیس ہے۔ اس قسم کی تاریخ کو علم بلاغت میں تاریخ صوری و معنوی کہتے ہیں، اختلافات کا طوفان کسی صورت تھمتا نظر نہ آیا تو سرسیّد کو زندہ اور چلتے پھرتے تہذیب الاخلاق ڈھونڈنے کی ضرورت پیش آئی۔ حسنِ اتفاق سے وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ ان کے بیشتر رفقا زندگی بھر تالیفِ قلب کی دشوار مہم پر جان لگائے رہے۔ مولانا عباس حسین کی نزسبیت اسی طبقے میں ہوئی تھی جو شدید ناراض تھا۔ عربی محاورے کے مطابق گویا اسی تنور کے نان تھے۔ ضرورت تھی کہ علمائے کرام کسی ہم جنس کی زبان سے قضیہ ساعت فرمائیں۔ وہ بھی ایسا ہم جنس جو تقریر میں خالص مجادلے کا بدل معانی و بیان کے دل نشیں کنایات سے کرنا جانتا ہو۔ اور برجستہ ذہانت کے ذریعہ باتوں کو ذہن میں آتارنے کے راز سے واقف ہو۔

ایسا ہونا امکان سے بعید نہ تھا کہ وہ متحرک اور توانا تہذیب الاخلاق بعض اوقات خود اپنی دلیل کی زد میں آ گئے اور اعتراض کے نشانے سے خود کو نہ بچا سکے۔ ایسی صورت میں خلوص و صداقت کا ثبوت دینا اور آزمائش کے معیار پر پورا اترنا لازم ہو جاتا تھا۔ مولانا عباس حسین کا ایک واقعہ یادگار ہے۔ وہ کسی موقعے پر جھوسی کے ایک امام باڑے میں جو دیوان خانہ کہلاتا ہے مجلس پڑھ رہے تھے۔ بچوں کی تربیت میں عورت کا کردار اور اس ضمن میں عقد بیوگان، مولانا کا خصوصی موضوع تھا۔ انھوں نے عقد بیوگان پر ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا۔ جیسے ہی مولانا منبر سے اترے معترضین میں سرگوشیاں ہوئیں کہ بہن بیوہ بیٹھی ہے، اپنے گھر سے اصلاح کیوں نہیں شروع کرتے۔ یہ بات ان کے کان تک پہنچی تو فوراً اپنی بہن مہدی بیگم کا نکاح ایک عزیز، ناظر حسین سے کر دیا جو نہایت قلیل بضاعت کے آدمی تھے۔ ناظر حسین اور مہدی بیگم کی اولاد میں دو بیٹیاں، خورشید بانو اور منور بانو تھیں۔ مولانا نے خورشید بانو کو اپنے بیٹے ناصر عباس کے لیے انتخاب کیا۔ منور بانو راقم السطور کے دادا کے بھائی، غلام عباس کے گھر میں آئیں۔ مولانا برسرِ منبر عزاداری کی غیر ضروری رسومات پر تنقید کرنے میں بالکل تکلف نہ کرتے تھے۔ ہمارے وطن میں محرم کے زمانے میں بچوں کو طوق بیڑی پہناتے وقت امام باڑے میں شربت شیرینی سمیت بھیجنے کی رسم ہے جو "جے گھڑ" کہلاتی ہے۔ مولانا اس کو "جی گھڑ" کہتے تھے۔ متعدد جی سے گھڑی ہوئی رسومات پر ٹوکنا اور ترک و ترمیم کی تاکید کرنا مشکل سہی، مگر مولانا کے نزدیک اصلاح کی دعوت ایک سنجیدہ ذمہ داری تھی۔

مدرستہ العلوم کے عنوان سے حالی نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس چہارم منعقدہ علی گڑھ (سنہ ۱۸۸۹ عیسوی) میں ایک نہایت اثر انگیز نظم پڑھی جس سے کانفرنس کا ماحول جگمگا اٹھا۔ سرسید ڈائس پر رونق افروز تھے۔ حالی نظم کے آخری شعر میں سرسید کی دردمندی اور جانفشانی کا اعتراف معذرت کے لہجہ میں کرتے: ادائے حق تو ہم سے ہو سکتا ہے کیا حالی۔ وہ طلبا کے نظم وضبط کی داد دیتے ہیں۔ اور

ضمناً چھ استادوں کی نام بنام تعریف کرتے ہیں۔ انگریز استادوں میں بیک، مارِیسن، اور آرنالڈ، اور ہندوستانیوں میں بابو جادو چند چکرورتی، شبلی نعمانی، اور عباس حسین کے نام شامل ہیں، آخر الذکر کو نامور شیعہ عالم، شیخ ابو جعفر طوسی (م ۴۶۰ھ/۱۰۶۷) کا ہم پلّہ قرار دیتے ہیں:

اگر بو جعفرِ طوسی کو زندہ دیکھنا چاہیں
تو عباس ابن جعفر سا محیطِ علم و فن دیکھیں

مولانا کا نمایاں امتیاز وہ خطاب ہے جس کے حصول کی سعادت سرسید کے حلقۂ خاصان کا حصّہ تھی اور محض تھوڑے سے لوگوں کے نصیب میں آئی۔ وہ جھولی والے اصحاب تھے کالج کے لیے چندے کی مہمات میں انہماک اور دلچسپی کے ساتھ مولانا کی شرکت سراسر رحمت ثابت ہوئی۔ غدر کی تباہی اور حکومت اودھ کی پائمالی کے باوجود شمالی ہند میں شیعہ اکابرین اچھے خاصے بچ رہے تھے۔ ہوگلی بندر سے عظیم آباد اور وہاں سے لاہور تک ان کی حیثیت خوب مضبوط تھی۔ اس طبقے کی جیب سے چندے کی وصولیابی میں مولانا کی ذات کا وقار بہت کام آیا۔ سرسید کے بعد والی نسل نے مولانا کی خدمات کا اور زیادہ دل کھول کر اعتراف کیا۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ حیدر آباد سے بڑی تنخواہ چھوڑ کر قلیل مشاہرہ پر علی گڑھ آ گئے تھے۔ وہ تقریباً نصف صدی تک کالج سے وابستہ رہے۔ جھولی والے اصحاب کو آرام کے لیے رخصت کرنا سرسید کے جانشینوں کی مروت اور مصلحت کے خلاف تھا۔ وہ علی گڑھ آئے تو پچیس تیس برس کے درمیان رہے ہوں گے عرصہ دراز تک وہاں کے سرد و گرم دیکھتے رہے۔ عمر عزیز پچاسی کے قریب پہنچی تو علی گڑھ چھوڑ کر جارچہ میں فروکش ہو گئے۔ منزلِ آخر اور مرکز اصلی کی طرف چلے تو پہنچانے کے لیے سارا جارچہ جلوس بن کر موجود تھا یہ واقعہ ۱۹۲۶ء کا ہے۔

●

## احمد ظہیر عباس

احمد ظہیر عباس مولانا عباس حسین کے پوتے تھے۔ تقریباً چالیس برس تک مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ کے شعبۂ شیعہ دینیات میں تدریس کے منصب پر فائز رہے۔ ان کو دادا صاحب قبلہ کی نگرانی میں اعلیٰ درجے کی تربیت کا موقعہ ملا تھا اور گھر میں رہ کر متداول علوم کو اچھی طرح پڑھا تھا۔ پرانے زمانے میں علماء کے بچّوں کی تعلیم اکثر و بیشتر اسی نہج پر ہوتی تھی مگر معاشرے کی قدریں بدل گئیں اور قدیم روایات دفترِ پارینہ ہوگئیں۔ انفرادی تعلیم کا دَور ختم ہوا، اجتماعی تعلیم کا دور آگیا۔ تربیت کی جگہ نصابی تعلیم نے لے لی۔ امتحانات کے ذریعے حاصل شدہ اسناد کو لازمی سمجھا جانے لگا۔ مولانا ظہیر عباس ابتدائی عمر میں اس طرف مناسب اور مکمل توجہ نہ دے سکے تھے جس کی وجہ سے خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ آخر تک لیکچرر کی پوزیشن میں رہے اور اسی حیثیت سے رٹائر ہوگئے۔ البتہ مولانا کے کردار میں بہت سی وہ خداداد صفات تھیں جو آدمی کی شخصیت کو ممتاز کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ وہ فطری ذہانت، خوش اخلاقی اور شائستگی سے طالب علموں کو متاثر کرتے تھے اور یونیورسٹی کی برادری ان کو احترام کی نظر سے دیکھتی تھی۔ دانش گاہوں میں استاد کی لیاقت، تبحّر اور تفکر کا اولین معیار اس کی کلاس کے درس ہوتے ہیں۔ مولانا اس اعتبار سے کامیاب استاد تھے۔ ان کو درسیات پر پورا عبور تھا اور شہرت یہ تھی کہ ان کی کلاسیں دینیات کی عام کلاسوں کی طرح پھیکی ہونے کے بجائے مزیدار اور دلچسپ ہوتی ہیں۔

علی گڑھ میں ویسے تو دینیات کا بڑا زور شور رہتا آیا ہے اور ابتدا سے اس کی تعلیم لازمی ہے۔ مگر حق بات سب جانتے ہیں کہ جدید علوم اپنے درسیاتی نظام کے ساتھ اس کا جوڑ اچھی طرح بیٹھنے نہیں دیتے۔ طالب علموں کا جی چاہے بھی تو ان کی فیکلٹی کے خصوصی مضامین اس قدر مفصل ہوتے ہیں اور اتنے زیادہ جان کو آئے رہتے ہیں کہ دینیات کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں ملتا۔ متعینہ گھنٹوں میں پابندی سے پہنچنا اور درس میں حاضر رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسلامی علوم کا دامن بہت وسیع ہے۔ یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، عقاید، کلام، فلسفہ، منطق، اور آخر میں تصوف کی تربیت پر پہنچ کر معاملہ ختم ہوتا ہے۔ کسی کو مزید شوق ہو تو ریاضیات، نجوم، تاریخ،

اور دیگر علوم بھی پڑھ لے۔ فنونِ لطیفہ خصوصاً شاعری نے درس گاہوں کا پیچھا کبھی نہ چھوڑا۔ فارابی اور ابن سینا نے موسیقی کو بھی ذہنی نشو و نما کے لیے لازم سمجھا تھا اور ان کی تاکید پر صدیوں تک عملدرآمد ہوتا رہا۔ اکثر علماء و فضلاء موسیقی کے فن سے واقف تھے مگر عمامہ و دستار و ریش کی شرم میں برملا اظہار نہ کرتے تھے۔ تنگ نظری کا ڈنکا فکری زوال کے بعد بجا۔ غرضکہ جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے وہ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اہلبیت اطہار کی سیرت و سوانح کا اضافہ اپنے نصاب میں اور کر لیتے ہیں اور اسلام کے قرونِ اوائل کی تاریخ کا مطالعہ ذرا غور سے کرتے ہیں۔ مگر علی گڑھ میں دینیات کا نصاب ایسے زبردست بکھیڑے کو کہاں برداشت کرتا ہے۔ وہاں یہ کافی سمجھا جاتا ہے کہ فقہ کے باب العبادات سے اخذ کر کے نماز روزہ اور دیگر واجبات کا تعارف کرا دیا جائے، اور اس سے بھی زیادہ اختصار کے ساتھ باب المعاملات کے اندر سے نکال کر ذاتی زندگی سے تعلق رکھنے والے چند ضروری مسائل مثلاً حقوق والدین، نکاح، طلاق وغیرہ سرسری طور سے گریجویشن کے مرحلے تک بتا دیے جائیں۔ لڑکوں کا روزمرّہ کا معمول یہ ہے کہ صبح سے دوپہر تک سارا وقت فیکلٹی کی کلاسوں میں گزر گیا، بلکہ بعض اوقات دوپہر بعد بھی پھنسے رہے۔ عموماً دینیات کے گھنٹے ایسے موقع پر آ کر پڑتے ہیں جب کہ بھوک کے مارے جی نکلتا ہوا ہوتا ہے۔ یا خیریت اس میں نظر آتی ہے کہ کھانا حلق سے نیچے اتر گیا اب ذرا لیٹ کر شیخ الرئیس کی روح کو خوش کرنا چاہیے، عموماً کھیلوں کے میچ کا وقت بھی دینیات کے گھنٹوں سے ٹکرا جاتا ہے علی گڑھ میں دینیات کی کلاسوں سے غائب ہونے اور بھاگنے کا ہمیشہ سے رواج رہا ہے۔ لڑکے بدشوق اور نامعقول نہیں ہیں، حالات مجبور کرتے ہیں۔ دینیات کے استاد اس بات کو جانتے ہیں اور ناگواری کا احساس نہیں کرتے۔ مفت حاضری مانگنے کی عادت بھی دینیات کی فیکلٹی میں عام ہے۔ پرانے زمانے میں دینیات کے نمبر جوڑے جاتے تھے اور ڈویژن پر اثر پڑتا تھا۔ اب صرف امتحان پاس کرنا کافی ہے حاضریوں کی پابندی بھی برائے نام رہ گئی ہے۔ جب درس اور حاضری کی اہمیت تھی اور استاد کے ہاتھ میں نمبر تھے اس وقت بھی مولانا ظہیر عباس کو لڑکوں سے

خشونت برتنے کی عادت نہ تھی اور لڑکے ان سے بہت زیادہ خوش رہتے تھے۔
مولانا اپنا ایک دلچسپ قصّہ سناتے تھے۔ ہوا یہ کہ ایک دفعہ پرو وائس چانسلر کے کان تک شکایت پہنچی کہ مولانا لڑکوں کے بھاگنے پر روک ٹوک نہیں کرتے۔ اور ان کی کلاسیں آج کل باقاعدہ نہیں ہو رہی ہیں۔ اس وقت تک موجودہ نئی عمارتوں کا نام ونشان نہ تھا اور کلاسوں کا جمگھٹ سر سیّد ہال تک محدود تھا مولانا مجتبیٰ کاموپوری نے صفائی دی کہ میں نے کوئی خفیہ رپورٹ نہیں بھیجی تھی ۔۔۔ پرو وائس چانسلر خود آ گئے تھے، وہ دینیات کی فیکلٹی کے ڈین تھے۔ صاحب موصوف مولانا ظہیر عباس کے کمرے کا قفل لگا کر چابی اپنے ساتھ لے گئے کہ دیکھیں کب تک نہیں آتے۔ عرصہ گزر گیا اور صدائے برنخاست۔ آخر ایک دن پرو وائس چانسلر نے صدر شعبہ مولانا کاموپوری اور احمد ظہیر عباس کو اپنے دفتر میں بلا بھیجا اور طنزیہ پوچھا۔ کہیئے مولانا، کلاس کب سے نہیں ہوئی؟ مولانا نے کہا: الزام بغیر گواہ کے فقہ کی رو سے دُرست نہیں ہوتا۔ پرو وائس چانسلر نے مولانا کاموپوری کی طرف دیکھا۔ فوراً مولانا ظہیر عباس بولے کہ جناب صادق القول گواہ لائیے۔ جو شخص پورے چار برس تک اپنے کو شافعی بنا کر جامعہ ازہر میں پڑھتا رہا اور مصر میں سیر سپاٹے کرتا پھرا اس کی گواہی درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ پرو وائس چانسلر صاحب نے مولانا کاموپوری سے سوال کیا: کیوں مولانا، کیا یہ صحیح بات ہے؟ مولانا کاموپوری۔ بجد دیندار، مومن، اور راست گو آدمی تھے۔ اعتراف کر لیا کہ جی ہاں، میں نے علم کے شوق میں ایسا کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں جامعہ ازہر میں شیعوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ ظہیر عباس کہنے لگے، اب میں اپنے گواہ بلاتا ہوں۔ آواز کا اشارہ پاتے ہی لڑکے پرو وائس چانسلر کے دفتر میں گھس آئے، اور ایک زبان ہو کر بولے، ہم کلاس ناغہ نہیں کرتے۔ سر سیّد ہال کے لان پر کلاس ہوتی ہے۔ پرو وائس چانسلر نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ایک لڑکا بول اٹھا۔ صاحب پھر تو تمام سر سیّد ہال کو گواہی میں لانا پڑے گا ۔۔۔ پرو وائس چانسلر صاحب کو پریشانی ہوئی کہ یہ مسخرے بھیڑ جمع کر لیں گے، دوسرے

لڑکے کی زبان سے برجستہ نکلا، آدمیوں پر اعتبار نہ ہو تو کرسی پر اعتبار کرلیجیے۔ چل کر ملاحظہ فرمایئے، کرسی لان پر رکھی ہے۔ پرو وائس چانسلر صاحب نے قضیہ نمٹانے کی غرض سے چابی نکال کر مولانا طہیر عباس کی طرف بڑھائی اور فرمایا، غلط فہمی ہوگئی، جایئے کلاس لیجیے۔ مولانا نے چابی لینے سے انکار کردیا اور کہا، جناب، معاف فرمائیے مجھے اس یونیورسٹی کی تاریخ اور روایات کا علم ہے۔ میں جانتا ہوں یہاں کلاسیں کیوں کر ہوا کرتی تھیں۔ کمرے کہاں تھے؟ میرے لیے کمرہ کیا معنی رکھتا ہے۔۔۔۔ پرو وائس چانسلر کی مصنوعی مسکراہٹ دیکھ کر لڑکوں نے مصرعہ اٹھایا، مولانا، تشریف لے چلیے، کلاس کو دیر ہورہی ہے۔ احمد طہیر عباس لڑکوں کو لے کر دفتر سے چل دیے سر سیّد ہال کے لان پر پہنچ کر رجسٹر میں سب کی حاضری لگائی۔ لڑکوں نے ادب سے سلام کیا، مولانا نے خندہ پیشانی کے ساتھ خدا حافظ کہا۔

احمد طہیر عباس خوش منظر اور وجیہہ انسان تھے۔ موزوں قد اور تناسب قامت نہ تو راقم الحروف کے والد ماجد کی طرح بیحد دبلے پتلے اور نہ مولانا ابن حسن کی مانند ایسے بے ڈھب موٹے کہ لکھنؤ کے مسخروں کی پھبتی "پہلوان الملت" چپکانے کی گنجائش ہو۔ انھوں نے بڑھاپے تک جسم کے کسی حصّے پر فالتو چربی کا عمل دخل نہ ہونے دیا۔ اور لذیذ غذاؤں سے محظوظ ہونے کے باوجود پیٹ کی سطح ہمیشہ سینے سے نیچے رکھی۔ جوانی میں گھوڑے کی سواری کرتے تھے۔ جب تک عمر، ماحول، اور وسائل نے اجازت دی یہ شوق برابر قائم رہا۔ ان کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ باقاعدہ ورزش مردانہ وجاہت کے لیے کس قدر لازمی چیز ہے۔ علمی خانوادے کے فرد اور بذات خود عالم تھے۔ ڈاڑھی کی شرعی اہمیت کا خوب احساس تھا۔ خشخشی داڑھی کے ذریعہ ضرورت پوری ہوجاتی تھی لمبی ریشِ مبارک سے پرہیز کیا اور کبھی بے تحاشہ راست چپ اور نیچے کی طرف پھیلنے نہ دیا۔ اس سے ذوقِ سلیم کا پتہ چلتا تھا۔ مولانا کو ہر دلعزیز ذاکر اور خطیب منبر بنانے میں ان کے علم حاضر اور شگفتہ انداز بیان کے علاوہ ان کی طبعی شرافت اور مزاج کی سادگی بھی چپکے سے مدد کرتی تھی۔ ایک زمانہ میں بمبئی کی خوجہ جماعت کے لوگ ان کے

گرویدہ ہو گئے اور وہاں ان کی مانگ بڑھ گئی۔ مولانا کو کم از کم دو گھنٹے سے پہلے بیان ختم کرنے کی عادت نہ تھی۔ خوجے ہاتھ جوڑتے تھے کہ حضور فقط گھنٹہ پڑھیے ہم کو دوسرے ضروری کام ہیں۔

مولانا کی ذات کا اصلی جوہر فصاحتِ لسانی تھا۔ وہ منبر پر پہنچتے ہی ایسے جاندار انداز میں خطبہ شروع کرتے تھے کہ مجلس میں ایک طرح کی تازگی اور گرمی سی آجاتی تھی۔ خطبے کی عربی عبارت کا منشا و مدعا، جیسا کہ سب جانتے ہیں، اتنا سا ہے کہ اے مومنین، درود بھیجیے اپنے رسولؐ پر۔ جواب میں فوراً سارا مجمع مل کر ایک دفعہ یا مکرر درود پڑھتا ہے۔ علمائے دین کا شعوری یا غیر شعوری رجحان بتیشتر یہ ہوتا ہے کہ ان کا خطبہ سنجیدہ ماحول طاری کردے اور تھوڑی سی خوفِ عذاب کی کیفیت بھی سامعین کے دلوں پر طاری ہوجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر قرآن مجید کی مختصر سی آیت کی تلاوت اور یہ اعلان کہ حضرات، میں نے اس آیت کو سرنامۂ بیان قرار دیا، لوگوں کو چوکنا کردیتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید مذکورہ آیت سے متعلق مفسرین کی شہادتیں، تجزیہ و تقابل اور خطیب کی ذاتی تحقیق سے استفادہ کرنے کا دیر تک اور تفصیل کے ساتھ موقعہ ملے گا۔ مگر ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہوگا۔ آیت کے موضوع پر روشنی ڈالنے کی گنجائش چار پانچ منٹ سے زیادہ نہیں نکل پاتی۔ وہاں سے بچ کر ذاکر کی تقریر علم کلام کے متفرق مباحث کا احاطہ کرنے لگتی ہے اور ان ہی کے چاروں طرف گھومتی ہے۔ مسلمانوں کو دینی معتقدات کا جواز فلسفے کے ذریعے ڈھونڈنے کا شوق سارہا ہے۔ ان کی درس گاہوں کے اعلیٰ نصاب میں کلامی مسائل کو خاص اہمیت کا حامل سمجھا گیا، مثلاً وجود باری تعالیٰ، توحید وجودی، نبوّت کی حقیقت، عالم کا قدیم یا حادث ہونا، روحانیات اور غیر محسوسات کی نوعیت وغیرہ۔ علمائے کرام کے لیے وہ سنی ہوں کہ شیعہ، ان موضوعات پر سلسلہ در سلسلہ گفتگو کرنا نہایت آسان ہے۔ لیکن مجالس عزا میں قباحت یہ ہوتی ہے کہ مذکورہ مضامین سامعین کے سروں پر سے پھسلنے لگتے ہیں۔ عام دلچسپی برقرار رکھنے کی خاطر خطیب کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے فضائل اہلبیت پر مشتمل روایات کا چھینٹا دینا پڑتا ہے۔ آخر میں مصائب

شہدائے کربلا کے بیان پر مجلس ختم ہو جاتی ہے۔ مولانا ظہیر عباس کی مجلس میں سامعین کامل اطمینان کے ساتھ بیٹھتے تھے کہ خشک مضامین کی سماعت سے بالکل واسطہ نہ پڑے گا۔ وہ مباحث کلامی تک آتے بھی تھے تو برجستہ شگفتگی کے سہارے مجلس کو سنبھالے رکھتے تھے۔

عام قاعدے کے مطابق مجلس میں ہوتا یہ ہے، اور یہی مجلس کا خاص وصف ہے کہ خطیب اپنے سامعین کے ساتھ ایک قسم کا مقناطیسی رابطہ جوڑ لیتا ہے۔ اُدھر خطیب کی زبان معجز بیان سے کلمات نکلے اور نیچے سے واہ واہ کا زبردست شور بلند ہوا۔ وہ لوگ جو مثلاً آج کل کے دانش گاہی جلسوں میں کامل خاموشی سے بیٹھنے کے عادی ہیں اور داد کا محل محض مشاعرے کو تصوّر کرتے ہیں، بے اختیار سبحان اللہ کی گونج اور صلوٰۃ کی گرج کے درمیان چپکے سے گھڑی دیکھنے لگتے ہیں۔ مجلس میں سامعین جس قدر داد دیتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں اتنا ہی ذاکر کے جوش بیان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ آخر تک پہنچتے پہنچتے یہ جوش سخت آزمائش بن جاتا ہے۔ اکثر سامعین کی خوبی یہ دیکھی گئی اس کو کمزوری یا کمال جو چاہے کہہ لیجیے کہ وہ جب تک ذاکر سے دو ایک ضعیف روایتیں نہ پڑھوا لیں گے اس کو منبر سے اترنے نہ دیں گے۔ مولانا ظہیر عباس کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہ تھا۔ وہ قرآنی آیات کی تشریح و تفسیر میں استدراک اور فکر و تامل سے کام لیتے تھے۔ خصوصاً ان کی ایک مجلس (۲ : ۳۰) "اے فرشتو، میں زمین پر اپنا خلیفہ نازل کرنے والا ہوں" شاہکار تھی اور لوگ اشتیاق سے سننے آتے تھے۔ ساری مجلس آیت مذکورہ سے شروع کر کے اسی کے مطلب پر ختم کرتے تھے۔ ان کا بیان شروع سے آخر تک مربوط ہوتا تھا، روایتوں کے اخذ و اقتباس میں محتاط تھے، اور تقریر کو مستند روایات کے حدود سے باہر نہ جانے دیتے تھے۔ اس کو مقبول اور کامیاب ذاکر ہونے کی علامت سمجھیے کہ یونیورسٹی کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کے پاس مجلسوں کے بلاوے اور زیادہ آنے لگے تھے۔

جارچے میں عیدین کی نمازوں کی رونق قاری جعفر علی کے زمانے سے مولانا ظہیر عباس کی زندگی تک باقی رہی اور ان کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ موجودہ نسل کی

یادیں آخر دم تک ان کے ذکر خیر سے آباد اور روشن رہیں گی۔ قاری جعفر علی اور مولانا عباس حسین کے وقتوں میں قاعدہ تھا کہ چھولس اور نور پور کی خلقت نماز میں جارچے پہنچتی تھی۔ پھر چھولس میں عید گاہ بن گئی اور عیدین کی نمازیں علیحدہ ہونے لگیں۔ البتہ یہ ہوتا رہا کہ کبھی چھولس میں مولوی کا انتظام نہ ہوا تو خلقت جارچے کی طرف لپک گئی راقم الحروف کو ایک دفعہ کسی عزیز نے علی گڑھ آکر قصہ سنایا کہ اس مرتبہ جارچے میں عید الفطر کی دو نمازیں ہوئیں۔ برادری میں دو فریق ہو گئے، دونوں نے ضد پکڑلی معاملہ کسی طرح طے نہ ہوا۔ وہ جو صلح پسند اور شرمیلے قسم کے حضرات تھے ان بیچاروں کو بڑی دشواری ہوئی۔ برادری کے ایک نہایت ثقہ بزرگ گھر میں چھپ کر بیٹھ رہے اور باہر کہلوا دیا کہ چاندرات سے اسہال کی شکایت ہے، وضو ہر دفعہ ٹوٹ جاتا ہے۔

احمد ظہیر عباس اور ان کے اہل خاندان کے پاس معقول زمینداری تھی۔ دادا صاحب قبلہ کی چھوڑی ہوئی نقد رقم اور کچھ جائداد دہلی میں تھی۔ مولانا پر فارسی کا محاورہ، دنیا خورد و عقبیٰ برد، خوب صادق آیا، یعنی دنیا میں مزے سے گزاری اور عقبیٰ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، مضبوط پکڑے رکھا۔ مرحوم کا سال وفات ۱۹۸۴ء ہے۔ وطن مالوف کی خاک بستر استراحت ہے اور بزرگوں کے پہلو میں ابدی نیند سوتے ہیں۔

قاری جعفر علی نے علمائے دہلی کے ساتھ جہاد کے فتوے پر دستخط کئے تھے۔ مگر باریک قلم سے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ فقہ جعفری کی رو سے غیبت امام میں جہاد لازم نہیں ہے۔ اس عبارت نے جان بچادی۔ اہل برادری پر آن کی نسل کا بہت بڑا احسان ہے۔

●

# بیان یزدانی

گوہر علی، غدر کے بعد جارچے کو خیرباد کہنے والے سب سے پہلے بزرگ ہیں۔ انھوں نے وطن سے جا کر میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی۔ بعد میں ان کے خاندان کے کچھ لوگ لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ محمد مرتضیٰ بیان یزدانی اس خاندان کے چشم و چراغ، یعنی گوہر علی

کے بیٹے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا شمار داغ اور امیر مینائی کی نسل کے جواں سال معاصرین میں ہوتا ہے۔ بیاں نے مذکورہ بزرگوں کی طرح رامپور، حیدرآباد، یا کسی اور دربار کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ میرٹھ میں آزادی کے ساتھ رہے اور اس شہر میں جو وسائل مہیا تھے ان کو غنیمت سمجھا۔ لالہ سری رام مولف "خمخانۂ جاوید" بیاں یزدانی کی قادرالکلامی اور اندازِ بیان کی دل نشینی کے مداح ہیں۔ سر عبدالقادر جب "مخزن" کے مدیر تھے تو انھوں نے بیاں کی شاعری پر ایک مضمون لکھا تھا، پھر ادبی دنیا خاموش سی ہوگئی۔ ادھر کچھ دن پہلے سننے میں آیا کہ ناگ پور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بیاں سے متعلق تحقیقی مقالہ لکھا گیا۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ ہے کہ جو اہل کمال یا فن کار کچھ دنوں کے لیے پردۂ گمنامی کے پیچھے چلے گئے ان کی بازیافت وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہے۔ عمر خیام کو نئے سرے سے اپنا تعارف کرانے میں کئی سو برس تک صبر کرنا پڑا۔

بیاں یزدانی کا نقش عزیزانِ وطن کے دلوں میں ہمیشہ محفوظ رہا اور وہاں لوگوں نے ان کو مسلسل یاد رکھا۔ نسیم احمد، ہمارے ایک بزرگ، میرٹھ میں رہتے تھے، حال ہی میں (۱۹۹۰ء) اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ بیاں یزدانی کی بذلہ سنجی اور قادرالکلامی، خصوصاً علم ابجد پر غیر معمولی گرفت اور برمحل تاریخ گوئی کے قصے اکثر سناتے تھے۔ صفدر علی، رشتے کے حساب سے میرے نانا کے بھائی ہوتے تھے۔ ان کو بیاں یزدانی کی ایک مزیدار نظم یاد تھی، کبھی طبیعت موزوں ہوتی تو روانی اور لطف کے ساتھ پڑھتے تھے اور خوب ہنساتے تھے، دراصل علم عروض میں بحر رمل مثمن مخبون : فَعِلاتن فَعِلاتن، ایک خاص نوعیت کی بحر ہے۔ اس کے ارکان عروضی کی تکرار مقررہ آٹھ دفعہ کی جگہ سولہ دفعہ بھی کی جاتی ہے اس ترکیب سے ایک مصرعہ پورے شعر کی برابر لمبا بیٹھتا ہے۔ ارکان عروضی کے ہموزن کلمات بہت دور تک گولائی کھاتے، دندناتے اور لڑھکتے چلے جاتے ہیں، اس بحر کی نظمیں مزاحیہ مضامین کے لیے مخصوص ہیں، شاعر اپنی شان میں رجز خوانی کرنا چاہے اپنے دشمنوں سے حساب نمٹانا یا حریفوں کی خیریت دریافت کرنا ہو تو یہ بحر خوب مدد کرتی ہے۔ فعلاتن فعلاتن۔ زمانہ گزر گیا، بیسویں صدی عیسوی کا نصف سمجھیے، تہران میں "توفیق"

نام کا ایک ہفتگی رسالہ نکلتا تھا۔ اس کے کارٹون، لطیفے اور منظوم خاکے ایرانیوں کے لیے بڑی دلچسپی، تفریح، اور دل لگی کی چیز تھے۔ اتفاقاً مذکورہ بحر میں توفیق کی ایک نظم کا مضمون ذہن میں رہ گیا، شعر کوئی یاد نہیں۔ موضوع یہ ہے کہ عید نوروز کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایک خانم خوش گل دشنگول، خوب صورت اور موٹی تازی، بازار کی سیر کو نکلتی ہے، چیزوں کا مول تول کرتی ہے، سارے خاندان کے لیے جوتوں کی خریداری کر کے لدی پھندی ٹیکسی سے اترتی ہے۔ پڑوسی بھاگے ہوئے آتے ہیں اور یہ خبر وحشت اثر سناتے ہیں کہ ذراسی دیر ہوئی تمہارے شوہر کا پاؤں حادثے میں ٹوٹ گیا۔ عورت لمحہ بھر سوچ کر اور فیصلہ کر لیتی ہے، میں فی الفور دکان دار کو شوہر کا جوتا واپس کروں گی، اس کے بعد ہسپتال جا کر دیکھوں گی کیا ہوا۔ فَعِلاتن فَعِلاتن۔ بیاںؔ یزدانی کی کہی ہوئی ایک ایسی ہی نظم معاصرین میں بہت مشہور ہوئی۔ ہوا یہ کہ اودھ پنچ کے اڈیٹر سے ان کی نوک جھونک چل پڑی۔ بیاںؔ میرٹھ سے "طوطیٔ ہند" نام کا اخبار نکالتے تھے، پھر ایک رسالہ "لسان الملک" جاری کیا۔ ان کی یہ نظم مذکورہ دو جریدوں میں سے کسی ایک میں قسط وار شائع ہوئی۔ ویسے بیاںؔ کی غزلیں لکھنؤ سے نکلنے والے "پیام یار" میں بھی شائع ہوتی تھیں۔ مجھے ایک شعر کے سولہ ارکان عروضی میں سے فقط چھ ارکان یاد ہیں۔ وہ بھی کچھ بے ترتیب سے۔ آخری دو ارکان کی ہر شعر میں تکرار تھی:

جورکابی کو مروڑوں تو تری طشتری پھوڑوں، ذرا بچ نوک قلم سے۔

بیاںؔ یزدانی کے ایک بھائی، علی اوسط، انیسویں صدی کے اواخر میں بیرسٹری کا ڈپلوما حاصل کرنے لندن گئے تھے، واپس آ کر انھوں نے ہائی کورٹ میں وکالت کی اور میرٹھ چھوڑ کر لکھنؤ میں جا رہے۔ بیسویں صدی شروع ہوئی تھی اس وقت علی اوسط کا شمار معروف بیرسٹروں میں ہوتا تھا۔ جب وہ لندن جانے لگے تو گھر میں تقریب منعقد ہوئی اور تمام خاندان کے لوگ جمع ہوئے۔ بیاںؔ یزدانی نے موقعے کی مناسبت سے نظم پڑھی:

سمجھتا ہے خوبی میں یوسف زمانہ کہیں بھائی لندن میں کھوئے نہ جانا

بیاؔن یزدانی شاعر ہونے کے ساتھ مذہبی عقاید کے معاملہ میں تربیت یافتہ کردار کے انسان تھے۔ نعت و منقبت اور شہدائے کربلا کی عزا سے متلق بیاؔن کی کہی ہوئی ہوئی نظمیں جارچہ چھپلس میں آج تک پڑھی جاتی ہیں۔ گویا وطن کے ساتھ ان کا رشتہ پائندہ و استوار ہے۔ ان کی نظمیں خلوص، صداقت اور جوش کے احساس سے لبریز ہیں، اور ایک دلآویزی ہے جس کو ان کے فن کا پوشیدہ نسخہ کیمیا کہنا چاہیے۔ بیاؔن یزدانی کی ندرت یہ ہے کہ وہ ساقی نامہ کی صنف میں ایک نئی جہت دریافت کرتے ہیں۔ ان کی کوشش سے سانحۂ کربلا کی روئیداد مفصل و مسلسل طور سے ساقی نامہ میں جگہ پاتی ہے۔ یہ پہلا تجربہ ہے جس کی مثال فارسی ادب میں بھی نہیں ملتی۔ جہانگیر کے عہد میں عبدالنبی فخرالزمانی نام کا ایک ایرانی دانش مند ہندوستان میں وارد ہوا۔ اس نے خالص ساقی نامے کو تحقیق و جستجو کا موضوع بنایا اور "میخانہ" کے عنوان سے ایک نہایت دلچسپ کتاب یادگار چھوڑی۔ صوفی شعرا بہت پہلے ساقی نامے کے اندر توحید و نعت کے مضامین داخل کر چکے تھے۔ صفوی دور میں ایران سے مغل دربار کی طرف آنے والے بیشتر شاعروں نے ساقی نامے کو وسعت دی اور منقبت کے مضامین کا اضافہ شروع کیا۔ مگر منقبت کی برکت سے بہرہ اندوزی کے لیے ساقی نامہ سب سے زیادہ اردو کے مرثیہ گو شاعروں کا ممنون ہے۔ مرثیے میں ساقی نامہ کے خوب صورت پیوند لگا کر منقبت کے موضوعات تراشنے کا ڈھنگ انیسؔ و دبیرؔ کے وقتوں سے ایجاد ہوا۔ ان کے جانشینوں نے اس روایت کو اور زیادہ آگے بڑھایا۔ شہدائے کربلا کو ساقی نامے کے ذریعے نذرِ عقیدت پیش کرنا خاص بیان یزدانی کی خاطر ایجاد پسند کا کارنامہ ہے۔

مجموعی طور سے ساقی نامہ کہنے والے شاعروں میں سب سے ممتاز مقام ظہوریؔ کو حاصل ہے۔ وہ اکبرؔ کے عہد میں ایران سے ہندوستان آیا اور بیجاپور دکن کے دربار میں زندگی گزاری۔ ظہوری کا ساقی نامہ چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اور ہندوستانی فارسی ادب کی شاہ کار نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بیاؔن یزدانی

کا ساقی نامہ بھی کم و بیش ہزار شعر کا ضرور ہوگا۔ وہ اردو شاعری کے لیے ایک یادگار تحفہ ہے۔ غالباً ایک دفعہ چھپ بھی چکا ہے: ماہِ محرم آ گیا ساقی۔

ساقی غم کا مہینہ آیا
ماتم سینہ بہ سینہ آیا
شیشۂ مے کو طاق دکھادے
دخترِ رز کو طلاق دکھادے

بیانؔ یزدانی نے سنہ ۱۹۰۰ عیسوی میں وفات پائی، یعنی جس سال یورپ کا مجذوب، فرنگی حکیم نیٹشے، جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔

ہماری تہذیب میں شاعر کے کمال کی اصل کسوٹی غزل ہے۔ دیگر اصنافِ سخن نو در کنار، جملہ فنونِ لطیفہ غزل کے حق میں اپنی دلفریبی سے دستبرداری لکھنے کو تیار ہیں۔ ان سب کی روح ایک ساتھ سمٹ کر غزل کے قالب میں آ گئی ہے۔ بیانؔ یزدانی کی غزلیں ایک طرف ابتدائی اور بنیادی شرائط، یعنی متانت تمکین اور نشاطیہ آہنگ کی مکمل پاسداری کرتی ہیں۔ دوسری طرف شائستگی، تامل اور عرفان و آگہی کی وہ حدیں بھی کچھ دور نہیں رہ جاتیں جہاں پہنچ کر غزل فرشتوں کا آسمانی سرود بن جاتی ہے۔

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا — پھر اس شوخ کو اک نظر دیکھ لینا

...

حوروں سے جا لڑی کبھی پریوں پہ آ پڑی — کس کس سے رشتہ ہے نگہِ پاک باز کا

...

زہرہ کے ساتھ جائیں گے یا مشتری کے ساتھ — سبزِ فلک کو ہم کبھی تنہا نہ جائیں گے

...

نفس گُم اور سخن باقی رہے گا — نہ ہوگا تار اور ہونگے ترانے
جن کے محلوں میں ہزاروں رنگ کے فانوس تھے — جھاڑ ہیں قبروں پہ انکی اور نشاں کچھ بھی نہیں

گر نہ ہو الطافِ یزدانی بیاںؔ کچھ بھی نہیں

•

# عیاںؔ میرٹھی

عیاںؔ، ضیاءالاسلام، بیاںؔ یزدانی کے بھتیجے تھے، باپ کا نام سلطان الحق تھا۔ میرٹھ میں وکالت کرتے تھے۔ جامع فضائل ہے تو ذرا ثقیل اور عالمانہ قسم کی اصطلاح البتہ عیاںؔ کی ذات پر خوب صادق تھی۔ وہ رنگ برنگی شخصیت کے انسان تھے اور طبیعت میں بہت ساری چھوٹی بڑی لیکن سب بے ضرر اور دل کو بھلی لگنے والی خوبیاں جمع کر رکھی تھیں، پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے، شاعری کرتے تھے شیعوں کے بلاوے پر مجالس اور سواد اعظم کی دعوت پر میلاد شریف پڑھنے جگہ جگہ جاتے تھے گل افشانی اور شیریں بیانی سے دنیا کو اپنا گرویدہ کیے تھے۔ شکار کھیلتے تھے، اصیل لڑاکا مرغ پالتے تھے۔ اور مرغ بازی کا شوق رکھتے تھے۔ کوئی شاعر یا مولوی اپنے حریف کے خلاف پمفلٹ لکھوانا چاہے تو خفیہ طور سے اس نازک خدمت کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔ اور ذاتی طور سے ضعف معدہ کی شکایت کے باوجود دوستوں کو شاہانہ غذائیں کھلاتے تھے۔ وکیل کا جی سیاست میں ضرور لگتا ہے اور ہر وقت اکھاڑے میں کودنے کے لیے سوچتا رہتا ہے۔ وہ تھا بھی زبردست گرما گرمی کا زمانہ جب اکبرؔ الٰہ آبادی نے تھوڑے ہی دن پہلے کہا تھا: بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں۔ عیاںؔ اس کو ننانوے فی صد واہیات چکر سمجھتے تھے اور پاس جانا گویا کیچڑ سے آلودہ ہونا تصوّر کرتے تھے۔ محض اتنا سا علاقہ تھا کہ محلّے کی گلیوں میں جلوس گھمانے والا لیڈر چندہ مانگ بیٹھے تو جیب سے رقم نکالنے میں ٹال مٹول نہ کرتے تھے لیکن پکڑا جائے تو اس کا مقدمہ لڑانے سے پرہیز کرتے تھے۔

عیاںؔ کو اپنے عزیزوں سے خصوصاً ننھیالی شاخ کے لوگوں سے بڑی محبت

تھی۔ کوئی جا پہنچا تو تپاک سے ملتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ جس قدر زیادہ خستہ حال اور نور برستی شکل کا آدمی ہوتا اس کو اتنا ہی زیادہ قریبی عزیز بتاتے تھے۔ اس معاملہ میں یہاں تک مبالغہ کرنے کی عادت تھی کہ ایک دفعہ چھولس سے جانی لوہار پہنچ گیا۔ پاؤں میں ادھوڑی کی تاشے بجاتی جوتیاں، دھوتی گھٹنے ڈھکنے سے عاجز، گرمی کا زمانہ تھا، جسم پر گاڑھے کا مختصر سا شلوکا، استرے سے چاند صاف شفاف، خشخشی داڑھی اور ہاتھ میں لاٹھی، عیاںؔ نے دیکھا تو گلے سے لگا لیا، اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے متفرق مجمع سے لگے گھما پھرا کر تعارف کرانے، حسب عادت عزیز بھی بتا گئے۔ جانی علم مجلسی کا ماہر تھا۔ بڑھئی لوہاروں کی پنچایت میں گھنٹوں بولتا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا اور تقریر شروع کردی، کہنے لگا، اجی صاحب، میں سچی بات بتاؤں، یہ میاں کی شرافت ہے جو مجھے عزیز اور بھائی بند بتاتے ہیں۔ میں دراصل میاں کی رعایا ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ بچپن میں ساتھ کھیلا ہوں، اور اب بھی شکار کے موقع پر میاں کے ساتھ رہتا ہوں۔ کبھی ملنے کو جی چاہتا ہے تو آجاتا ہوں، میاں آنے جانے کا کرایہ اور جوتیوں سمیت نیا جوڑا دیتے ہیں۔ اس وقت خادم کا حلیہ دیکھ کر خود سمجھ جائیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کپڑے پھٹ گئے تھے سوچا میاں کے پاس چکر لگانا چاہیے۔ عیاںؔ جو طرز خطاب اور ردِ جواب میں کسی سے دبنے والے نہ تھے جانی کے سامنے خاموش ہو گئے۔

عیاںؔ آغاز جوانی میں کامیاب اور مشہور وکیل بن گئے تھے۔ میرٹھ اور نواحی اضلاع کی قانونی برادری تقاضا کرتی تھی کہ آپ جیسی استعداد کے آدمی کو ہائی کورٹ چلا جانا چاہیے۔ وہ تھوڑا بہت ارادہ بھی کرتے تھے مگر میرٹھ کی مقامی دلچسپیاں پاؤں کی زنجیر بن جاتی تھیں۔ شہرت اور دولت دونوں کا معاملہ ایک سا ہے، یعنی آنے اور جانے کے قواعد و ضوابط محض کتابی، حقیقت اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بس یوں ہی آنا اور یوں ہی جانا : ایں کبوتر سر زمان مشتاق بام دیگر است۔ وکیلوں میں قانون کے پیشے سے متعلق رشک کرنے والی محبوبہ کی تشبیہہ مشہور ہے۔ غور کیجیے تو تمام فنونِ

لطیفہ اس مقولے کے دائرے میں آتے ہیں کام کوئی بھی ہو، کمال تک رسائی مسلسل جدوجہد چاہتی ہے۔ فارسی کے ایک صوفی شاعر کی غزل ہے جس کی ردیف اردو میں ہوئی: سر آنکھوں پر؛ یار نے کہا، ہمارے علاوہ کسی کو نہ دیکھنا، میں نے کہا سر آنکھوں پر: گفت یار از غیرِ ما پوشان نظر گفتم بچشم۔ عیاںؔ کا معاملہ وکالت جیسے گریبان گیر پیشے میں بالکل برعکس اور عجیب تھا۔ ان کی ذات ایک استثنائی نمونہ تھی۔ میرٹھ سے یکایک باہر جانے کی دس وجوہات ہر دم سامنے کھڑی رہتی تھیں: مشاعرہ، مجلس، میلاد شریف، تکرار، مرغوں کا دنگل، پھر بھی نہ تو موکل کبھی شکایت کرتے تھے، نہ سر پیٹتے تھے کہ ہمارے مقدمہ کا کیا ہوگا، اور نہ گھبراکر کسی دوسرے وکیل کے پاس بھاگتے تھے۔ ویسی ہی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ عیاںؔ کے منشی جی بھی تحفے کی چیز تھے۔ موکل اور کچہری کے لوگ ہنستے تھے کہ وکیل صاحب نے خوب چھانٹ کر منشی رکھا ہے تاکہ نظر بد سے بچے رہیں۔ بات یہ تھی کہ عیاںؔ ذاتی طور سے نہایت خوش رنگ آدمی، اور منشی جی ایسے شبِ دیجور کی رنگت کہ بے ساختہ زندہ دل لوگ داغؔ کا مصرعہ پڑھتے تھے: رکھ لیا ہے نظر گذر کے لیے۔

ہمارے چھوس میں ایک بزرگ کا قصہ مشہور ہے کہ دو بیویاں گھر میں تھیں دن رات دونوں کی جوتیاں کھاتے تھے مگر واہ ری ہمتِ مردانہ، کہتے تھے طلاق ایک کو بھی نہ دوں گا، اور واقعی آخر دم تک ایک کو بھی نہ دی۔ وکالت اور شاعری کے ساتھ عیاںؔ کا معاملہ کچھ اسی قسم کا تھا۔ دونوں کی آویزش اور رسہ کشی خاصا ناک میں دم رکھتی تھی۔ عیاںؔ نے، صبر اور سلیقے سے دونوں کو قابو میں رکھا۔ وکالت خالص عملی اور فعال لوگوں کا اور جلبت پھرت کا مزاج رکھنے والوں کا پیشہ ہے یعنی دو اور دو چار کے مشکل حساب میں مار نہ کھانے والوں کو زیب دیتا ہے۔ شاعری قدروں کا پابند بناکر ماورائیت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی خطرناک حد وہ ہے جب آدمی سے دردمند، ذکی الحس، اور محبت کیش بن جانے کا تقاضا کرنے لگے، عیاںؔ خطرے کی حد سے کبھی پیچھے نہ رہے۔ ایرانیوں کا مرغوب تکیہ کلام ہے: از جناب عالی

چہ پنہاں ۔ اور ہمارے بزرگوں کو ایک زمانے میں کہنے کی عادت تھی : درایں چہ شک ؟ پر سچ پوچھیے تو تفریح طبع کے لیے شعر کہنا بڑی اچھی بات ہے ۔ بیشمار لوگ دنیاداری ، مکاری ، اور منافقت کی حرکتوں میں استاد ہونے کے باوجود زندگی بھر شعر کہتے ہیں اور کامیاب شاعر کہلاتے ہیں ۔ مصیبت محض ان کی جان کے لیے ہے جو پوری صداقت کے ساتھ شاعری کو ، زندگی کی اقدار اعلیٰ کا نقیب سمجھیں ، فن کی تقدیس اور برگزیدگی پر ایمان رکھتے ہوں ، اور اس کے ساتھ خلوص سے پیش آنے کی قسم کھالیں ، عیاںؔ کی مثال حجّت و عبرت سے کہیں زیادہ طمانیت کی خاطر یاد رکھنے کے قابل ہے ۔

وہاں روزمرہ کے معمولات میں ناگزیر صورت یہ تھی جس سے ہر وکیل کو نمٹنا پڑتا ہے کہ مقدمہ باز موکل ، شہر کے موٹے تازے معززین ، دیہات کے ہر دم مونچھیں کھڑی رکھنے والے زمیندار اور ان کے پھنپکیت مصاحب ، ضرور آئیں گے اور وقت کی پروا کیے بغیر گھنٹوں گھیرے رہیں گے ۔ آخر جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھمادی ، یہ محفل حقیقی روحانی فرحت اور جانفزا رونق سے بدل جاتی تھی ۔ شاعروں کو معلوم تھا کہ عیاںؔ کے ڈرائنگ روم میں کس وقت داخل ہونا ہے ۔ ذراسی دیر ہوئی اور انھوں نے بتیابی سے فرشی سلام جھکانا شروع کیے ۔ ان کو جھانکتا دیکھ کر سابق مجمع ماحول کی تبدیلی سونگھنے لگتا تھا ۔ اور فوراً رفو چکرّ ہو جاتا تھا ۔

عیاںؔ کے ضابطۂ حیات میں مرغ بازی ، غور کیا جائے تو نہایت کام کی چیز تھی ، تخلیقی فن کاروں کی طبیعت میں بظاہر بے تکی باتیں کسی منطقی جواز کے بغیر اکثر پائی جاتی ہیں ۔ مگر یہاں معاملہ دوسرا تھا ۔ اگر کوئی شخص ایسا جذباتی اور دل کا اس قدر نازک واقع ہوا ہے ۔ کہ غزل کا درد انگیز شعر سن کر یا سنا کر رو پڑے تو یقین جانیے کہ اس کے لیے تھوڑی سی لڑائی کا تماشا ، مار پٹائی کا منظر ، اور خون خرابے کی واردات ، وہ مرغ ہی کا خون سہی ، مقویِ قلب دوا کے طور پر ضروری ہے ۔ یہ بالکل بجا کہ شریف طبع لوگ نرم دل ہوتے ہیں ۔ مگر نرم دلی عموماً نسوانی صفت سمجھی جاتی ہے ۔ مرد پیدائشی حیثیت سے پتھر کی چٹان نہ سہی ۔ پھر بھی تجربات

اور مشاہدات اس سے سخت اور تھوڑا سا ٹھوس بن جانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کے سامنے بھاری منزلیں آتی ہیں اور بار بار ہفت خواں سے گزرنا پڑتا ہے۔ عیاںؔ کو خود ابتدائی زندگی میں سخت کوشی سے سابقہ رہا تھا وہ نوعمری میں یتیم ہو گئے تھے اور خوش حالی کے دن انتظار کے بعد آئے تھے۔ مرغ بازی ان کے الم آشنا دل کا علاج تھی اور باہر سے غمناک داخلیت کی میزان کا پلّہ برابر کیے رہتی تھی۔ شکار کا شوق بھی ایک ردِّ عمل تھا جس کے ذریعے بعض غیر معتدل احساسات کی عارضی روک تھام ہو جاتی تھی۔ عیاںؔ اپنے دلِ گداختہ کی اُفتاد سے جان بچانا اور غمگین فضا سے گریز کر باہر نکلنا سیکھ گئے تھے۔ شکار کے بہانے جنگل میں دور تک پیدل چلنا۔ دھڑا دھڑ بندوقیں چھوڑنا، فطری ردِ عمل کی نشاندہی اور غمازی کرتے ہیں۔ حد سے زیادہ بالیدہ اور غالب میلانات کی تلافی کے لیے دونوں مشغلے کافی وشافی تھے۔ خصوصاً لکھنؤ سے مرغوں کی پالی کی خبر ہمیشہ خوشی کا باعث ہوتی تھی، گویا بارات کا دعوت نامہ آگیا جہاں سب کام چھوڑ کر ضرور جانا ہے۔ آخر آمد رسیں پردۂ تقدیر پدید۔ عیاںؔ کے ڈرائنگ روم کی رونق بڑھانے والا ایک قبیلہ اور تھا جس کا نزول کبھی کبھی ہوتا تھا۔ وہاں مرغ بازوں کو بڑی خاطر تواضع اور عزّت کے ساتھ بٹھایا جاتا تھا ان کا کوئی خلیفہ دلی یا لکھنؤ سے آتا اور شہر میں اس کی آمد کی دھوم مچتی تو عیاںؔ بھی آؤ بھگت میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ خلیفہ ان کے اصیل مرغوں کو دیکھ کر مفید مشورے دیتا تھا۔ کرسی سے نیچے بیٹھ کر ایسی کڑکدار آوازیں نکالتا اور اچھل کود کے ساتھ انگڑائیاں لیتا کہ مرغ بیساختہ غبارہ بن جاتے تھے، اور فوراً پنجوں کے بل لائیں جانے کے لیے لپکنے لگتے تھے۔ اس پر خلیفہ دو چار گالیاں جھاڑتا جو خاص مرغ بازوں کی لغت سے تعلق رکھتی تھیں۔

عیاںؔ کی ماں سعید النسا کا دستور تھا، اور جب تک میرے نانا میر علی احسن وغیرہ زندہ رہے یہ دستور برابر قائم رہا کہ وہ تیسرے چوتھے برس اپنے بھائیوں سے ملنے چھولس آتی تھیں۔ وہاں ان کا ننہیالی کنبہ تھا۔ آخری دفعہ آئی ہیں تو بڑھاپے سے مغلوب

بالکل چراغ سحری معلوم ہوتی تھیں۔ عیاںؔ کے علاوہ ان کے کئی بیٹے تھے۔ وہ صدرالاسلام کے ساتھ لکھنؤ میں رہتی تھیں۔ جارچہ چھولس آنے کا شوق صرف عیاںؔ کو تھا۔ دوسرے نہ آتے تھے یا اگر کسی کا آنا ہوا تو مجھے علم نہیں۔ عیاںؔ کی شادی جارچے میں ہوئی تھی۔ یہ بھی ایک سبب تھا کہ برابر اس طرف آتے تھے۔ میں نے عیاںؔ کو نہیں دیکھا۔ ان کی نسبت سے صرف ایک یاد اندھیری شب میں بیابان کے چراغ کی طرح دور سے ٹمٹماتی ہے۔ ہمارے گھر میں چولھے کے آگے برتنوں کا پانی پت لگا تھا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی برتن ہی برتن میمنہ میسرہ دیگچیوں کا جماؤ اور قلب میں بھاری بھرکم دیگچہ۔ ایسا مفرح منظر میری آنکھوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس موقعے پر عیاںؔ کا نام بار بار سنا یہاں تک کہ ہمیشہ کے لیے یاد ہو گیا۔ لیکن کون سے سال کی بات ہے اور میری کیا عمر تھی، یہ معلوم نہیں، جو تبلاتے وہ زمانے سے اٹھ گئے۔

عیاںؔ ۱۹۳۵ء عیسوی میں دنیا سے رخصت ہوئے تو اٹھتیس برس کے تھے۔ تاریخ ایسی ہستیوں کی ممنون ہے جنھوں نے کارِ جہاں کو دراز سمجھنے کے بجائے مختصر سمجھا اور تشنابی سے رخصت ہو گئے۔ عرصہ گاہِ ہست و بود کا میدانِ عمل آدمی کو قوت و حرکت کی دعوت چالیس سال کی عمر تک دیتا ہے۔ یادگار کارناموں کے لیے جانبازی کی طرف سے مقرر کی ہوئی حد یہی ہے۔ فراغت و عافیت جس رفتار سے زندگی میں داخل ہوگی خون کی حرارت میں کمی واقع ہوتی رہے گی۔ اس کے بعد یہ حقیقت خود بخود روشن ہو جاتی ہے کہ انسانی اور حیوانی وجود کا فرق ختم ہوا۔ شیخ الرئیس ابن سینا کی ہدایت ضرور سر آنکھوں پر کہ زیادہ دن تک زندہ رہنے کی احتیاط کیجیے تو شاید کچھ مفید کام کرنے کے موقعے مل جائیں۔ مگر شیخ کی نظر میں دوئم درجے کے لوگ ہیں۔ غیر معمولی صفات کے افراد جن کو عربی زبان میں نابغہ کہتے ہیں، شیخ الرئیس کی نصیحت کے دائرے میں نہیں آتے۔ افکار کی دنیا کا معاملہ بھی بشمولیت فنونِ لطیفہ عین اسی نوعیت کا ہے کہ آدمی چالیس سال میں عروج طے کر چکا ہوتا ہے اس کے بعد محض تکرار رہ جاتی ہے منشائے حیات پورا ہو گیا تو مزید جینا ایک بڑا سا سوالیہ نشان ہے؟

مظلوم شامِ غربت کب تیری جان نکلی
گردوں پہ نجم آخر جس وقت ڈوبتا تھا

میں اور قیامِ دنیا مجبور تھا عیاں دل
ان کی خوشی تھی ورنہ جلنے میں کیا دھرا تھا

●

# بَدرالاِسلام

بَدرالاسلام، منصَبیہ عربی کالج میرٹھ میں فارسی کے استاد تھے اور عربی فارسی کے کلاسیکی ادبیات پر محکم دسترس کے لیے مشہور تھے وہ. جو ایک محاورہ ہے: بُودہم پیشہ باہم پیشہ دشمن، اس کی زد میں درس گاہوں کے استاد بھی آتے ہیں. حسنِ اتفاق سے مولانا بدرالاسلام کا شمار مستثنیات میں ہوتا تھا. ان کی ذات کو کبھی کسی نے اعتراض کا ہدف نہ بنایا، نہ کمزوریوں پر نگاہ ڈالی اور نہ مذاق اڑایا. میرٹھ شہر میں اور دوسرے مقامات پر ان کے احباب اور معتقدین کا حلقہ خاصا وسیع تھا. سَب متفقہ طور سے ان کی نیکی اور شرافت کا اعتراف کرتے تھے. مولانا قناعت کے ساتھ ایک مدت تک منصَبیہ عربی کالج میں پڑھایا کیے. انھوں نے اپنی طرف سے کسی کو مدِّ مقابل اور حَریف بننے کا موقعہ نہ دیا اور نہ کسی سے رشک و رقابت کا قضیّہ کھڑا کیا. آدمی کی زندگی میں نشیب و فراز ضرور آتے ہیں، لیکن بدرالاسلام نے شائستگی، تحمّل، اور احتیاط کے اصول کبھی ہاتھ سے نہ دیے.

میرٹھ میں منصبیہ عربی کالج شیعوں کا نہایت ممتاز تعلیمی ادارہ تھا. ویسے تو وہاں دینی تعلیم پر زور تھا. مگر نصاب میں کچھ اس انداز کی گنجائش رکھی گئی تھی کہ لڑکوں میں عہدِ جدید کے مسائل کا مناسب شعور بیدار ہو جائے اور کالجوں میں پڑھائے جانیوالے مضامین و موضوعات سے بیگانۂ محض اور خالی الذہن نہ رہیں. سر سیّد کی تحریک اور انگریزی پڑھنے کی تاکید کا ایک مفید اور مستحسن ردِّعمل علمائے دین کے حلقے میں یہ ہوا، جس کو لوگ اب بھولتے جا رہے ہیں، کہ قدیم روایتی مدرسے جو اُن کے قبضے میں تھے اور

جن پر عموماً دارالعلوم کا رعب داب عنوان ضرور چسپاں رہتا ہے، معیار کی اصلاح و ترقی پر خاص توجہ دینے لگے۔ مدرسوں میں تدریس کی سطح بلند ہوئی اور نظم و ضبط میں بھی بہتری آئی۔ منتظمین نے سوچا کہ ہمارے ادارے جدید رنگ روغن کے کالج معلوم ہوں تو اُن کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا، ورنہ کم از کم کساد اور بحران سے بچے رہیں گے مطلب یہ کہ انگریزی کے طوفان میں جس ترکیب اور کرتب سے بھی روک لگے اچھا ہی ہے مدرسوں میں پڑھانے والے اساتذہ، یعنی مولوی صاحبان کو بھی اپنے اوقات و اطوار میں ترمیم کا احساس پیدا ہوا۔ وہ مطالعہ پہلے بھی کرتے تھے، لیکن نئے زمانے کا اثر سمجھیے کہ ان کی جماعت میں کتاب کے ذریعے ذہنی تربیت کا رواج نمایاں طور سے بڑھا۔ منصبیہ کالج کے اساتذہ زمانے کی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے کردار میں معاشرے کی پیچیدگیوں سے نمٹنے کے لیے پختگی پیدا کر لی، پہلی بات، نیت سالم اور منزل آسان کی کہاوت کے مطابق، وہ عالم ہونے کے ساتھ نہایت نیک سیرت لوگ تھے۔ ان کی مشترکہ خوبی مزاج کی سادگی، انکسار اور ضمیر کی پاکیزگی تھی۔ واقعی طور سے وہ اس میزان و مصداق پر پورے اترتے تھے کہ علماء کا وجود درد و الم کی ستائی ہوئی دنیا کے لیے خیر محض ہوتا ہے اور اُن کی بدولت آسمان سے رحمت و برکت کے نزول کی راہ کھلی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں علی الخلوص مولانا بدرالاسلام کا ذکر خیر ہے۔ ان کی ذات صالح خصلتوں کا مجموعہ تھی جس قدر اسلامی علوم سے متعلق ان کی معلومات مسلّم اور معتبر تھیں اتنا ہی لوگ ان کے اخلاق اور وضعداری کے بھی مدّاح تھے۔

عربی مدرسوں کے متعلق یہ تصوّر عام ہے کہ وہاں مفلس اور مفلوک الحال بچے پڑھتے ہیں۔ واقعہ بھی ہے کہ عموماً مدرسوں کے قبضہ میں کچھ اوقاف اور آمدنی کے دیگر وسائل ضرور ہوتے ہیں جن کو لڑکوں کے کھانے اور کتابوں وغیرہ کی مد پر خرچ کیا جاتا ہے۔ بعض مدرسوں میں یہاں تک رواج ہے کہ عید کے موقع پر ایک ایک جوڑا کپڑے بھی لڑکوں کو بانٹے جاتے ہیں۔ مگر یہ قاعدہ کلیّہ نہیں

ہے۔ سرسیّد کی تحریک کے باوجود مسلمانوں کے دونوں فرقوں میں، یعنی سنیّوں میں اور بہ تناسب شیعوں میں بھی، ایسا طبقہ ہمیشہ رہا، اور وہ اقتصادی اعتبار سے گرا پڑا نہیں بلکہ خاصا خوش حال تھا۔ جو قدیم علوم کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتا تھا۔ سرسیّد کے تعلیمی مشن کی کامیابی پر ڈپٹی نذیر احمد کا ایک جملہ بڑا جاندار ہے: "مسلمان جو ٹھوں پر ہاتھ نہ رکھواتے تھے کان نہ ہلائے اور نتھل جڑ ولیے"۔ اصل بات یہ ہے کہ انگریزی سے بدکنے کی عادت بالکل ختم نہیں ہوئی تھی، مسلمانوں کے اکثر خاندانوں میں، اور ان میں متمول لوگ بھی شامل تھے، یہ روایت عام تھی اور اس پر عمل ہوتا رہا کہ مثال کے طور پر گھر میں دو لڑکے ہیں تو ایک کو انگریزی پڑھائی جائے گی، دوسرے کو دینی مدرسے کا راستہ دکھایا جائے گا۔ خصوصاً بڑی بوڑھیوں کا اصرار ہوتا تھا کہ گھر میں علم دین پڑھنے کا رواج ضرور باقی رہنا چاہیے اور ان کی بات مانی جاتی تھی۔ منصبیہ عربی کالج جب سے قائم ہوا، سال تاسیس مجھے ٹھیک یاد نہیں اور جب تک باقی رہا، یعنی تقسیم ملک کے فوراً یا ذرا بعد تک، کوئی یتیم خانہ قسم کا مدرسہ نہ تھا۔ سادات بارہہ کے رئیسوں اور بعض سربرآوردہ زمینداروں کے بچّے بھی وہاں پڑھنے آتے تھے اکثر طالب علموں کا رہن سہن اور بورڈنگ کا میعار ایسا ہی تھا جیسا کہ کالجوں کے لڑکوں کا ہوتا ہے۔ اساتذہ کو تنخواہیں بھی معقول ملتی تھیں، جو ذاکری کے فن سے واقف تھے وہ اُوپر سے کماتے تھے۔ جارجہ چھولس کے بلشیتر لڑکوں کا جمگھٹ منصبیہ میں رہتا تھا۔ حالانکہ ایسے لوگ جو معمولی سے ذرا زیادہ استطاعت رکھتے تھے اگر چاہتے تو اپنی اولاد کا رخ اسکول کالج کی طرف بھی موڑ سکتے تھے۔ معاملہ وہی دینی علوم سے جذباتی وابستگی اور علمائے کرام سے عقیدت مندی کا تھا۔ بدرالاسلام ذی حیثیت خاندان کے فرد تھے۔ مگر گھر والوں نے روایت کی پاسداری اور پابندی ملحوظ رکھی۔ اور اُن کو مولویت کی ڈگر پر ڈالا گیا۔

مولانا شعر کہتے تھے اور شایاں تخلص رکھتے تھے۔ منصبیہ کالج کے ماحول میں اور دوسرے دینی مدرسوں میں ایک فرق واضح تھا۔ یعنی وہاں ادبی ذوق کی

سیرابی اور اظہار میں استادوں کو کھلی آزادی تھی اور متعدد اساتذہ موزوں طبع واقع ہوئے تھے۔ اگر دوستوں کی مخصوص نشست ہوئی اور ان سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی تو تکلّف نہ کرتے تھے۔ البتہ عام اور بڑے پیمانے پر منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کا قاعدہ بالکل نہ تھا۔ دوسری دینی درس گاہوں میں، شیعوں کی ہوں یا سنیوں کی، اس قسم کی روایت سننے میں نہ آتی تھی۔ مثال کے طور پر دیوبند کے کسی باذوق عالم سے محض اس قدر توقع کی جاسکتی تھی کہ عید میلادالنبی کے جلسے میں نعت پڑھ دے گا اور بس۔ یہ قطعاً امکان سے بعید تھا کہ سرمہ لگاکر رات کے وقت مشاعرے میں عشقیہ غزل سنائے اور صبح کو بخاری شریف کا درس دینے پہنچ جائے۔ لکھنؤ اور جون پور وغیرہ کی شیعہ درس گاہوں کے اصول وضوابط بھی ایسے ہی بے لچک تھے۔ یعنی علمائے دین اور مجتہدین کرام کے نزدیک شعروسخن سے برملا دلچسپی کبھی کوئی اچھی بات نہ سمجھی گئی۔ اس کا تاریخی سبب تھا اور خنّاس بے جا نہ تھا۔ لکھنؤ میں جرأت اور انشاؔ جیسے شاعروں کے زمانے سے یہ فن اس قدر ابتذال اور پستی کی طرف چلا گیا کہ علما کو اس سے اپنی لاتعلقی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ شاعری ان کے شایانِ شان نہ رہ گئی تھی اور وہ اس کا داخلہ اپنے سنجیدہ حلقوں میں ممنوع قرار دینے پر مجبور ہوگئے تھے۔ البتہ بعض علمائے دین کی بابت عجیب بات مشہور ہے کہ خود شعر کہتے تھے مگر براہِ راست اپنے نام سے منسوب کرنے کے بجائے چپکے سے دوسروں کو پکڑا دیا کرتے تھے اور لکھنؤ کے کچھ شاعروں کی شہرت ان کے پوشیدہ کمال کا عطیہ ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ میرٹھ کا معاملہ تقسیم ملک سے پہلے تک ذرا سا غنیمت تھا۔ وہاں شاعروں نے ایک دوسرے کی ہجو اور مذمت کا طوفان اٹھاکر رائے عامہ کو اپنے خلاف یقیناً کر رکھا تھا، پھر بھی اس قدر بدنام اور رسوا نہ ہوتے تھے کہ شریف لوگ اپنے پاس بٹھانا گوارا نہ کریں۔ ذرا سا بھرم باقی تھا۔ شاعری کے شائقین دانش مندوں کی صحبت سے فیض اٹھانا اور ان سے فن کے رموز ونکات پوچھنا لازم سمجھتے تھے۔ اس قبیل کا مجمع کبھی کبھی مولانا بدرالاسلام کے پاس بھی نظر آتا تھا

مشاعرے میں کسی نوجوان شاعر کی غزل بہت چمکتی اور بھڑکتی تھی تو اس کے حریف خصوصاً لڑکے آپس میں قیاس دوڑاتے تھے کہ ظالم کس سے لکھوالیا۔ ایسے موقعوں پر مولانا کا نام ضرور لیا جاتا تھا کوئی اصلیت ہو نہ ہو۔ وجہ یہ کہ میرٹھ میں ان کے کمالات کا سب کو علم تھا۔ جرار چھولسی نے تبرکاً مولانا کے دو شعر عنایت کیے۔ پہلا شعر ایک پاک مشرب دیندار اور مردِ مومن کے احساسات کا ترجمان ہے بخیال عام، لیکن اتنا اہم ہے کہ ہر صاحبِ دل اور صاحبِ ایمان کے ضمیر کی آواز سمجھیے، جسے کوئی آخری دم تک نہیں بھولتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی تمنا دمِ آخر رفیق رہ جاتی ہے۔

شایانِ غریقِ بحرِ معاصی کہیں نہ ہو اس کی طرف بھی رحمتِ غفار دیکھنا

ذیل کے شعر کی معنویت اور تہ داری اہلِ ذوق کو ضرور محظوظ کرے گی صنعتِ مقلوب کی تعریف علم بلاغت میں یہ ہے کہ الفاظ وہی، مگر ان کی الٹ پلٹ سے معانی دیہاتیوں کی کہاوت کے قریب پہنچ جائیں۔ کبھی گاڑی ناؤ پر اور کبھی ناؤ گاڑی پر۔ شعر حیرت و عبرت کے دو منظر پیش کرتا ہے (پہلا منظر) بیابان لاتمناہی پکارتے تھے کہ حوصلہ ہے تو کچھ خاک اڑاؤ۔ میں سینہ سپر رہتا تھا اور کسی وقت ہمت عالی کے اعتماد میں کمی نہ آتی تھی۔ خاک اڑانا طنزیہ مفہوم کی طرف رجوع کرتا ہے۔ (دوسرا منظر) انجام کا علم ہوا تو نقشہ بدل گیا اور اس انکشاف نے جان خشک کر دی کہ ہم سب کا وجود، افراد اور تہذیبوں سمیت، دائرۂ کن فیکون کی گردشوں میں اسیر ہے: دونوں کے مشاہدے سے ایک خیال ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان شکستِ ناپذیر قوتوں سے نبرد آزما ہے جو اس کو عاجزی کے اعتراف پر مجبور کر دیتی ہیں۔

پہلے میں خاک اڑاتا تھا بیابانوں کی اب مری خاک اڑاتے ہیں بیاباں الٹے

•

## شمس الاسلام

شمس الاسلام، مولانا بدرالاسلام کے بھائی تھے اور میرٹھ میں رہتے تھے۔

فطرت کس قدر فیاض ہے اور اس کے نظام میں عطا و انصاف کا قاعدہ کیسی باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے، اس حقیقت کا اندازہ بعض اوقات دو بھائیوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اگر اتفاقاً ایک کی ذات میں کچھ خوبیوں کی کسر رہ گئی تو وہ دوسرے کو بخش دی جاتی ہیں۔ یعنی فطرت کی طرف سے میزان کل بگڑنے نہیں دی جاتی۔ شمس الاسلام غیر معمولی زندہ دل، بذلہ سنج اور نکتہ آفرینی کے ماہر واقع ہوئے ہیں۔ گویا اپنے بھائی کی متانت، کم آمیزی، شرمیلے پن اور عزلت گزینی کا حساب برابر کرنا ان کے نزدیک ایک مجبوری اور ناگزیر ضرورت تھی۔ میرٹھ چھاؤنی غدر کے وقتوں سے اہم فوجی مرکز ہے۔ آزادی سے قبل وہاں کے امور عامہ کا انتظام، مثلاً صفائی، صحت، روشنی وغیرہ، انگریز فوجی افسر کی نگرانی میں چلتا تھا اور اس کے دفتر میں جو بورڈ کہلاتا تھا۔ جارجہ چھولس کے کئی افراد کلیدی عہدوں پر مامور تھے۔ شمس الاسلام بھی وہیں معقول حیثیت کے ملازم تھے۔ وہ سب مل کر پرانے دستور کے مطابق وطن کے نیم خواندہ یا بالکل ناخواندہ لوگوں کو چھوٹی موٹی متفرق ملازمتوں پر چپکاتے رہتے تھے۔ اس طرح تقسیم ملک سے قبل میرٹھ میں جارجہ چھولس کی خلقت کا مجمع نظر آتا تھا۔ اور کہیے کہ خوب رونق تھی۔ علم جمالیات کے سپاٹ ضابطوں کی رو سے شمس الاسلام کچھ خوب صورت آدمی کہلانے کے مستحق نہ تھے، ان کا قد و رمیانہ تھا۔ اگر مردانہ وجاہت تھی تو ہمارے ایک دوسرے بزرگ اور ان کے معاصر، نسیم احمد کے حصے میں تھی۔ البتہ جیسے شیکسپیئر کی زبان کے متعلق مشہور ہے کہ قواعد سے قطعی انحراف کرتی ہے پھر بھی بہت اچھی لگتی ہے، تقریباً ایسی ہی بات اور ایسی ہی دل کشی شمس الاسلام کی وضع قطع میں تھی کہ جواب نہ تھا اور تھا بھی تو کم۔ وہ عادتاً نہایت خوش پوشاک اور زرق برق رہنے والے آدمی تھے۔ شیروانی پہنتے تھے اور سر پر ترکی ٹوپی جس سے نئی نسل اجنبی ہو چکی ہے۔ جوتے کی چمک دمک ایسی کہ علی گڑھ کا پرانا طالب علم دیکھتا رہ جائے۔ میرٹھ کے خوش فکروں کی مجلس میں ہر جگہ ان کی پذیرائی ہوتی تھی۔ اب باغ و بہار آدمی جو سوکھی اور مرجھائی طبیعتوں کو شگفتہ و تازہ کر دینے کے ہنر سے

واقف ہو، ہمیشہ رونقِ محفل بنا رہتا ہے۔ شاید ان کو تعطیل کے دن بھی گھر میں بیٹھنے کی مہلت کم ملتی تھی، اس کے باوجود ان کا قاعدہ تھا کہ مہینہ بیس روز بعد باری باری اپنے عزیزانِ نزدیک و دور سے ملنے اور خیریت پوچھنے جاتے تھے۔ میرے پھوپا ڈاکٹر زمرد حسین کے گھر جہاں میں رہتا تھا۔ ان کا حسبِ معمول آنا ہوتا تو مجھے دیکھ کر خصوصیت سے خوش ہوتے تھے۔ میں ایک طریقہ سے کہنا چاہیے کہ ان کے ہاتھ کا لگایا ہوا جنگلی درخت کا پودا تھا جو دیر میں بڑھتا ہے مگر مضبوط ہوتا ہے، نازک نہیں ہوتا اور زیادہ دیکھ بھال نہیں چاہتا، نہ کھاد پانی کی ضرورت، نہ بھیڑ بکری کا خدشہ، بس چپکے چپکے اوپر کو ابھرتا رہتا ہے۔ میرٹھ کو روانگی کے وقت میرے باپ نے ضمناً کچھ یوں ہی سا تبلا دیا تھا کہ شمس الاسلام میرے بچپن کے دوست ہیں، ڈاکٹر زمرد حسین نے ان سے کہلوا دیا، وہ مقررہ وقت پر پہنچ گئے، فیضِ عام اسکول کے بعض اساتذہ ان کے دوست تھے۔ راحت علی بھی کہیں سے گھومتے پھرتے آ گئے۔ دونوں ایسے گہرے یار تھے جیسے فارسی محاورے میں "ولی را ولی می شناسد" کہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے فیض عام اسکول میرٹھ میں پانچویں کلاس میں داخل کرا دیا۔ میرے باپ کا کوئی سگا بھائی نہ تھا۔ ان دونوں کو میں نے واقعی طور پر چچا سمجھا اور ان کے احسان کا خیال، ہمیشہ دل میں محفوظ رکھا۔ ان کی بدولت میری باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا جس کے آثار ہمیشہ سے، یعنی ابتدا ہی سے نہایت مشکوک تھے۔

شمس الاسلام مہذب اور شائستہ مذاق کا سلیقہ جانتے تھے جو کیمیا سازی کی طرح دشوار کام ہے۔ اس کی نوعیت طنز، مضحکہ، پھبتی، ہجو، تعریض و تشنیع، اور مذمت ملامت، سب سے الگ ہے۔ وہاں شرط اول یہ ہے کہ روئے سخن کبھی کسی کی طرف نہ ہو، کسی کو موضوع یا نشانہ بنا کر کچھ نہ کہیے۔ زبان کے نشتر سے کسی کا دل مجروح نہ کیجیے، تحقیر و تذلیل کے بجائے درگزر اور رواداری سے کام لیجیے، یہ خیال ہرگز پاس سے نہ گزرے کہ دوسروں کی کمزوریاں تاک کر ان پر ہنسیں گے، بدنام کرینگے ہو سکا تو مٹی پلید کر کے چھوڑیں گے۔ یہ شرط اس وقت پوری ہوتی ہے جب یا تو خداداد

شرافت، دردمندی، اور باطنی پاکیزگی کی نعمتوں سے دل کی دنیا مالامال ہو، اور یا کسی درویش کی خدمت میں رہ کر صلح کل، عالمگیر محبت، اور احترام بشر کی تعلیم حاصل کرنے کا اتفاق ہو جائے۔ شمس الاسلام کا دستور تھا کہ کبھی کبھار کسی کو مضحکہ خیزی کا موضوع بنانا ہوتا تھے تو خود اپنی ہی ذات کو بناتے تھے۔ وہ شخصی شکوہ وشکایت اور افراد کے خلاف طعن وتضحیک کی عادت سے بالکل پاک صاف تھے۔ ایسی محدود گنجائش میں محض لطیفوں کے ذریعے وہ ماحول پیدا کرنا کہ حاضرین کے قہقہے بیٹھک کی چھت پھاڑ کر باہر نکلنے لگیں اور لڑکے شرما کر دور بھاگیں، واقعی کمال کی بات ہے۔

●

## محمد صفی رضوی، قمر الاسلام، فخر الاسلام

محمد صفی رضوی کا تعلق گوہر علی کے خاندان سے تھا اور میرٹھ میں سکونت تھی۔ صفدر علی کبھی میرٹھ کی سیاحت پر نکلتے تو جب واپس پہنچ کر چچا صفی سے ملاقات کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ بالزک کا ایک ناول بعض لوگوں نے پڑھا ہوگا جس کا ہیرو ایک سپاہی ہے۔ وہ کچھ دن نپولین کی فوج میں رہتا ہے اور پھر گھٹنے پر ذرا سی چوٹ کھا کر اپنے گاؤں بھاگ جاتا ہے۔ وہاں اس کا مشغلہ یہ ہے کہ آتشدان سلگا کر رات بھر دیہاتیوں کو نپولین کی لڑائیوں کے مزیدار قصے سناتا ہے۔ آخر برسوں گزر جاتے ہیں اور سپاہی بوڑھا ہو جاتا ہے مگر نپولین کے قصے ختم نہیں ہوتے۔ ویسی ہی کیفیت میرٹھ کی مسافت کے بعد صفدر علی کی ہوتی تھی۔ ملاقات گھنٹہ بھر یا دو گھنٹے رہی ہوگی، تفصیلات کئی دن جاری رہتی تھیں۔ میں بچپن میں سمجھتا تھا کہ صفدر علی جو میری ماں کے چچا تھے ان کے بھی کوئی چچا ہوں گے۔ میرٹھ جا کر رہنے لگا تو معلوم ہوا واقعی وہ ایک معروف بزرگ ہیں اور سب لوگ ان کو چچا صفی کہتے ہیں۔ ان کے ایک بیٹے ڈاکٹر قمر الاسلام تھے۔

ڈاکٹر قمر الاسلام میرٹھ چھاؤنی کے سول ہسپتال میں ملازم تھے۔ چیف میڈیکل آفیسر

کوئی انگریز ہو گا جو باقاعدہ آنے کے بجائے اتفاقاً کبھی کبھی معائنہ کر کے چلا جاتا تھا وہ اس کے نائب تھے۔ اور ہسپتال کا سارا انتظام ان ہی کے ذمہ تھا۔ انگریزوں کا قاعدہ تھا کہ محنت کرتے تھے اور اپنے ماتحتوں سے بھی محنت لیتے تھے۔ فرق مراتب ملحوظ رکھنے کی ترکیب یہ تھی کہ بذاتِ خود کام کے عوض بڑی تنخواہیں اور ہندوستانیوں کے ساتھ گدھا شاہی سلوک، یعنی گھاس کے علاوہ دانہ ندارد، بس خشک گھاس مل گئی اسی کو غنیمت سمجھیے۔ ڈاکٹر قمرالاسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ صبح سے رات تک مشغول رہنے کے باوجود، ہر وقت تازہ دم نظر آتے تھے، جیسے آگے پیچھے کوئی کام نہ ہو، مکمل بیفکری ہے۔ وہ علی الصبح وارڈ کا چکر لگانے کے بعد مریضوں کو دیکھنے اور نسخے لکھنے بیٹھ جاتے تھے۔ چونکہ میرا عہد نامہ نزلہ زکام سے از مہد تا لحد تک کا ہے، مجبوراً ایک دن ڈاکٹر قمرالاسلام کے پاس جانا پڑا۔ وہاں مردوں سے زیادہ عورتوں کا ہجوم پایا اور دلچسپ صورت حال دیکھنے کو ملی۔ عورتیں بغلوں میں بچے دبائے تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ نرگس کے قانون حجم وفشار کی نزاکت سے اچھی طرح واقفیت رکھتی ہیں۔ بغل کو ذرا سا بھینچا، بچے کی چیخ نکلی، اور ڈاکٹر قمرالاسلام کی کرسی کو برقی جھٹکا لگا۔ ان کا چونک پڑنا قدرتی بات تھی، اور وہ ترجیح کے ساتھ اس قسم کی بلبلاتی مخلوق کو نسخے لکھ کر یکے بعد دیگرے چھٹی کر رہے تھے۔ میری نوبت آئی تو غور سے میری صورت دیکھ کر پوچھا تم کہاں کے ہو۔ میرے منہ سے چھوس نکلا اور انھوں نے اپنی طرف سے چار چہ نور پور کہہ کر نسخہ لکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ نہ بھولے۔ اکثر و بیشتر ہمارا آمنا سامنا ہسپتال کے سامنے والی سڑک پر ہوتا تھا۔ میں کالج میں داخل ہوتے ہی بہت سی باتیں سیکھ گیا تھا۔ ایک یہ کہ سائیکل پر تیز رفتار سے گزرتے ہوئے آدمی کی طرف سلام کیسے پھینکا جاتا ہے۔ وہ فوراً بریک لگاتے تھے۔ میں جلدی سے ان کے پاس تک بھاگ کر دوبارہ سلام کرتا تھا۔ اب کی دفعہ میرے سلام کا بنیترا دوسرا ہوتا تھا۔ وہ شفقت سے مسکراتے اور سائیکل کی رفتار پھر تیز ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر

قمرالاسلام کی حسب معمول مسکراہٹ اور اپنی حقیر بساط پر ان کی وہ مشفقانہ نظر ہمیشہ یاد رہے گی۔

...

فخرالاسلام، محمد صفی رضوی کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہائی اسکول پاس کر کے میرٹھ کالج میں پڑھنے پہنچا۔ (سنہ ۱۹۴۴ عیسوی) تو وہ وہاں پچھلے چار پانچ برس سے انگریزی پڑھاتے تھے۔ خوش قیافہ نوجوان تھے، چہرے پر لفراطی رعب اور خشک سنجیدگی کا دور تک پتہ نہ تھا، گریجویٹ یا زیادہ سے زیادہ پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کے طالب علم معلوم ہوتے تھے۔ کالجوں میں یہ قاعدہ تھا اور شاید ابھی تک ہے کہ استاد کو اوّل دن سے احتراماً پروفیسر کہتے تھے۔ اور اس خیال سے درگذر کیا جاتا تھا کہ یونیورسٹی میں لکچرر کو پروفیسر کی منزل تک پہنچنے کے لیے کم و بیش پندرہ بیس سال لگتے ہیں۔ میرا پروفیسر فخرالاسلام سے ملنے کے لیے بہت زیادہ جی چاہا۔ مگر ایک تو یہ کہ میں اپنی اوقات جانتا تھا اور بے جھجک قسم کا آدمی نہ تھا دوسرے انٹرمیڈیٹ سال اوّل کے طالب علم پر پنچاتنترا کی وہ کہانی بالکل صحیح بیٹھتی ہے کہ ایک گیدڑ اپنے اصلی جنگل سے نکل کر کسی دوسرے جنگل میں جا پہنچا۔ وہاں اس کی حالت یہ تھی کہ طرح طرح کے جانوروں سے ڈر کر دن بھر دُم دبائے دور دور بھاگتا پھرتا تھا۔ آخر میں اپنے ایک عزیز کے پاس گیا جن کو سجّاد صاحب نے لائبریری میں اردو کا کیٹیلوگر بنا کر رکھ لیا تھا۔ انھوں نے کہا تم میرے پاس روز آیا کرو، فخرالاسلام ہفتے میں ایک دفعہ ضرور لائبریری آتے ہیں۔ میں تم کو ملواؤں گا۔ مگر طبیعت پابندی کی ہمیشہ سے عادی نہ تھی، روزانہ جانے میں ڈھیل ہوگئی اور ملاقات کا پروگرام رہ گیا۔ کالج میں پہلے سال کے طالب علم اور استاد کے درمیان جو قدرتی قسم کی خلیج ہوتی ہے اس پر پل بنانا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے لائبریری میں گھومتا دیکھ کر سجاد صاحب کا چشمہ ناک پر کئی دفعہ نیچے اوپر ہوتا تھا، یہ گویا مجھ پر نگرانی رکھنے کا ایک قاعدہ تھا۔ وہ دوسرے عزیز اور بھی زیادہ توجہ سے کام لیتے تھے اور جس طرح پرانا کبوتر باز نئے کبوتر کو پکڑنے

کے لیے دانہ پھینکتا ہے، وہ اردو کی کتابیں میری طرف بڑھا کر کہتے تھے: میرے پاس یہیں بیٹھ کر پڑھتے رہو۔ مجھ میں اس خراب عادت کے جراثیم آہستہ آہستہ داخل ہو رہے تھے جو آگے چل کر بڑی بیماری بن گئی، یعنی نصاب کی خاص الخاص کتابوں سے جی چرانا اور اپنے مضمون سے باہر ہر طرح کی کتاب دیکھتے ہی آنکھوں سے لگا لینا۔ ایک دن ہمارے بزرگ نے پروفیسر فخرالاسلام کے افسانوں کا مختصر سا مجموعہ "کشمکش" نکال کر دیا۔ میں نے کشمکش کو شوق اور دلچسپی سے پڑھا اور ایک مطلب فوراً سمجھ میں آگیا، حالانکہ اس وقت تک فرائڈ کا نام بھی نہ سنا تھا۔ مطلب صاف یہ نکلتا تھا کہ مصنف عنفوان شباب کے مرحلے میں ہے۔ جدید مغربی مفکرین کی صف میں دو باتوں کی وجہ سے فرائڈ کو مستقل مقام حاصل ہے۔ ایک تو وہ کہتا ہے کہ انسانی شخصیت کے مجموعی اظہار اور پورے بناؤ بگاڑ میں جنسی میلانات کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آدمی ارتقا کے باوجود وحشی جانوروں کا قریبی رشتہ دار ہے۔ اور وقت کے بے شمار فاصلے اپنی جگہ سہی پھر بھی پرانا تعلق پوری مضبوطی کے ساتھ قائم ہے۔ تہذیب کو ایک باریک چھلکے سے زیادہ نہ سمجھیے، عقل جبلّت کے آگے عاجز ہے۔ فرائڈ کی بات جہاں مذہبی مسلّمات کی نفی اور اخلاقی تصورات سے ٹکراؤ کی صورت پیدا کرتی ہے وہاں شاعری کو بھی نہیں بخشتی۔ پروفیسر فخرالاسلام کا معاملہ یہ تھا کہ فرائڈ جو کچھ بھی کہتا ہے دیکھا جائے گا، ہم افسانے لکھیں گے اور شعر کہیں گے بشرطیکہ چراغ ہوا کے سامنے جلتا رہے۔ دنیا میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں، عمر خیام اور غالب پر کیا منحصر، جنھوں نے خود لمبی عمریں پائیں اور دوسروں کو ہمیشہ کم فرصتی کے احساس سے ڈراتے رہے: یک نفس بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل۔ اس آگاہی کو فخرالاسلام نے سنجیدگی سے سنا اور دل میں اتار بیٹھے۔ انھوں نے اپنے لیل و نہار میں فرصت کو بہت کم داخل ہونے دیا۔ وقت کی قدر دانی کا ثبوت یہ کہ سارے امتحانات محض فرسٹ کلاس نہیں بلکہ پوری آگرہ یونیورسٹی میں پوزیشن کے ساتھ پاس کیے اور نہایت کم عمر تھے جب کالج اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ ایسا نوجوان اپنے دائیں بائیں دونوں آنکھوں کو دعوت دینے والے جلوے نہیں دیکھتا۔ وہ ماہر شکاری سے

یہ نکتہ سیکھ چکا ہوتا ہے کہ ڈیڑھ آنکھ بند کر کے فقط آدھی آنکھ سے نشانہ تا کنے میں لگے رہیے اور ہر نشانہ ٹھیک بٹھائیے۔ انگریزی ادب کا استاد ضرور چاہتا ہے کہ انگلستان کی کسی یونیورسٹی میں کچھ دن گزارے اور تحقیق کرے۔ یہ خیال کبھی فخر الاسلام کے دل میں آیا تو بیجا نہ تھا۔ وہ اس کے مستحق تھے۔ مگر تقدیر بعض افراد کو غیر معمولی امید افزا ماضی ہوتے ہوئے بھی شاندار مستقبل کی طرف نہیں بڑھنے دیتی۔ یہی المیہ فخر الاسلام کے ساتھ پیش آیا بقول میر: عمر نے ہم سے بے وفائی کی۔ عیاںؔ کی بیٹی سلطان جہاں بیگم نے کچھ عرصہ پہلے (سنہ ۱۹۵۶ء) دیوان عیاںؔ شائع کیا۔ تو ایک ضمیمہ فخر الاسلام کے لیے محفوظ رکھا، اس میں ان کے منتخب اشعار بھی ہیں

میں کب کہہ رہا ہوں مجھے یاد رکھو
نہ بھولو تو یہ بھی تمہاری عنایت!

●

# ابنِ حسن جارچوی

ابن حسن جارچوی پیدا ہوئے تو بیسویں صدی کے آغاز کو چار برس گزر چکے تھے اس صدی کا نصف اول برصغیر کی تاریخ میں نہایت فیصلہ کن زمانہ شمار ہوتا ہے۔ یہ دور معرکۂ گیر و دار کی صلائے عام اور جاں فروشی و حق کوشی کی دعوت لے کر نمودار ہوا تھا کیفیت ایسی تھی کہ جس نے بھی کردار کی استقامت کا ذرا سا ثبوت پیش کر دیا وہ ہمیشہ کے لیے یادگار نقوش چھوڑ گیا۔ اکثر صدیاں بڑے آدمیوں کے وجود سے خالی گزر جاتی ہیں حیرت سے سوچتے رہیے کہ چشمے جو خشک ہو گئے کب ابلیں گے۔ اس کے برخلاف وہ زمانے بھی آتے ہیں کہ عظیم اور ممتاز ہستیوں کے ہجوم سے منظر جگمگا اٹھتا ہے اور عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آدمی کا کسی مخصوص دور میں پیدا ہونا یقیناً اہمیت رکھتا ہے مگر روح عصر کی آواز کو بیداری و ہشیاری سے سننا اس سے بھی زیادہ اہم ہے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی ردِّ عمل، رجحانات، اور رویہ روحِ عصر کے تحفے ہیں۔

ابنِ صفی کے سابق سوانح نگار لکھتے ہیں کہ وہ پانچ برس کے تھے جب ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اُن کی پرورش میرٹھ میں ان کے نانا میر حیدر حسن نے کی موت ہر حال میں ایک المناک حادثہ اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مگر کمسن بچے پر یہ مصیبت کہیں زیادہ سنگ آمد و سخت آمد ثابت ہوتی ہے۔ وہ اس کے عواقب ٹھیک سے سمجھتا بھی نہیں، برداشت کرنا تو بعد کی بات ہے۔ مادّی احتیاجات کی کفالت عزیز کر دیں گے مگر معصوم زندگی میں جو خلا پیدا ہوا وہ کسی صورت پر نہ ہو سکے گا۔ اس زمرے کے بچّوں میں ایک آہنی ارادہ پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے، زندگی ان کے لیے آسان نہیں ہوتی، ہر قدم امتحان ہے۔ بعض اوقات ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچنے میں برسوں لگتے ہیں۔ پھر بھی اس خطرے سے مفر نہیں کہ جدوجہد کے باوجود جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ یہ سوال سرخ نشان کی طرح ابتدا سے سامنے رہتا ہے کہ اوّل درجے کی استعداد پیدا نہ کی تو اس تنازعِ بقا کی دنیا میں کون جینے دے گا۔ خوش نصیب بچّوں کی اور بات ہے کہ دویم درجے کی سطحی صلاحیت کے باوجود والدین کے وسائل اعلیٰ تربیت اور محفوظ مستقبل کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ اگر فرض کیجیے بالکل گئی گزری صورت ہو تب بھی والد صاحب قبلہ کا یہ خیال قطعی باطل نہ سمجھیے کہ صاحبزادے کے مغز میں کم از کم فربہ گدھے کے بقدر بھی سوجھ بوجھ نہ ہو گی، اور سو رہی ہے تو جوتے کی کرامات بنگیک جگا کر چھوڑے گی۔ مطلب یہ کہ آسائشوں اور نعمتوں کی موجودگی دونوں طرف لے جا سکتی ہے۔ لیکن محرومیوں کے عالم میں آنکھ کھولنے والے بچوں کے سروں پر ستارۂ بلندی بیشتر چمکتا ہے۔

ابنِ صفی نے اپنے شفیق نانا کی سرپرستی میں فیضِ عام ہائی اسکول میرٹھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو یورپ میں پہلی جنگِ عظیم ختم اور وہاں کی مہذب اقوام کے درمیان مالِ غنیمت کی تقسیم پر بدنیتی، دغا بازی، اور خفیہ معاہدوں کی گرما گرمی شروع ہو چکو

تھی۔ شمالی ہندوستان میں اس وقت تک اوّل تو دس جماعت پاس شدہ انگریزی پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ دوسرے، جنگ عظیم نے روزگار کے دروازے عارضی طور سے ہی سہی خوب کھول دئے تھے۔ وہ زمانہ تھا جب کوئی کلرک کے درجے سے بھی بھرتی ہو گیا تو رٹائر ہونے تک اپنے محکمے کا چھوٹا صاحب ضرور بن گیا — ابن حسن کی اولوالعزمی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے نوکری کی طرف لپکنے کی بجائے مزید تعلیم کو ترجیح دی اور تحصیل علم کی جفاکشی میں لگ گئے۔ وہ کئی برس تک مختلف دینی درس گاہوں میں پڑھتے رہے۔ بالآخر ماننا پڑتا ہے کہ قدیم وضع کے روایتی مدرسوں کا وجود کتنی بڑی برکت اور رحمت ہے۔ ان کی خامیاں بے تکلف تسلیم، مثلاً ابن رشد اور غزالی کے فلسفیانہ مباحث کا سمجھنے والا اسٹرک پر گزرتی ہوئی بس کے نمبر نہ پڑھ سکے۔ تو غور فرمایئے کہ اس کا علم آج کے زمانے کا کہاں تک ساتھ دے گا۔ اور شیعوں کے اداروں کا فارغ التحصیل تو عمامہ و عبا پہن کر بالکل ہی امامیہ عقاید کا چلتا پھرتا اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے علما کی دوسری کوتاہی، خصوصاً جو آج کل زوال کے دور میں زیادہ نظر آتی ہے، ان کی مصالحت ناپذیر تنگ نظری ہے جو رفتہ رفتہ حد سے بڑھ کر مزاج کی خشونت اور سنگ دلی بن جاتی ہے۔ وہ جیسا کہ ایک دانش مند کا قول ہے خود کو "بے روک تعصّب اور بے لچک تنگ نظری" سے اوپر نہیں اٹھا پاتے۔ علم کے معاملے میں بھی ایسی ہی قطعیت کا رویّہ مغلوب کیے رکھتا ہے۔ حالانکہ آدمی جس کو علم سمجھتا ہے وہ محض ظنّ و امکان ہے دورِ آخر کے مفکرّین میں بیدل ضرور اس حقیقت سے آشنا تھا۔ ناغافلان تصوّرِ امکانِ خودیم آزمائش و خطا کے مسلک سے وابستگی، ظنّ و امکان کی مختلف جہتوں پر نظر، دوسروں کے نکتۂ نظر کو سمجھنے کی مخلصانہ آمادگی، مغربی دانش گاہوں کی تربیت کا خصوصی فیضان ہے۔ اس انداز کی تربیت کا ماحول ہماری قدیم روایتی درس گاہوں میں نظر نہیں آتا۔ علمائے کرام اس احساس سے قطعاً خالی ہیں کہ جس طرح ماضی میں انھوں نے مغرب کو سکھایا ہے آج مغرب سے کچھ سیکھنا بھی چاہیے ذہن کا معاملہ عمارت کا سا ہے کھلی ہوا کا گذر اور روشن دان ضروری چیزیں ہیں

البتہ ان ساری کوتاہیوں کے باوجود حساب آگے بڑھے تو امکان سے بعید نہیں کہ جدید دور کی شاندار دانشگاہوں کے مقابلے میں بعض اعتبار سے پلّہ حقیر مدرسوں کا بھاری بیٹھے۔ مغربی درس گاہیں تاجروں کی دکانیں ہیں جہاں علم بکاؤ مال بن کر رہ گیا ہے۔ جیب میں پیسے ہوں تو شوق سے خرید یے۔ اس مادّی تعلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم نوعِ انسانیت کے لیے خطرہ بن گیا اور مولانا روم کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی: علم کا دل سے تعلق ہے تو دوست، جسم سے تعلق ہے تو سانپ"۔ مشرقی مدرسوں کی واضح خصوصیات یہ ہیں کہ ایک تو ان کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کی اصلاح کو بنیادی مقام حاصل ہے دوسرے اس اصول سے روگردانی نہیں کی جاتی کہ علم اور درویشی ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ وہ کبھی سرکاری عطا و امداد کی طرف نہیں دیکھتے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ معیار جیسا ہے ویسا ہی رہتا ہے، مزید پست نہیں ہوتا، اور دائیں بائیں سے بدعنوانیاں داخل نہیں ہوتیں۔ قدیم روایتی درس گاہوں کا تربیت یافتہ ایک مخصوص قسم کا کردار لے کر باہر نکلتا ہے جو ہر طرح کے شخصی اور اجتماعی بحران جھیل سکتا ہے۔ وہ سادہ زندگی کا عادی ہوتا ہے اور عوام سے مستقیم رابطہ اس کے لیے مشکل بات نہیں ہوتی۔ سب سے بڑی خوبی یہ، اور اس کو قلندری اور بے نیازی کا طفیل کہنا چاہیے، کہ جب بھی موقعہ آتا ہے اس کی نظر اہلِ دولت کے سامنے جھکی نہیں کھاتی۔ ابن حسن چارچوی کی نوجوانی کے دن اسی قسم کے ماحول میں گزرے تھے۔ انھوں نے اسی تربیت پر اکتفا نہیں کی بلکہ لاہور سے علوم مشرقی اور عربی میں ایم اے کا امتحان پاس کیا، پھر علی گڑھ سے بی ایڈ (سابق بی ٹی) کی ڈگری لی۔ یعنی تعلیم و تدریس کے پیشے میں ایک معلم کی زندگی گزارنے کے لیے خود کو آمادہ کر لیا۔

عموماً پندرہ سے پچیس برس کی عمر کو آدمی کی تربیت اور کردار سازی کا خاص دور کہتے ہیں جب ساری دنیا ایک مدرسہ نظر آتی ہے اور ہر تجربہ پختگی کی طرف آگے بڑھنے کے لیے ایک قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نسل جس نے اپنی عنفوانِ جوانی کے تقریباً دس سال سنہ ۱۹۲۰ - سنہ ۱۹۳۰ عیسوی کے درمیان طے کیے، غیر معمولی مشاہدات

کے سائے میں پلی اور بڑھی تھی۔ اس وقت تاریخ کی قوتوں کو حرکت میں لانیوالی عظیم ہستیاں سرگرم عمل نظر آتی ہیں، حادثات کا حیرت انگیز ہجوم ہے، اور صاف پتہ چلتا ہے کہ حالات کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے۔

ابن حسن اعلیٰ تعلیم سے فراغت پاکر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں معلم ہو گئے (سنہ ۱۹۳۱) یہ ایک خاص قسم کا ادارہ تھا اور خاص حالات کا فشار اس کی ولادت باسعادت کا باعث ہوا تھا۔ ظاہری شکل درس گاہ کی سی۔ اصل میں یہ باغیوں کی پناہ گاہ تھی، جو قسم کھا چکے تھے کہ کچھ بھی ہو ہم توبہ کا نام نہ لیں گے۔ عزیزانِ جامعہ کی شوریدہ سری دیکھنے والے حیرت میں رہ جاتے تھے۔ ان کی اس نیت میں برسوں فرق نہ آیا کہ بھوکے مریں گے مگر نہ حکومت کا ایک پیسہ جامعہ ملیہ کے لیے قبول کریں گے، نہ ارباب دولت و نعمت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھیں گے۔ یہ فتوح علی گڑھ کو مبارک ہو۔ مشہور ہے، بعض اوقات ماہانہ تنخواہ کی جگہ آلو کے بورے تقسیم ہوتے تھے اور آلو کھا کر جامعہ کی برادری مست رہتی تھی۔ لوگ اب تک یاد کرتے ہیں کہ اس زمانے میں جامعہ کے جن بزرگوں نے آلو تناول فرمایئے ایسے موٹے ہوئے کہ زندگی بھر کوشش کے باوجود وزن نہ گھٹا۔ یہ ماحول ابن حسن جارچوی کی افتاد طبع کے لیے بیحد سازگار تھا۔ اور ان کی خصلت سے کاملاً مطابقت رکھتا تھا۔ وہ جب تک جامعہ ملیہ میں رہے، یعنی کوئی سات آٹھ برس، بہت زیادہ خوش رہے۔ دہلی میں رہتے ہوئے انھوں نے رہبر نام کے رسالے کی بنا ڈالی جو عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ مجالس عزا میں ذاکری کی غرض سے گھومنا پھرنا شروع کیا۔ ہندوستان کے تقریباً ہر قابل ذکر مقام پر پہنچے اور ملک گیر شہرت حاصل کرلی اس کو ذہانت کا کرشمہ کہیے کہ مولویوں کی عام اور گھسی پٹی روش سے ہٹ کر تقریر کا خاص انداز اختیار کیا۔ جو بہت پسند کیا گیا۔ وہ شیعہ سنّی دونوں میں مقبول ہو گئے۔ بعد میں یہ مشق مسلم لیگ کے سیاسی پلیٹ فارم پر کام آئی۔ آریہ سماجی متعدد علاقوں میں شدّھی سنگھٹن کا فتنہ اور پنجاب میں مناظرے کا ہنگامہ اٹھائے تھے۔ ایک دفعہ وہاں بھی شرکت کے لیے بلائے گئے۔ وہ اب محض ابن حسن نہ رہ گئے تھے بلکہ مولانا

بن گئے تھے۔ یہ سب نہ کیا ہوتا تب بھی جامعہ ملیہ کے لیل و نہار مولانا بنانے کے لیے کافی تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس طرح علی گڑھ سرسیّد کے خواب کی تعبیر، ویسے ہی جامعہ ملیہ مولانا محمد علی کے خواب کی تعبیر، ذرا سے گریز سے قصّہ آئینہ ہو جائے گا، شعرائے کرام کی نعت میں گریز ایسی بری چیز نہیں ہے۔ انوری اور خاقانی گریز میں سارا کمال دکھاتے تھے۔

●

مولانا محمد علی جوہر کا نام برِّصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کے دلوں پر ہمیشہ ہمیشہ نقش رہے گا ان کی یادوں کے دفتر میں یہ نام ایسی چیز ہے جیسے قیامت یا محبوب کی جوانی کا ذکر، کہ بات چھڑ جائے تو دور تک جاتی ہے۔ قدرت نے مولانا کو عجیب و غریب صفات عطا کی تھیں وہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل اور آکسفورڈ کے گریجویٹ تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں فصیح البیان خطیب اور اعلیٰ درجے کے انشاپرداز تھے۔ انگریزی میں کامریڈ نام کا جریدہ نکالتے تھے، شاعری کا بہترین ذوق تھا جوہر تخلّص کرتے تھے، ان کے بعض شعر اردو ادب کے لافانی شاہکار ہیں۔ اسلامی علوم پر اچھی گرفت تھی۔ پرہیزگار اور متّقی انسان تھے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور ارکان دین کی بجاآوری میں غفلت کا ہرگز کام نہ تھا۔ اسلام اور مسلمان سے عشق کی حد تک وابستگی تھی۔ ان سب باتوں کی بنا پر مولانا کہلانے لگے۔ حسنِ اتفاق کہنا چاہیے کہ لوگوں نے جو لقب محض محبت میں دیا تھا وہی ان کی سیرت کا شاہدِ صادق اور کردار کا آئینہ بن گیا۔ زبان خلق بھی عجیب چیز ہے۔ مستزاد یہ کہ فی البدیہہ نکتہ پردازی اور حاضر جوابی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ والسرائے کی کاؤنسل کے اجلاس میں داخل ہوتے وقت کچھ کانگریسی ممبروں نے پیچھے سے مولانا کی لمبی قبا پر طنزیہ فقرہ کسا: ہم تو سمجھے تھے بیگم محمد علی آگئیں۔ مولانا مسکرا کر بولے، بیگم محمد علی ہیجڑوں میں کبھی نہ آئیں گی، مگر کہاوت ہے کہ بے عیب ذات خدا کی۔ سیاست داں پر قطعاً واجب نہیں آتا کہ مکّار، جھوٹا، اور چلتا پرزہ قسم کا آدمی ہو، بلکہ سیدھا سچّا ہونا خیر و برکت کی بات ہے۔ اس بیابان خطرناک میں قدم رکھنے والے کے لیے چند شرطیں البتہ لازم

ہیں۔ اور بعض تقاضوں کی تعمیل حتماً ضروری ہے۔ مثلاً موقع پر فوراً تاڑ لینا کہ کون گھاتی کرنے کی نیّت رکھتا ہے۔ کسی کو اجازت نہ دینا کہ سر پر شیرہ مل کر بھاگ جائے اور معاملات کو ٹھنڈے دل سے سوچنا، جس کو معروف اصطلاح میں سر بہ گریباں کہتے ہیں۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد خلافت اسلامیہ ترکی کا شیرازہ بکھرتا دیکھ کر برّصغیر کے مسلمان سخت آزردہ اور بیچین ہوئے تو مولانا محمد علی نے قیادت سنبھالی (سنہ ۱۹۱۸ عیسوی) عین اسی وقت کانگریس کے صحنۂ سیاست پر ایک نئی شخصیت نمودار ہوتی ہے۔ گاندھی جی انگلستان میں قانون کی تعلیم حاصل کر کے جنوبی افریقہ پہنچے۔ (سنہ ۱۸۹۳ عیسوی) تو مغربی لباس زیبِ تن کیے تھے۔ وہاں احتجاجی تحریک کی ابتدا کرتے وقت مغربی لباس چھوڑ دیا۔ اس کی جگہ لمبا سا کھادی کا کرتا اور جنوبی ہند کے باشندوں کی وضع کا تہمد پہن لیا۔ کھادی کی سفید ٹوپی بھی تھوڑے سے دن سر پر رہی۔ ایک تھیلا کاندھے سے نیچے لٹکا لیا۔ اس سے ان کی شخصیت ممتاز ہو گئی ہندوستان آکر جنوبی افریقہ والا کرتا تہمد بالکل اتار پھینکا اور لنگوٹی باندھ لی جسم کو مکمل عریانی سے بچانے کے لیے احتیاطاً ایک دھوتی بھی ہوتی تھی۔ جو بقدرِ ضرورت کبھی آگے اور کبھی پیچھے کی پردہ داری کرتی رہتی تھی۔ عریاں اور ستر پوشی سے بے نیاز رہنا قدیم زمانے سے ہندوستان کے تارک الدنیا بزرگوں کا دستور تھا اس حلیئے نے گاندھی جی کو مہاتما بن جانے کا جواز فراہم کر دیا۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے مولانا ظفر علی خاں کی نظر اس معاملے کی طرف جاتی ہے: لنگوٹی والا ہمارا گاندھی مہاتما بھی منیم بھی ہے۔ وہ مولانا محمد علی کے ساتھ ایسی سانٹھ گانٹھ ٹھاتے ہیں کہ تحریک خلافت اور ترکِ موالات کا پلیٹ فارم مشترک ہو جاتا ہے خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں کی جانفروشی اور جوش کا آئینہ ہندوؤں کو دکھا کر گاندھی جی کانگریس کو جو، اول دن سے محض اعلیٰ طبقے کے ہندو قانون دانوں کی جماعت تھی ایک عوامی تحریک میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہی ان کا خاص کارنامہ ہے۔ غرض کہ ترکِ موالات کا دائرہ انگریزی تعلیم ترک کرنے تک پھیل جاتا ہے۔ مولانا

محمد علی فی الفور گاندھی جی کو ہمراہ لے کر ان کے ارشاد کی تکمیل میں علی گڑھ پہنچتے ہیں اور کالج کو بند کرنے کی دھینگا مشتی شروع ہو جاتی ہے۔ جب کوئی دلیل اور حجّت کام نہ آئی تو بالآخر سر ضیاء الدین کی ایک ترکیب کام کر گئی۔ انھوں نے مولانا سے کہا، آپ نے لڑکوں کے والدین سے بھی پوچھ لیا ہے کہ کونسا طریقۂ تعلیم پسند کرتے ہیں۔ اور راتوں رات کئی ہزار تار بھیج کر علی گڑھ میں لڑکوں کے ماں باپ کا ہجوم اکٹھا کر لیا۔ بہ خلاف توقع رونق اور مخاصمانہ نگاہیں دیکھ کر مولانا کے موقف میں کچھ نرمی آئی۔ پھر بھی انھوں نے سڑک کے دوسری پار جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کر دی۔ مدتوں ہنگامے چلتے رہے۔ استادوں اور لڑکوں کی ایک طرف سے دوسری طرف بھاگم بھاگ نے دونوں حریفوں کو بدمزہ کیے رکھا۔ آخر جامعہ ملیہ اپنے خیمے اکھاڑ کر دہلی روانہ ہوئی۔ اور علی گڑھ بال بال بچا۔ گاندھی جی نے روحانی صفائی اور ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے اپنا پہلا مرن برت مولانا کے گھر میں رکھا۔ مولانا محلہ بلّی ماران دہلی میں کرائے کا مکان لے کر خلافت کے دفتر سمیت مقیم تھے۔ مسلمانوں کو اعتراض ہوا کہ اسلام خودکشی اور دانستہ ہلاکت کی اجازت نہیں دیتا، مولانا کے گھر میں یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔ مولانا اپنے مہمان عزیز کے اقدام سے خاصے پریشان ہوئے (سید محمد ہادی: علی برادران) مولانا کی تقریروں اور کامریڈ کی تحریروں کے اثر سے جنوبی ہند کے موپلا مسلمانوں نے بغاوت کی اور ہزاروں بے گناہ انگریزوں کی توپوں کا ایندھن بن گئے۔ مہاجرت کا نعرہ سن کر بنگال سے سندھ تک انبوہ در انبوہ مسلمان اپنے دار و دیار چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور افغانستان کی طرف چل دیئے۔ بلیشمار غریب راستے میں مرے، لوٹے گئے، اور جو واپس آئے ان کو مکمّل افلاس اور تباہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ خلافت اور عالم اسلام کے اتحاد کی فکر میں حد سے زیادہ جوش ملکی مسائل سے توجہ ہٹانے کا باعث ہوا جس کا اچھا انجام سامنے نہ آیا۔ غدر کے بعد سے پہلی جنگ عظیم تک مسلمانوں کی سیاسی اور دیگر فعالیتوں کا مرکز علی گڑھ تھا۔ وہ مرکزیت ختم ہو گئی۔ حالانکہ علی گڑھ اب کالج نہ رہ گیا

تھا، یونیورسٹی ہوگیا تھا۔ مسلم لیگ جو سنہ ۱۹۰۶ عیسوی سے افتاں خیزاں چلی آرہی تھی سسک کردم توڑ بیٹھی۔ اور میثاق لکھنؤ (سنہ ۱۹۱۶ عیسوی) خلافت اور ترک موالات کے غل غپاڑے میں دھواں بن کر اڑ گیا۔ پھر تو مسلمانوں کی اس قدر پارٹیاں ابھریں اور ایسا ہنگامہ مچا کہ برساتی مینڈک گھبرا کر خاموش ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ ضرورت پڑی تو مسلم رائے عامہ کی تنظیم نو کا معاملہ تیشہ و سنگ اور جوئے شیر کی آزمائش بن گیا۔ بہرحال خیریت ہوئی کہ وہاں مصطفےٰ کمال نے استرداد خلافت کا اعلان کیا اور یہاں حاجی محمد جان چھوٹانی جس کو مولانا نے ناصر اسلام کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ خلافت کے چندہ کا ساڑھے سولہ لاکھ روپیہ صاف غبن کر کے بیٹھ گیا اور ظالم نے مولانا کو بے دست و پا کر دیا مسلمانوں کی جان خلافت سے چھوٹی۔ بقول اکبر الہ آبادی: سنتا ہے اک عمر سے بندہ، لاؤ چندہ لاؤ چندہ، انگریزی حکومت کی طرف سے اعتراض ہوا تھا کہ خلافت محض سنیوں کا مسئلہ ہے۔ شیعہ تو اسکو مانتے نہیں۔ مولانا نے لندن میں جسٹس امیر علی سے بیان شائع کرایا کہ وہ خلافت اور تھی، موجودہ خلافت کو شیعہ بھی مانتے ہیں۔ سب شیعہ مولانا محمد علی کی قیادت کے حامی ہیں اور سب انکو اپنا قائد سمجھتے ہیں اس ساری روئیداد کا سبق آموز خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ مخلص، دیانت دار، دردمند، اور دلیر افراد کی خطائیں معاف کر دیتی ہے نہ انکے رتبے میں فرق آنے دیتی ہے اور نہ انکو زندۂ جاوید ہستیوں کے زمرے سے خارج کرتی ہے۔ کانگریسی نہرو رپورٹ پر مباحثے کے دوران مولانا کے ساتھ توہین سے پیش آئے (سنہ ۱۹۲۸ء) حالانکہ وہ خود چار پانچ برس پہلے کانگریس کے صدر رہ چکے تھے۔ اور مولانا اپنے پیچھے مسلمان قائدین کی بہت بڑی جماعت کو لے کر احتجاجاً جلسہ گاہ سے باہر نکلے تو وہ ایک تاریخی رات تھی۔ کانگریسیوں نے نہرو رپورٹ، یعنی مجوزہ آئین میں مسلم رہنماؤں کی پیش کردہ ایک ترمیم بھی نہ مانی۔ عامتہ المسلمین کے دل سے اس کے بعد کانگریس کا وقار جاتا رہا اور انھوں نے پھر کبھی کانگریس کی طرف اعتماد کی نظر سے نہ دیکھا۔ (آنجہانی پروفیسر رام سرن ترپاٹھی الہ آباد یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد، راوی ہیں) باہر آتے وقت ایک دبلا پتلا لمبے قد کا آدمی پنڈال کی رسی میں پاؤں الجھ جانے سے گر پڑا۔ والنٹیر مدد کے لیے آگے بڑھے۔ مگر پہچان کر حقارت آمیز قہقہہ لگایا اور پیچھے ہٹ گئے۔ وہ شخص مولانا کا ہمنام اور آگے آنے والے

دنوں ہیں ان کا جانشین تھا۔ گول میز کانفرنس لندن میں مولانا کی تقریر ایک یادگار
کارنامہ اور ان کے اقوال کی صداقت ان کی عظمت کی دلیل ہے: ”میں غلام
ملک میں کبھی نہ مروں گا“ (سنہ ۱۹۳۰ء) مولانا کو ارض فلسطین میں قبر کی جگہ ملی جہاں بہت سارے انبیائے
سلف اور صلیبی حملہ آوروں کا طوفان روکنے والے شہدا محوِ خواب ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی کا ذکرِ
خیر طول کلام سہی، تبرکاً مناسب معلوم ہوا، ورنہ یہ واضح ہونے سے رہ جاتا کہ جامعہ ملیہ نے اپنے ایک سابق استاد
کو غایت پر نظر جمائے رکھنے اور مقصد کی خاطر اختیار کرنے کی تربیت کس طرح دی اور اس کے مزاج میں
پیدا ہونے والی قلندرانہ صفات کا سرچشمہ کس کی ذات تھی۔ ابن حسن جارچوی نے مولانا سے بغاوت کا سبق
بھی سیکھا، مولانا علی گڑھ کے باغی تھے۔ ابن حسن جارچوی جامعہ ملیہ کے باغی ثابت
ہوئے: گر صحبتِ گل پیشہ کنی گل باشی ●● تاریخ میں محمد علی کا کردار: مولانا نے برصغیر کے مسلمانوں
کو کانگریسی قیادت کے قدموں میں ڈال دیا، یعنی یہ بھی کر کے دیکھ لیں، حجت اور اعتراض باقی نہ رہ جائے ●●

مہاراجہ محمود آباد، محمد علی محمد خاں کی دعوت پر مولانا ابن حسن جامعہ ملیہ سے لکھنؤ
چلے گئے اور مہاراجہ کے بڑے بیٹے، محمد امیر احمد خان کے اتالیق ہو گئے۔ بڑے
مہاراجہ کی خدمات اور خوبیاں دنیا بھولتی جا رہی ہے۔ علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی
کا چارٹر ملنے پر حسبِ قانون تنخواہ دار وائس چانسلر کی ضرورت پڑی تو ایک روپیہ
ماہوار پر یہ خدمت مہاراجہ نے قبول کی۔ وہ شاہانہ احتشام کے ساتھ کبھی کبھی
علی گڑھ تشریف لاتے تھے۔ باقی معاملات ان کی نیابت میں دوسرے لوگ اور
بعد میں سر ضیاء الدین انجام دے لیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۵ عیسوی کا ایکٹ نافذ
ہونے سے قبل گورنر کے اختیارات کا ڈھانچہ جو کچھ بھی تھا۔ بڑے مہاراجہ گورنر
کی کاؤنسل میں وزیر کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے بعد مہاراجہ، محمد امیر احمد خاں
کے لیے باپ کی منزلت حاصل کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر یہاں سے مہاراجہ کی سیرت
پر اُن کے فاضل اتالیق کی صحبت کا اثر پڑنا شروع ہوتا ہے۔ وہ سرکاری
اعزاز و اکرام کی طرف دیکھنے کے بجائے مسلمانوں کی تنظیم و بہبود کو زیادہ مستحسن کام
سمجھتے ہیں۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب اہل لکھنؤ، جو خطاب تراشنے کے ماہر ہیں

ابن حسن کو مہاراجہ کا سیاسی دماغ کہنے لگتے ہیں، اور خود محمد امیر احمد خان، بوریانشین مہاراجہ۔

ابن حسن جارچوی دہلی سے لکھنؤ آئے تو عین اسی وقت ہماری تاریخ ایک نازک دور میں داخل ہو رہی تھی۔ اگر ہم ۱۹۳۷ عیسوی کو درمیان میں ایستادہ سنگ میل مان کر دس سال قبل اور دس سال بعد تک دیکھتے چلے جائیں تو وہ سارے حادثات صف بستہ گزرتے ملیں گے۔ جن کے نتیجہ میں برّصغیر کے مستقبل کا صدیوں کے لیے فیصلہ ہو گیا۔ مسلمانوں کی رائے عامہ کو منظّم اور بیدار کرنا اور ایک مرکز پر لانا آسان کام نہ تھا۔ یہ مقصد سامنے رکھ کر صحنۂ سیاست پر تقریباً دس برس تک (سنہ ۱۹۳۷ - ۱۹۴۷) سب سے کامیاب کردار مہاراجہ محمود آباد اور ان کے اتالیق ابن حسن جارچوی نے ادا کیا۔ ان کی جاں بازی کا مرحلہ وہ ہے جب غیر منقسم ہندوستان میں آخری دفعہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے (سنہ ۱۹۴۶) محمد علی جناح بمبئی سے مرکزی کاؤنسل کے امیدوار تھے، مہاراجہ محمود آباد نے الیکشن کی ذمّہ داری سنبھالی۔ کانگریس جناح کے مقابلے میں خاص ان کی برادری کی نہایت بااثر ہستی، سیٹھ حسین بھائی لال جی کو میدان میں لائی۔ وہ سخت آزمائش کی گھڑی تھی۔ تنہا جناح کی کامیابی یا ناکامی پر مستقبل کے نقشے کا دارومدار تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کئی بار بمبئی تشریف لے گئے۔ ابن حسن جارچوی کی تقریروں نے ان کی خطابت کا جادو چلنے نہ دیا۔ تجربے کی رو سے فن کی سحر کاری تسلیم، مگر فن اور خلوص کا مقابلہ ہو تو فتح خلوص کی ہو گی۔

ملک کی تقسیم کے بعد مولانا ابن حسن کچھ عرصے تک شیعہ کالج کے پرنسپل رہے۔ وہ شاطرانِ لکھنؤ کے پایاں ناپذیر مناقشات کو قابو میں رکھنا، سب کو ٹھنڈا کیے رہنا یا بصورت دیگر آپس میں مار پیٹ کرا دینا، اراکین انتظامیہ کے سروں پر وقتاً فوقتاً روغن قاز ملنا، متفرق نوعیتوں کے داؤ پیچ دکھانا یا دوسروں کے داؤ پیچ کی کاٹ کرنا وغیرہ۔ بالکل نہ جانتے تھے۔ یا سمجھتے ہوں تو ان حرکتوں کو

اپنے مقام سے پست تصوّر کرتے تھے اور کسی طرح بھی اوقاتِ عزیز کو واہیات مشاغل میں ضائع کرنا گوارا نہ تھا۔ اکثر غصّہ بھی آجاتا تھا۔ مجبوراً وہاں کی فتنہ انگیزیوں سے تنگ آکر پاکستان مہاجرت کر گئے (سنہ ۱۹۵۱عیسوی) اور کراچی یونیورسٹی میں علوم اسلامی کے استاد کی پوزیشن پر گزرا وقات کا سہارا ہو گیا۔ ان کو حکومتِ پاکستان نے علوم اسلامی پر تحقیقی ادارہ قائم کرنے کی غرض سے ایک قطعہ زمین عنایت کیا تھا۔ اس نوعیت کے اداروں کا پائیدار قیام حکومت کی بخشش کے بجائے عامتہ الناس کا شوق اور ایثار چاہتا ہے۔ ابن حسن اس ادارے کے ایک گوشے میں محوِ خواب ہیں۔ (سنہ ۱۹۷۳عیسوی) غالبًا ادارہ ہنوز اہل پاکستان کی ہمتِ عالی، کشادہ دستی، اور جانفشانی کا منتظر ہے۔ ایسے خواب ضرور حقیقت بنتے ہیں اور ان کی تعبیریں ضرور سامنے آکر رہتی ہیں۔ ابن حسن تقریر کے ساتھ تحریر پر بھی قادر تھے اور جاندار نثر لکھنا جانتے تھے۔ ان کی کتابوں کے ایڈیشن ترتیب و تدوین کے جدید اصولوں کی روشنی میں شائع کرنا اور دنیا کے سامنے پیش کرتے رہنا ان کی نسل کے دانش مند افراد کی ذمہ داری ہے۔ حاصل کلام اور لبّ لباب شہرت اپنی جگہ ابن حسن جارچوی غریب اور معمولی حیثیت کے آدمی تھے، ہمیشہ عامتہ الناس سے واسطہ رہا۔ کبھی کوئی بڑا سرکاری عہدہ نہ پایا۔ البتہ مسلم رائے عامہ کی تعلیم و تنظیم، وہ بھی نازک اور فیصلہ کن دور میں، ایک مشکل مہم تھی جو وہ انجام دے گئے۔ تاریخ ایسی خدمت کا موقع جو قوموں کی تقدیر بدل دے سب کو کہاں دیتی ہے: یہ منصبِ بلند ملا جس کو مل گیا۔

•

## حیدر عباس نخشب جارچوی

حیدر عباس، جارچے سے نکل کر کس وقت تحصیل موانہ ضلع میرٹھ میں جا بسے،

جارچہ چھولس میں کوئی شاذ و نادر ہی اس سوال کا صحیح جواب دے سکتا تھا خطاطی اور خوش نویسی کا فن جانتے تھے۔ اپنے کمال کا احساس ضرور ہوگا مگر فخر کرنے کی عادت نہ تھی۔ مشہور روایت ہے کہ فن کار بالکل آزاد ہوتا ہے۔ اگر کوئی چیز اس کو تابع کر سکتی ہے تو فقط اس کا فن ہے اور فن کے تقاضے ہیں۔ ناچنے والے کا پاؤں نہیں رکتا۔ گانے والا کان پر ہاتھ دھرے تیار رہتا ہے اور کبھی نہیں بھولتا کہ کس موقع پر کونسا راگ الاپنا ہے۔ وہی معاملہ خطّاط کا ہے۔ جب جی چاہا کاغذ قلم ہاتھ میں لیا اور طغرا بنانے بیٹھ گئے۔ حیدر عباس بڑے سلیقے کے آدمی تھے۔ شائستگی، مروّت اور محبت کی کمی نہ تھی۔ قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے۔ مگر مزاج ویسا ہی نازک پایا تھا جیسا کہ شاعروں کا یا دیگر فنون مثلاً رنگ وصوت کی رمزیات میں غرق رہنے والوں کا ہوتا ہے جہاں کسی سے ناراض ہوئے، اور یہ جاننا مشکل تھا کہ آبگینہ کب ٹھیس کھا جائے، فی الفور نہایت صاف ستھری اور خوب صورت نستعلیق عبارت میں، جس کا ہر لفظ جڑا ؤ نگینہ ہوتا تھا، القاب وآداب کا تازیانہ گھمایا، اور گفتنی ناگفتنی جو کچھ جی میں آیا لکھ کر بذریعہ ڈاک روانہ کر دیا۔ وطن مالوف کے عزیزوں کو بھی اس عزت میں شریک کر لیتے تھے۔ یعنی یہ اظہار تعلق کا ایک انداز تھا۔

لئیق الحسن کا رسالہ، جس کا حوالہ اوپر گزرا " اکابرین جارچہ" کے ذیل میں طرح طرح کی خلقِ خدا کا تعارف کراتا ہے۔ ڈاکٹروں اور انجنیروں کی بات تو سمجھ میں آئی، ٹھیکیدار اور دکان دار تک بیٹھے نظر آتے ہیں۔ مگر لئیق بھائی کو کسی خوش نویس کا نام یاد نہ آیا۔ حالانکہ خوش نویسی فنون لطیفہ میں شامل ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب میں اس کی بڑی اہمیت اور آبرو رہی ہے۔ مغل شہزادوں اور شہزادیوں کو باقاعدہ خطاطی کی تعلیم دی جاتی تھی اور وہ اس کے حصول میں محنت کرتے تھے۔ بابر ماہر ہفت خط ہونے کے علاوہ " خط غبار" کا موجد بھی تھا۔ ہمایوں کو حادثۂ مرگ ناگہانی سے کچھ وقفہ پہلے اس کے مقربِ خاص

بیکسی غزنوی، نے دیکھا کہ کتاب خانے میں بیٹھا شیخ آذری کے شعر پر خط کی مشق کر رہا ہے: "عاقبتِ کار جملہ محمود است" بابر کی نسل میں خطاطی کی روایت آخری وقت تک قائم رہی۔ مغل عہد کے خطاط، محمد حسین کشمیری، امانت خان شیرازی، اور رشید دیلمی وغیرہ معقول مشاہرہ پاتے تھے۔ حاصل کلام یہ کہ حیدر عباس خطاط تھے اور انھوں نے یہ فن، جیسا کہ ہر فن کار کا قاعدہ ہے، مشق و مداولت اور مسلسل ریاض کے ذریعے سیکھا تھا۔

موانہ، ضلع میرٹھ کی ایک تحصیل اور چھوٹا سا شہر ہے۔ ایسی جگہوں پر سادگی کے ساتھ گزر بسر آسان ہوتی ہے۔ حیدر عباس وہاں عمر بھر آسودگی سے رہے۔ انھوں نے ذاتی کوشش سے قانون انتقال آراضی میں لیاقت و مہارت پیدا کر لی تھی اور اس کی مدد سے روزی کمانے کا ڈھب سیکھ گئے تھے۔ کردار میں نظم و ضبط تھا۔ معمولی بساط اور محدود آمدنی کے باوجود چار بیٹوں کی اعلیٰ تعلیم کے کفیل ہوئے نخشب ان ہی کے بیٹے تھے۔

نخشب، اختر عباس، کو شاعری کا چسکا کیسے لگا۔ کیا سانحات پیش آئے، کن معرکوں سے گذرنا ہوا، کونسا "افندودانی" کا جھیلا آن کر پڑا یا بالکل نہ پڑا، کسی کو استاد بنایا اور حسب اصطلاح زانوے تلمذ طے کیا یا خود کو تلمیذ رحمٰن سمجھ کر بغیر کسی سے پوچھے مصرعے پر مصرعہ جڑنا شروع کر دیا۔ ان ساری باتوں کا کچھ پتہ اور علم ہو تو ان کے بھائی سید عباس کو ہو گا جو فی الحال کراچی فیڈرل کورٹ میں وکالت کرتے ہیں۔

وہ شاعری کا خداداد ملکہ لے کر آئے تھے اور جب تک زندہ رہے دیگر مشغولیات کے باوجود شعر کہتے رہے۔ لیکن شعرائے کرام کی جس شریفانہ خوبی سے بھلے لوگ گھبراتے ہیں اور وحشت کھا کر بھاگتے ہیں، یعنی خستہ حالی، اس صفتِ محمود کو نخشب نے اپنی زندگی میں کبھی داخل نہ ہونے دیا۔ انجیل کی تاکید ہے کہ تم زمین کی فکر رکھو آسمان کی حکومت خود بہ خود آ جائے گی،

یہ کہاوت ہر سنجیدہ مقصد پر صادق آتی ہے۔ آدمی پہلے زمین پر پاؤں جمالے اور کارل مارکس کی طرح سر نیچے زمین پر اور ٹانگیں اوپر ہوا میں نہ ہلتی رہیں تو اس کے سارے کام آسان ہو جاتے ہیں۔ نخشب نے جوانی کے ابتدائی مرحلے میں اس حرکت سے احتیاط برتی کہ میرٹھ کی سڑکوں پر گشت لگائیں۔ اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر چائے نوش فرمائیں۔ بلکہ بغیر تاخیر و تامل بمبئی کا سیدھا راستہ لیا اور وہاں پہنچ کر فلموں میں گانے لکھنے لگے۔ اتفاق کی بات یہ کہ معاملہ چل نکلا اور بہت جلد ان کی شہرت ہو گئی۔ تھوڑے ہی دن بعد فلمساز بن گئے، اس راہ میں بھی کامیابی نے ہاتھ پکڑے رکھا۔ جیب ہلکی رہنے کا سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔

نخشبؔ کا معمول تھا کہ میرٹھ آتے تھے تو اپنے گھر پر، یعنی جو خیر نگر میں ان کے والد نے دوسرے بیٹوں کے لیے کرائے پر لے رکھا تھا۔ مشاعرے کی مخصوص نشستوں کا اہتمام ضرور کرتے تھے۔ تقسیم ملک و آزادی سے سال بھر پہلے کی بات ہے، میں میرٹھ کالج میں انٹرمیڈیٹ سائنس کا طالب علم تھا۔ نخشبؔ کے گھر شعری نشست سے قبل بعض شاعر کھانے پر مدعو تھے۔ کالج کے جونیئر لڑکے کی اوقات کیا، مگر نخشبؔ نے مجھے بھی کھانے پر شریک کر لیا اور اپنے پاس بٹھا کر کھلایا۔ وہ جانتے تھے کہ لڑکوں کی نیت شاندار غذا پر کیسی لپکتی ہے اور مل جائے تو کس قدر بے تحاشا کھاتے ہیں۔ مجھے اس وقت تک شاعری کی کوئی خاص تمیز نہ تھی۔ سائنس اور شعر کی دنیا میں ویسے بھی فاصلہ ہوتا ہے۔ بعض عزیز دوستوں کی تاکید تھی کہ شاعری کی طرف ہرگز نہ دیکھنا، ورنہ کسی کام کے نہ رہو گے اس مجلس میں ماہر القادری کو پہلی اور آخری دفعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دوسرے شاعروں کے نام اور قیافے ذہن میں محفوظ نہ رہے۔ نہ ان حضرات کے اشعار غور سے سننے اور سمجھنے کی توفیق ہوئی۔ غیر حاضر سا بیٹھا رہا۔ داد دینے کی اس وقت تو کیا ہمت ہوتی بعد میں بھی کبھی عادت نہ ہوئی۔

غالباً اسکر وائلڈ کی طرف یہ مقولہ منسوب ہے کہ اچھا کھانا کھا کر دنیا کی ہر چیز بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ اس شب کی نشست کا ایک شعر بھی یاد نہ رہا۔ مصرعۂ طرح ضرور یاد رہ گیا جس کا اعلان پہلے سے ہو چکا تھا: دل ابھی تک تری نظروں کو دعا دیتا ہے۔

نخشب کی تخلیقی کاوشوں کا زمانہ وہ ہے جب اردو شاعری میں ترقی پسندی پورے عروج پر تھی۔ اردو ادب میں رہنمائی کا جھنڈا ترقی پسندوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شاعروں پر اپنا ایسا رعب بٹھائے تھے کہ بڑی تعداد ان کی راگنی گانے اور انکے سُروں میں سُر ملانے پر مجبور تھی۔ انکی جاری کردہ اصطلاحات اور منظور شدہ علامات کو سکۂ رائج الوقت کا اعتبار حاصل تھا اسکی خیر نہیں جو بتائی ہوئی شاہراہ سے ذرا سا ہٹ جائے۔ قانون تعزیرات ہند میں انگریزوں نے شرارت کے طور پر کچھ دفعات شریفوں کی عزت آبرو خراب کرنے کے لیے رکھ چھوڑی تھیں ویسی ہی ترکیب ترقی پسندوں کو یاد تھی اور خوب دھونس جماتے تھے۔ دقیانوسیت کے الزام سے شاعروں کو بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ ہر ایک کو کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں دقیانوسی قرار نہ پا جائے۔ اور انجام کو سوچ کر جاڑوں میں پنکھا جھلنے لگتے تھے۔ کہ پبلک مشاعرے، ریڈیو، دیگر ادارے، کہیں کے نہ رہیں گے۔ ترقی پسند علانیہ طور سے ایک سیاسی نظام کے پرجوش حامی اور معتقد تھے۔ شاعری تبلیغ عقاید کا ذریعہ تھی۔ وہ اس کو مزدوروں اور کسانوں کا مقدمہ پلیش کرنے کے لیے وسیلے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ فن کی برگزیدگی کا تصوّر، یعنی "شاعری جزویست از پیغمبری" ان کے نصاب میں قدیم لہٰذا ناقابل قبول چیز تھی۔ شاعری کو بنیادی مقصد کے سامنے ثانوی حیثیت دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم و بیش نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے میں اردو کی ترقی پسند تحریک فقط ایک شاعر پیدا کر پائی۔ وہ فیض احمد فیضؔ ہے۔ باقی سب کی صلاحیتیں ہڑ بونگ مچانے میں ضائع ہو گئیں اور سب نعرے باز بن کر رہ گئے۔ اشتراکی نظام کے مرکز ثقل سوویت روس، کا اپنی طاقت و عظمت کے آخری نقطے پر پہنچ کر یکایک تحلیل ہو جانا (سنہ ۱۹۱۷ عیسوی لغایت سنہ ۱۹۹۲ عیسوی) عالمی تاریخ کا نہایت عجیب و غریب واقعہ

ہے، الف لیلیٰ کے جن کی بابت ضرور سنا تھا کہ دھواں بن کر ہوا میں غایب ہو جاتا تھا۔ ترقی پسند ادب کو بلند درجے پر پہنچنے سے روکنے میں دوسری چیز اور بھی تھی جو سدِّراہ ہوتی تھی۔ اس جماعت کے افراد مضحکہ خیز حد تک مصنوعی، مکار، اور ریاکار واقع ہوئے تھے ان میں سے بیشتر کا تعلق خوش حال گھرانوں سے تھا، یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی، روزمرّہ زندگی عیش سے گزارتے تھے۔ ٹھاٹ سے رہتے تھے۔ وہ جو ایک نذاق کا مقولہ ہے کہ صبح اٹھ جام سے اور شب دلآرام سے، اکثر کے لیل و نہار پر بالکل صادق آتا تھا، ذہانت کی بھی کمی نہ تھی۔ نہایت چلتے لوگ تھے۔ ایک طرف یہ ساری باتیں اور دوسری طرف مزدوروں کے افلاس اور کسانوں کے استحصال کی شکائتیں۔ ان کی زبان سے سراسر مذاق معلوم ہوتی تھیں۔ ادب میں مگرمچھ کے آنسوؤں سے کام نہیں چلتا۔ اعلیٰ درجے کا ادب مداولت کے علاوہ خلوص و صداقت بھی چاہتا ہے اور ادب پر کیا منحصر، زندگی کے معاملات میں خلوص و صداقت کی ضرورت کہاں نہیں پڑتی۔ ترقی پسندی کی گرما گرمی اور زور شور کے دنوں میں بھی ایسے اہل ہمت موجود رہے جنھوں نے اخلاقی استقامت کا ثبوت دیا۔ اور کلاسیکی ادبیات کی صالح روایات، خصوصاً غزل کے آداب کی پاسداری و پرستاری کا چلن باقی رکھا۔ نخشب کا تعلق اسی طبقے سے تھا۔ انھوں نے اساتذہ کو شمع راہ بنایا اور کلاسیکی شاعری کے رموز دقائق کو غور سے سمجھا۔ وہ غزل گوئی کے اسالیب سے واقف تھے اور ان کو ٹھکانے سے برتنا جانتے تھے۔ البتہ انسان کی حیثیت سے دوسروں کے ساتھ اور خود اپنے ساتھ سچّائی سے پیش آنا ان کا شیوہ اور شعار تھا۔ فلمساز کی زندگی جس نہج اور معیار کی ہوتی ہے اس کی تفصیلات سب جانتے ہیں۔ وہی نقشے نخشب کے معمولات میں نظر آتے تھے۔ ایسا آدمی سرخ انقلاب اور مزدور کسان کی باتیں کرتا پھرے تو اس سے زیادہ ریاکاری اور دھوکے بازی کی حرکت کیا ہو سکتی ہے۔ نخشب کو ریاکاری اور بناوٹ ہرگز پسند نہ تھی۔ وہ عمر خیام کی اس تعلیم کے قائل تھے کہ سیرت کا جو اصلی رنگ ہے

وہی دنیا کو دکھاؤ، یعنی ہو کچھ اور نظر کچھ اور آؤ ، یہ سراسر دغابازی اور فریب ہے

آدمی زندگی کے کسی خاص میدان میں یکایک امتیازی مقام حاصل کرلے تو دوسروں کو تجسّس اور تعجّب ہوتا ہے کہ اسے کونسا جادو یاد تھا۔ ہندوستان کی فلمی صنعت میں جنگ عظیم دوم کے اختتام تک بھرپور مقابلے کا دور شروع ہو چکا تھا۔ وہاں غیر معمولی لیاقت وذہانت اور مسلسل کاوش وریاضت کے بغیر قدم جمانا دشوار تھا۔ نخشب کی ترقی خود ان کی ذات کے جوہر اور ارادے کی قوت کا نتیجہ تھی۔ اس میں دوسروں کی سرپرستی اور سہارا محض اتفاقیہ ہو تو ہو، عمداً اور نمایاں کہیں نہ تھا۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ گھٹائیں سورج کو چھپا سکتی ہیں لیکن خداداد جوہر ذاتی ایک دفعہ طلوع ہو گیا تو چمکتا ہی رہتا ہے اور اس کی درخشندگی میں فرق نہیں آتا۔ فلم کی دنیا بالکل نرالی اور الگ ہے، وہاں کی رسمیں دوسری وہاں پائی جانے والی مخلوق کے اطوار اور رنگ ڈھنگ دوسرے، اور سچ بات یہ کہ ان کی ذمہ داریاں بھی دوسری ہیں۔ وہ ایک اعتبار سے سارے معاشرے کا آئینہ ہیں۔ اداکاری کا ہنر ہم کو نہ صرف ہمارے اچھے برے رُوپ دکھاتا ہے، بلکہ فیشن، مذاق اور مزاج کی تربیت میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے فلم کی دنیا میں چمک دمک، روشنی اور رونق فلمی ستاروں کی ممنون ہے۔ ایک فلم ساز کا سارا کاروبار ان ہی کے دم سے چلتا ہے۔ اس کے معاملات کی کامیابی ان کے وجود سے وابستہ اور اس کی بست وکشاد ان ہی پر موقوف ہے پرانے زمانے سے معلوم ہے کہ شہر میں صفائی کے لیے میونسپلٹی کے جمعدار کا واسطہ مہتروں اور مہترانیوں سے قریبی رہتا تھا۔ آج کل سرکاری انجینیر کی علانیہ اور خفیہ دونوں طرح کی بھیا بندی ٹھیکیداروں سے ہوتی ہے۔ عین اسی طرح کی کیفیت سے فلمساز کو دوچار رہنا اور نمٹنا پڑتا ہے۔ ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے ساتھ خلا ملا رکھنا، بے حساب دولت کمانا اور بے دریغ خرچ کرنا، رامش ورنگ کی محفل ہو یا بزم پیالہ، ہر جگہ پابندی سے جانا، یہ سب ناگزیر مجبوریاں ہیں۔ اس سے

فلم ساز کی معقولیت پر کسی طرح کا حرف نہیں آتا۔ اکثر فلم ساز طبیعت کے دردمند اور انسانی روابط میں مخلص ہوتے ہیں۔ نخشب بھی شریف آدمی تھے۔ حال میں کسی سے سنا کہ بمبئی کی ایک معروف اداکارہ نے اپنا انٹرویو دیتے ہوئے نخشب کو یاد کیا (سنہ ۱۹۹۲ عیسوی) اور دلچسپ بات یہ بتائی کہ وہ مجھ سے پردہ کرنے کا تقاضا کرتے تھے۔ اس کے معنی یہ نکلے کہ نخشب فلمساز کے ظاہری طمطراق اور زرق برق پوشاک کے نیچے جارچے کے قصباتی سیدزادے کو ہمیشہ چھپائے پھرتے رہے اور اپنے سے دور نہ ہونے دیا۔

آزادی اور تقسیم ملک کے بعد نخشب بمبئی کو خیرباد کہہ کر پاکستان مہاجر کر گئے۔ وہاں جاکر اسی مشغلے میں دل لگائے رہے جس کی بدولت اوّل دن سے ترقی کے زینے پر چڑھے تھے اور شہرت حاصل کی تھی۔ انسانی حرکت و عمل کے بعض شعبے ایسے ہیں جہاں زندگی کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے اور لیل و نہار کی گردشوں کے ساتھ آدمی کی حیاتِ مستعار کے لمحے چنگاریوں کی طرح اڑتے اور بجھتے چلے جاتے ہیں۔ مسافر یکایک منزل پر پہنچ کر خبردار ہوتا ہے کہ سفر ختم ہوا۔ نخشب جلد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے دو بھائی اظہر حیدر اور امیر حیدر بھی خدا کو پیارے ہوئے۔ امیر حیدر سب سے چھوٹے تھے، طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور تھوڑے عرصے میں کامیاب طبیب بن گئے تھے۔ نخشب اور ان کے مرحوم بھائیوں پر فارسی کے کسی شاعر کا خیال حقیقت بن کر صادق آیا،

وفاداری نہ کرد اے وائے عمرم نوجوان مردم۔

●

## سجاد حسین

سجاد حسین کے شجرے پر غور کیجیے تو سب سے اوپر والے دائرے میں ایک

بزرگ ہدایت علی نظر آتے ہیں۔ خیر علی اُن کے بیٹے ہیں اور پھر خیر علی کی اولاد لمبی پھیل جاتی ہے۔ یہ گویا کہ خاندان بندگی معظم کی ایک شاخ ہے۔ سجاد حسین میرٹھ کالج میں لائبریرین تھے۔ جدید درس گاہوں میں لائبریری کو نبض سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یعنی جس طرح قلب کی قوت وحرکت اور کیفیت ورفتار کا پتہ نبض بتاتی ہے۔ ویسے ہی اعلیٰ درس گاہوں کے وقار ومعیار کا اندازہ وہاں کے کتابخانوں سے ہوتا ہے۔ لائبریرین کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ وہ ایک چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہوتا ہے، اور ہر طرح کے موضوعات اس کی نوکِ زبان پر رہتے ہیں، مختلف اور متنوع علوم کی تازہ کتابوں سے مطلع رہنا اور لائبریری کے لیے انتخاب کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ جب کتاب آجائے تو سب سے پہلے وہی نظر ڈالتا ہے۔ قدرتی طور سے اس کا علم وسیع ہوتا ہے اور مطالعہ اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ سجّاد حسین کی ذات میں یہ تمام صفات وشرائط موجود تھیں وہ ایک مثالی لائبریرین تھے۔ میرٹھ کالج کے اساتذہ کی جماعت سجاد حسین کے علم اور ذہنی تربیت اور ذوق کا اعتراف کرتی تھی۔

کتابخانہ کوئی آج کل کے زمانے کی چیز نہیں ہے۔ مسلمانوں میں اس کی روایت بہت پرانی ہے۔ جدید نمونے کی بڑی دانش گاہیں سب سے پہلے نیشاپور، بخارا، بغداد اور قرطبہ میں قائم ہوئیں۔ مشہور ہے، نظام الملک طوسی نے بغداد کی دانش گاہ میں ایک نہایت عالم فاضل آدمی کو بعد تلاش بسیار کتابدار مقرر کیا۔ معلوم ہوا، کتابدار ذراسی شراب بھی پی لیتے ہیں۔ نظام الملک نے خط لکھا کہ ایسے شغل گراں کے لیے تنخواہ کافی نہ ہوتی ہوگی۔ آپ کی تنخواہ دوگنی کرتا ہوں، رقم حاضر ہے۔ اس مردِ فاضل کا جواب یادگار ہے۔ لکھ کر بھیجا خدا گواہ ہے کہ آپ کا مکتوب ملنے پر توبہ کرلی۔ کبھی نہ پیوں گا، جو رقم ارسال فرمائی اب بیکار ہے، واپس بھیجتا ہوں۔

آج کل معاملات ایسے الٹے ہوئے ہیں کہ ناگفتن اولیٰ تر۔ برّصغیر میں

جب تک انگریز رہے وطن کے افراد علاجی کا تدارک کرنے کے لیے اپنی ذات کو ایسی صفات سے آراستہ رکھتے تھے کہ اکثر اوقات حاکموں کا ضمیر اخلاقی اعتبار سے محکوموں کے سامنے شرمندہ ہو جاتا تھا۔ سجّاد حسین پرانی نسل کے لائبریرین تھے جب کہ اس برّصغیر میں لائبریری سائنس کا بالکل آغاز ہوا تھا۔ اس کی تنظیم و ترقی میں وہ بھی شریک رہے ہیں۔ اصل بات یہ کہ وہ پوری نسل علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں جامع کمالات ہستیوں کا مجموعہ تھی۔

سجّاد حسین بجد مختصر وجود کے انسان تھے۔ ذرا سا قد اور وزن اس قدر ہلکا کہ دیکھتے ہی شاعروں کی وضع کردہ غبارِ ناتواں کی اصطلاح یاد آتی تھی۔ جاڑا گرمی، برسات سر پر ہیٹ ضرور ہوتا تھا اور پورا سوٹ پہنتے تھے۔ صبح کے وقت ایک پہلوان قسم کا چپراسی ان کی سائیکل تھامنے کے لیے نیچے منتظر رہتا تھا۔ لائبریری کے ملازمین سجّاد حسین کے برتاؤ سے بہت زیادہ خوش رہتے تھے۔ سب نے چپراسی سے کہا، تجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ صاحب کو سائیکل سمیت اوپر اٹھا لایا کرے۔ ہمارے صاحب خواہ مخواہ سیڑھیاں چڑھنے کی زحمت کیوں اٹھائیں۔ سجّاد حسین نے اگلے دن دیکھا کہ چپراسی جو چینی سرکس کے کھلاڑی کی طرح ان کی سائیکل سر سے اونچی اٹھا کر ناچتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا تھا۔ کچھ عجیب سی حرکت پر آمادۂ اقدام ہے وہ فوراً سمجھ گئے کہ کاندھے پر بٹھائے گا اور اس کو پھٹکارا کہ خبردار یہ کیا کرتا ہے۔ پورے کالج میں ہماری ہنسی اڑے گی۔

●

# اعجاز جارچوی۔ مدّبّر

اعجاز حسین مذکورہ بالا سجّاد حسین کے بھائی تھے، جارچوی ان کے نام کا جزو تھا اور وہ اس کے اظہار میں نہایت احتیاط برتنے کے عادی تھے۔ وجہ بھی بیجا نہ

تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا اتنا لمبا عرصہ امروہہ ضلع مرادآباد میں گزارا کہ جارچوی کم اور امروہوی زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ وہاں امام المدارس ہائی اسکول میں زندگی بھر پڑھاتے رہے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ پرانے دستور کے مطابق ان کی شادی چھولس میں قریبی عزیزوں میں ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد انھوں نے اپنی پسند سے دوسری شادی امروہے میں کرلی۔ وطن کے لوگ مرحبا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ سنا ہے کچھ منچروں نے سہرا لکھ کر بشیر نقال کی طرف سے بذریعہ ڈاک روانہ کیا۔ پتہ مشکوک تھا، کسی دوسرے اعجاز حسین کے گھر پہنچ گیا۔ وہ لے بخیر گذشت۔ بشیر بھنڈیلا قسم کھاتا تھا کہ میرا نام فرضی لکھ دیا۔ البتہ اعجاز میاں جارچے آئے ہوتے تو میں ضرور سہرا گاتا۔ نقلیں سناتا اور انعام مانگتا۔ اعجاز حسین امام المدارس ہائی اسکول کے کامیاب استاد تھے۔ اسکول کے معلم کی سیرت کامل استحکام اور پختگی کی منزل تک پہنچنے کے لیے خاص طرح کا ریاض، ایثار اور انہماک چاہتی ہے۔ اعجاز حسین ہمیشہ ریاضت و ایثار کے مسلک پر قائم رہے۔

وہ سنجیدگی کے ساتھ جدید تعلیمی نظریات کو عمل میں لانے کی ضرورت اور اہمیت کے قائل تھے۔ ان نظریات کی تان آخر میں اسکول ماسٹر کی جان پر ٹوٹتی ہے۔ ماہرین تعلیم کا اتفاق ہے کہ بچہ جو مستقبل کا انسان ہے اس کی اخلاقی تعمیر و تربیت میں جو کچھ کسر اور کوتاہی دادی امّاں کی نگرانی یا بصورت دیگر ماں کی کوشش سے رہ گئی اس کو پورا کرنا اسکول ماسٹر کی ذمّہ داری ہے۔ اسکول کے استاد کی ملازمت میں کسی قسم کے مدارج نہ ہونے کا منطقی جواز یہیں سے برآمد کیا جاتا ہے۔ یعنی پہلی بات یہ کہ اسکول ماسٹر یکساں طور سے از اول تا آخر اپنا منصب انجام دینے میں لگا رہے۔ یکسانیت کے لیے ٹھہراؤ چاہیے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ دنیا کو ایسے نمونے کی ضرورت ہے اور آگے بھی رہے گی جو ایک طرف سادہ رہن سہن، مختصر ضروریات، اور کہنا چاہیے کہ گھٹیا اوقات پر خوشی سے قناعت کرے۔ دوسری طرف اونچے اور بڑھیا خیالات پر اصرار کرے اور ان کی

تبلیغ کرتا پھرے۔ گویا اس کی زندگی فکری اور عملی اعتبار سے گھٹیا اور بڑھیا دونوں چیزوں کی معجون سے مشابہ ہو۔ وہ خود مزے لے کر اس معجون مرکّب کا ذائقہ چکھے اور اپنے بال بچّوں کو چکھواتا رہے۔ ایسا آدمی کہاں سے آئے۔ اسکول کا معلّم بھی دنیا کی دوسری مخلوق کی طرح آج کچھ اور کل کچھ یعنی کہ ترقی کی بھاگ دوڑ میں لگ جائے تو وہ ساری ذمہ داریاں کون پوری کرے گا جن کا خاص اسکی ذات سے تعلق ہے۔ مثالی اسکول ماسٹر کی بابت لطیفہ ہے کہ کہ اسکی شکل پر مظلومیت برستی دیکھ کر کسی کا تعارف کے لیے جی چاہا تو اس نے بغیر منہ سے کچھ بتائے تیلی کے کولھو میں چکر لگاتے ہوئے بیل کی طرف اشارہ کر دیا۔ یعنی کہ میں اس قناعت پیشہ اور زحمت کش مخلوق کا قریبی رشتہ دار ہوں۔ البتہ اس کو بعض امتیازی مراعات اور حقوق بھی حاصل ہیں، مثلاً شاگردوں کی ڈنڈے سے خبر لینا جو پٹ کر احسان مانتے ہیں اور آخری دم تک دعائے خیر میں یاد رکھتے ہیں۔ فرض کیجیے وہ بقول شیخ سعدیؔ " در عنفوانِ جوانی " معاشقہ کر بیٹھے تو رائے عامہ زیادہ شور و غل نہ مچائے گی اور معاشرہ زیادہ شدید اعتراض نہ کرے گا! سَب جانتے ہیں کہ وہ کبھی شرعی حدود سے بیجد تجاوز نہیں کرتا اور جلدی سے شادی کر کے صالح اولاد پیدا کرنے میں لگ جاتا ہے۔ غرضکہ یہ جدید ماہرین تعلیم کے نہایت قیمتی افکار کا خلاصہ ہے۔ یونیورسٹی کا استاد اِن خشک ضابطوں سے آزاد ہوتا ہے وہ متنوع علمی شعبوں کا متخصّص یا کہہ لیجیے کہ ماہر کامل ہے، اور نوجوان طالبعلموں کو تخصیص کے بلند ترین درجے تک لے جانا اس کا کام ہے۔ کردار سازی اس کی ذمہ داری کے حدود میں قطعی نہیں آتی۔ طالب علم نیک سیرت ہوں یا بدخصلت وہ ان سب کو اپنے مضمون کی زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کردے گا۔ لہذا اس کے لیے لکچرر کی پوزیشن سے شروع کر کے پروفیسر کے مقام تک پہنچنے کی راہ کھلی ہے۔

سادات امروہہ کی ایک پوری نسل نے اعجاز حسین سے تربیت حاصل کی ہے

آج وہ تربیت یافتہ نسل ہندوستان سے پاکستان تک دنیا بھر میں پھیلی پڑی ہے اور سب ان کے فیض کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ بھی ان کے مقصد کی کامیابی اور خلوص کی سند ہے کہ ان کی ساری اولاد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ کئی بچے علی گڑھ پڑھنے آئے اور مُسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ شیعوں کی ذرا سی نیم سنجیدہ اصطلاح میں "قومیات" ایک پرانا لفظ ہے جو کسی اور لغت میں نہ ملے گا۔ ملک کی تقسیم سے پہلے اس کے تصوّر کے نتیجے میں بہت سے ادارے قائم ہوئے اور شیعہ برادری نے خوب ترقی کی۔ تقسیم کے بعد دنیا بدل گئی۔ یہاں کے باقی ماندہ شیعہ افراد پر خصوصًا جو بڑے لوگ کہلاتے تھے، ایسی اخلاقی پستی اور جھجک طاری ہوئی کہ وہ اپنا اجتماعی تعلق ڈھیلا کر بیٹھے اور بعض نے بالکل وابستگی ختم کر لی۔ حالانکہ پورا ہندوستان اجتماعی اکائیوں کا ملک ہے۔ کچھ اکثریت کے طبقۂ حاکم نے طرح طرح کی تحقیر آمیز اصطلاحات ایجاد کر کے ڈرایا۔ جن بزرگوں کے گھروں میں اشتراکیت داخل ہو گئی۔ اور جن خاندانوں پر کمیونزم کے مسلک کی پرچھائیں پڑ گئی انھوں نے تاریخ کے عوامل سے واقفیت کے باوجود عمدًا بددیانتی سے کام لیا۔ ہندوستان کی قدیم تاریخی روایت کے مطابق دختر کی پیش کش وفاداری اور اطاعت کی حتمی علامت تھی۔ مستقبل کی نسلیں یاد رکھیں گی کہ تقسیم کے بعد والے دور میں ہندوستان کے ممتاز ترین شیعہ افراد اور خانوادے بیجا ئی اور ناموس فروشی کا ریکارڈ قائم کرنے میں سب سے آگے ہو گئے۔ عہدہ کرسی اور لقمۂ تر کی بھیک اس شرط پر ملے کہ اپنی ہی جماعت کو نقصان پہنچایئے اور خود اپنے سوشل گروپ کے ساتھ بے انصافی کیجیے تو اس حرکت کے لیے بھی حاضر ہیں۔ ایسے مایوس کن بحران میں وہ قبیلۂ رندان بلاکش اور وہ گروہِ عاشقان پاک طینت جس نے فلاحی کاموں میں جان لگائی۔ اس زمرے میں اعجاز حسین کا نام بھی یاد رہے گا۔ وہ کئی برس تک انجمن وظیفہ سادات و مومنین کے مدیر اعلیٰ رہے، اس ادارے کی از سرِ نو تنظیم کی، اس کی مالی حیثیت کو مضبوط کیا اور اس سے فیضیاب ہونے والے نوجوانوں کی تعداد کو بڑھایا۔ یہ ادارہ تعلیم پانے والے شیعہ بچوں کی مالی مدد کرتا ہے۔ اعجاز حسین

نے اپنی سکریٹری شپ کے زمانے میں جارچہ چھولس کے کافی لوگوں کو رکنیت قبول کرنے اور چندہ دینے پر آمادہ کیا۔ ساتھ ہی تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد کے بارے میں پابندی سے پوچھتے رہے اور جس کو مستحق پایا اسکی جیب میں ضرور کچھ ڈال دیا۔ اسکول کے معلّم کی شخصیت میں دلچسپ پہلو اور مزیدار نکتے ڈھونڈنے والے بھی ایمانداری سے اعتراف کرتے ہیں کہ اس کے کردار کی استقامت کا اندازہ اجتماعی بحران کے وقت ہوتا ہے۔ وہ اجتماعی قدروں کو پائمالی سے روکنے میں مضبوط سہارا، اور ملّتوں کی ڈگمگاتی کشتی کو ثابت وسالم رکھنے کے لیے ایک بھروسے کا بادبان ہے۔

اگرچہ اس تذکرے کا مقصد تقسیم ملک و آزادی سے قبل والی نسلوں تک محدود ہے۔ البتہ اعجاز جارچوی کے بیٹے مدثر کا حوالہ بے محل نہ ہوگا۔ وہ مجھ سے چھوٹے ہیں۔ میں علی گڑھ میں لکچرر ہو چکا تھا اور وہ وہاں پڑھنے آئے تھے۔ مدثر نے اپنے والد کے ساتھ مل کر ایک بہت اچھا کام کیا۔ اعجاز جارچوی کی ادارت کے زمانے میں انجمن وظیفہ سادات کی ڈائمنڈ جوبلی منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر مدثر نے شیعہ معاصرین کی باتصویر ڈائرکٹری بڑی محنت سے ترتیب دی۔ ظاہر ہے کہ وہ جارچہ چھولس کے لوگوں کو مناسب جگہ دینا چاہتے تھے۔ میرے پاس بھی ان کا گشتی مراسلہ آیا جس میں مختصر خودنوشت اور فوٹو بھیجنے کا تقاضا کیا تھا۔ میں حد درجہ کاہل آدمی ٹھہرا۔ سوچتا رہ گیا کہ فوٹوگرافر تک جاؤں، تصویر اور مختصر احوال لکھ کر بھیجوں۔ آخر ڈائرکٹری چھپ کر آگئی۔ اس میں شامل نہ ہونے کا مدتوں افسوس رہا۔ مدثر اہلِ وطن کو جانتے ہیں۔ ان کو گشتی مراسلہ بھیجتے وقت دو ہدایتوں کا اپنے قلم سے اضافہ کیا۔ خادم پر بھی وہی پابندی عاید کی گئی۔ پہلی ہدایت یہ تھی کہ سوانح مختصر اور مناسب لکھیے۔ ایڈیٹر کو ولدیت کے علاوہ بیانات میں ہر طرح کی ترمیم کا مکمل اختیار ہوگا۔ یہ تو ایسی سخت ہدایت نہ تھی۔ اس قسم کا حق ہر ایڈیٹر اپنے لیے محفوظ رکھتا ہے۔ دوسری شرط اور زیادہ ٹیڑھی تھی۔ یعنی

زمینوں کی چھین جھپٹ، مقدمے بازی اور فوجداری کی باتیں ہرگز نہ لکھیے گا۔

●

# سیّد حسن، لئیق الحسن

سید حسن کی گزر بسر کا ٹھکانا بمبئی میں تھا جہاں انھوں نے ملک کی تقسیم سے پہلے اپنی زندگی کا خاصا طولانی عرصہ گزارا۔ غالباً کہیں پڑھاتے تھے۔ جارچہ چھولس کے سیّدوں میں ایک قبیلہ ایسا بھی تھا جس کی بود و باش باہر ضرور تھی، لیکن مقامی دلچسپیاں پیچھا نہ چھوڑتی تھیں۔ وطن سے ذرا کوئی خبر پہنچی یا خط موصول ہوا جس کا مضمون عموماً اس نوعیت کا ہوتا تھا کہ خط کو تار سمجھنا، روٹی وہاں کھائی تو پانی یہاں پینا، اور وہ خدا کے بندے فی الفور بستر باندھ کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ یہ سوچنا مزاج کے خلاف تھا کہ کاروبار ہے تو اس کا حشر کیا ہوگا اور نوکری ہے تو رہے گی یا جائے گی۔ اگر آدمی کھٹرل قسم کا ہوا جو بلانے کے خلاف عذر اور اعتراض لکھ کر بھیجتا تو اس کو برادری میں اچھی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا تھا اور اس کا سگا بھائی بھی یہی کہتا تھا کہ یہاں تمہاری کوئی عزّت نہیں ہے۔ اکثریت شیخ سعدی کے اس مقولے کی قائل تھی: خاکِ وطن از ملکِ سلیمان خوشتر، سید حسن دل و جان سے اس قبیلے میں شامل رہے اور کبھی اس سے باہر ہونا پسند نہ کیا۔ معاش کی مجبوریاں بمبئی لے جائیں وہ اور بات، ورنہ ان کا جی جارچے میں لگتا تھا اور بیشتر وہیں نظر آتے تھے۔ ویسے تو وہ عالم فاضل اور نیک سیرت انسان تھے مگر قصبے کے معاملات سے دلچسپی لینے میں کسی قسم کا تکلف نہ تھا۔ وہ اس اندیشے تک پہنچتے ہی نہ تھے کہ روزمرّہ اٹھنے والے نئے نئے قضیّوں سے طبیعت کی بنیادی شرافت کا کوئی ٹکراؤ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سید حسن کی نیکی کا ثبوت تھا۔ دوسری خوبی ان کی ذات میں اور تھی، یعنی جب کبھی

لوگوں نے پیچیدہ قسم کا جھگڑا کھڑا کرنا چاہا وہ اس میں پوری طرح ملوث نہ ہوئے اور اپنا دامن جہاں تک ہوسکا بچائے رکھا۔ اس کا خوش گوار نتیجہ سمجھیے کہ ساری دنیا اُن سے خوش اور وہ دنیا سے مطمئن رہتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۷عیسوی سے کافی عرصہ قبل صورتِ حال یہ تھی کہ معدودے چند افراد کو چھوڑ کر جارچہ چھولس کے بیشتر سیدّوں کی ملکیت میں قلیل بضاعت کی آراضیات رہ گئی تھیں اور ایک خوش حال کنبے کے لیے جتنی آمدنی درکار ہے وہ کاشت کے ذریعہ مہیا نہ ہو پاتی تھی۔ مجبوراً گھر کے کچھ لوگوں کو باہر ملازمت کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ پھر بھی آبائی املاک سے محبت میں فرق واقع ہونے کا سوال نہ تھا۔ وطن کے بیگھے بسوے ماضی سے تعلق کی نشانی تھے اور شہر میں سکونت کے باوجود ایک نہایت دلچسپ اگرچہ بظاہر نظر نہ آنے والی عادت سب کے اندر مشترک تھی۔ جیسے نظریۂ ارتقا میں کہا جاتا ہے کہ ترقی یافتہ حیوانوں میں پچھلے مرحلوں کی یادگاریں اور "رابطے" ضرور باقی رہ جاتے ہیں۔ گھر پر زمین جائیداد کا قصہ کھڑا ہوا، اور انھوں نے سب کچھ چھوڑ کر گھر کا رخ کیا۔ باہر کیا فراغت میسر تھی، کیا وقار حاصل تھا۔ یہ سب جانے دیجیے وہ جب تک سب معاملات درست نہ کرلیں واپس جانے کا نام نہ لیں گے۔ اتفاقاً کچھ ایسے ہی عنوان کا قضیہ ایک موقعے پر جارچے میں درپیش آیا۔ سید حسن فریقین میں سے ایک کو حق بجانب تصور کر کے اس کے حامی ہو گئے اور یہاں تک دلچسپی بڑھائی کہ بالکل اپنا ذاتی معاملہ بنا لیا اسی اثنا میں ایک دن چھولس آنا ہوا تو نوبت یہ تھی کہ یا تو مقدمہ شروع ہونے والا تھا یا ہو چکا تھا، میرے والد نے پوچھا، مولانا آپ کافی دن سے یہاں ٹہل رہے ہیں، بمبئی تشریف نہیں لے گئے، کیا معاملہ ہے، مولانا سید حسن نے جائیداد کا جھمیلا بتلانا شروع کر دیا۔ میرے والد کو صبح سے شام تک باتوں کے علاوہ مشغلہ ہی کیا تھا۔ وہ خاموشی اور صبر سے دوسروں کے خیالات سننا جانتے تھے۔ غور نہ کریں تب بھی حقّے کی نے منہ میں دبائے خاموش بیٹھے رہتے تھے شاید اس روز، جیسا کہ شاعروں کی اصطلاح ہے۔ کچھ طبیعت موزوں نہ رہی ہوگی۔ کبھی تو درمیان میں بول کر فریق اول

کی حمایت میں ایک جملہ کہہ گئے، اس پر مولانا سید حسن کو خوشی ہوتی تھی اور جوش کے ساتھ سمجھانے لگتے تھے۔ کبھی ایسا اعتراض نما سوال پوچھ بیٹھے کہ فریق ثانی کی طرف جھکاؤ ظاہر ہوتا تھا اور مولانا کھٹک جاتے تھے۔ آخر سوال جواب کو بے نتیجہ پاکر انھوں نے پلنگ پر پاؤں پھیلا دیے اور سو گئے۔ شام کو اٹھ کر جارچے جانے لگے تو میرے والد نے کہا، جلدی کیا ہے، ٹھہر جائیے، رات کو اور باتیں ہوں گی۔ مگر وہ معذرت کر کے چلے گئے۔ سال بھر نہ گذرا ہوگا کہ ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا، اور مولانا سیّد حسن اہل وعیال سمیت وطن کو خیر باد کہہ کر پاکستان رخصت ہو گئے۔ وہ صالح انسان تھے، اخلاق کا قرینہ جانتے تھے، اس کی دلآویزی اور تاثیر کا راز بھی معلوم تھا۔ دوسروں کے ساتھ ادب سے پیش آنا اور اپنی انا کو دبا کر رکھنا نکتۂ باریک سہی انھوں نے کسی طرح سیکھ لیا تھا۔ دانش مندوں کے نزدیک یہی شرافت کا منشا و معیار بلکہ یہی سیادت کی نشانی اور سند ہے۔

●

لبیق الحسن رسالہ "جارچہ" کے مولف، مولانا سیّد حسن کے بیٹے ہیں۔ فی الحال لاہور میں مقیم ہیں۔ ایک دفعہ وطن آنا ہوا (سنہ ۱۹۸۲ عیسوی) تو مجھ سے ملنے علی گڑھ تشریف لائے۔ اتفاقاً میں اس دن علی گڑھ میں موجود نہ تھا۔ انھوں نے باہر کسی سے پوچھا اور واپس ہو گئے۔ میں آیا اور خبر ہوئی تو اندیشہ گزرا کہ خدا معلوم گھر کا پھاٹک کھول کر اندر کی طرف نظر ڈالی اور بال بچوں کے پاس تک آئے بھی یا نہ آئے۔ بعض لوگ عادتاً اپنے عزیزوں کی بیویوں سے بدکتے ہیں۔ اور وجہ ہو نہ ہو دل کو شکایت قبول کرنے کے لیے خواہ مخواہ پہلے سے آمادہ کیے رہتے ہیں۔ کبھی ان کا دور بھاگنا حق بجانب بھی ہوتا ہے۔ دونوں ہی معاملے صحیح ہیں۔ میں جارچے پہنچا اور خدمت میں نیاز حاصل کیا۔ لبیق الحسن کا اور میرا عمر کا تفاوت زیادہ نہ ہوگا بس اتنا سمجھیے کہ وہ خوب جوان ہو گئے تھے اور میں لڑکا سا تھا۔ سادات جارچہ چھوس عموماً رنگ اور شکل وشباہت کے معاملے میں غنیمت واقع ہوئے ہیں۔ لبیق الحسن

نے علی الخصوص نوجوانی میں جاذبِ نظر شخصیت پائی تھی، وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے، ذرا سا مبالغہ سہی، پر خدا بخشے خوب ہی کہہ گیا ہے. کہ زلیخا مل جاتی اور حضرت یوسف کی بہت تعریفیں کرتی تو ہم تبلاتے: تصویر دکھا دیتے ترا نام نہ لیتے۔ خوب صورت کا لفظ جدید اردو میں عورتوں نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے اس لیے نہ لکھوں گا برسوں بعد ملاقات ہوئی تو محسوس ہوا کہ لئیق الحسن، یعنی وہ جن کو تقسیم سے پہلے دیکھا تھا، ماہ وسال کی منزلوں میں کہیں پیچھے رہ گئے ہیں۔ صوفیوں کی سی وضع تھی ڈاڑھی لاہور سے روانہ ہوتے وقت یقیناً نورانی رہی ہوگی۔ جارجے کے حجام کی قینچی نے سارا نور تباہ کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی تالیف کا ایک نسخہ عنایت کیا۔ ہم تینوں بھائیوں کے نام لکھے اور اپنے دستخط کیے۔ یعنی تم سب مجھے یاد رکھنا۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ میں قلم فرسائی کرنے بیٹھا تو لئیق بھائی کا رسالہ نظر کے سامنے رہا اور اس سے مسلسل استفادہ کیا۔ چونکہ وہاں سے کافی مستعار لیا اس لیے اعتراف لازم ہے۔

●

## محمد الیاس

محمد الیاس جارجے کے معروف بزرگ تھے۔ ان سے مل کر ہمیشہ ایران کا اوّلین شاعر، رودکی یاد آجاتا تھا جس کی حسرت انگیز نظم ہے کہ افسوس تم نے رودکی کو جوانی میں نہ دیکھا۔ اصل میں ایسے شریف افراد ہر جگہ مل جائیں گے. جو ایک عمر تک دنیا کی دلچسپیوں اور رنگا رنگیوں میں خوب ہنسی خوشی شریک رہتے ہیں پھر جیسے ہی عمرِ عزیز دوسرے مرحلے میں داخل ہوئی ان خدا کے بندوں کو دنیا ہزار عیبوں سے آلودہ نظر آنے لگتی ہے اور وہ دل وجان سے اس کی درستی واصلاح میں لگ جاتے ہیں۔ محمد الیاس کی جوانی کا دور سنا ہے کہ دہلی میں گزرا،

اس وقت انگریز نئی دہلی آباد کر رہے تھے اور وسیع پیمانہ پر شاندار عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا محمد الیاس کو نہایت قاعدے کی ملازمت مل گئی۔ اور وہ عرصہ دراز تک فراغت کے ساتھ رہے۔ دہلی کی شیعہ برادری میں ان کا اثر اور احترام تھا۔ انھوں نے اجتماعی فلاح کے بہت سے کاموں میں حصہ لیا۔ شہید رابع کے مزار پنجہ شریف کے دروازے پر آج بھی ان کے نام کا پتھر نصب ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو وطن کا رخ کیا۔ ہمارے وطن میں عام قاعدہ ملازمت پیشہ لوگوں کا یہ تھا کہ آبائی رہائش گاہ کی توڑ پھوڑ کرا کے اس کی جگہ نیا مکان ضرور بناتے تھے۔۔ محمد الیاس نے بھی اس قدیم سنّت پر عمل کیا اور چھوٹی سی مگر خوب صورت عمارت یادگار چھوڑ گئے۔ جہاں عشرۂ محرّم کے دوران مجالس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے وہ اپنے روزمرّہ کے اوقات مطالعے میں بسر کرنے کے عادی تھے اور ان کے پاس کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ انھوں نے خاص طور سے مذہبی علوم کا عرق ریزی اور شغف کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ اور اس قدر جامع معلومات رکھتے تھے کہ برادری میں مولوی مشہور ہو گئے تھے اور واقعتاً مولویت کا لقب ان کے لیے حق بجانب تھا۔ البتہ ایّام جوانی کی ایک خوبی بعد والے مرحلے میں بھی ساتھ لگی رہ گئی تھی، اور وہ ان کی زندہ دلی تھی۔ مولانا محمد الیاس، جیسا کہ مولوی حضرات کی بابت تصور ہے، خشک مزاج آدمی نہ تھے۔ بلکہ نہایت ظریف طبع اور زندہ دل واقع ہوئے تھے۔ وہ کئی دفعہ مقامات مقدسہ کی زیارت کو تشریف لے گئے۔ فارسی روانی سے بولتے تھے۔ عربی سمجھ لیتے تھے بولتے نہ تھے۔ ایران و عراق کے معاشرے کا نزدیک سے مشاہدہ کیا تھا۔ وہاں کی عورتوں کے قصّے خوب مزے سے سناتے تھے۔ مگر ہوا یہ کہ ہر دفعہ اہل و عیال کو ساتھ لے کر گئے۔ خوش فکر لوگ ہنس کر کہتے تھے کہ آپ کی زیارت قبول نہ ہوئی ہوگی۔ تنہا جانا چاہیے تھا۔ اس قسم کی باتوں کو مولانا محمد الیاس مزاح المومنین کے خانے میں رکھتے تھے کسی شاعر نے روشنئ طبع کے لیے کہا ہے کہ "بر من بلا شدی" وہی بات زندہ دلی

پر بھی کبھی کبھی صادق آجاتی ہے۔ مولانا اکثر نکاح بھی پڑھا دیتے تھے۔ چھوٹس محلہ گڑھی میں ایک خاندان آباد ہے جس قدر جاہل اتنے ہی عقل سلیم سے پیدل اور بیگانہ۔ ان کی لڑکی کا نکاح اور لڑکے والا مولانا محمد الیاس کو لے آیا۔ کسی مسخرے نے مذاق میں لڑکی کے باپ سے کہدیا ہوشیار رہنا یہ مولوی صاحب اپنا نکاح پڑھ لیتے ہیں۔ وہ سرِ محفل نکاح پڑھوانے سے انکاری ہوگیا، لڑکے والوں کی ضد کہ یہ بڑی توہین کی بات ہے۔ نکاح مولانا محمد الیاس ہی پڑھیں گے۔ مولانا نے ڈنڈا سنبھالا' لاحول بھیجی' اور اپنی بہن یادری بیگم کے گھر کو چل دیے۔ ساری بارات اٹھ کر بھاگنے لگی۔ نقہ بزرگوں نے آوازیں لگائیں میاں ذرا ٹھہرو، مولانا پھر واپس آ گئے، رات بھر ہنگامہ رہا، فجر سے پہلے اسی شخص کو حرم آیا جس نے چپکے سے فتنہ اٹھایا تھا۔ جاکر سمجھایا کہ پڑھنے دو، دیکھ لیں گے، تمہارے مقابلے کا لٹھ کہاں سے لا سکتے ہیں۔ لڑکی وہیں جائے گی جہاں تم چاہو گے۔ بہ دلیل صاحبِ معاملہ کی سمجھ میں آ گئی۔ اور صبح ہونے کو تھی تب مولانا نے مترنم لہجے میں نکاح کا صیغہ جاری فرمایا پاکستان بنا۔ اور چل چلاؤ کی گڑبڑی مچی تو مولانا محمد الیاس کو اپنی کتابوں کا سخت قلق تھا۔ کہتے تھے جانا پڑا تو اس قدر ضخیم سرمایہ کیونکر لے جاؤں گا۔ انھوں نے میرے باپ کو خط لکھا کہ تمہارا خانوادہ ہمیشہ سے پڑھے لکھوں کا رہنا آیا ہے سنا ہے تمہارا کوئی لڑکا طالب علم ہے اگر اس کو کتابیں رکھنے کا سلیقہ آگیا ہو تو میری کچھ الماریاں یہاں سے منگوالو۔ میں اشارہ پاتے ہی جا رہچے پہنچا۔ ہمارے گھر ان دنوں ایک درمیانی سی گھوڑی تھی۔ بد لگام نہ تھی۔ مگر اتفاق کہنا چاہیے کہ مولانا کا گھر نزدیک، وہ کبھی دلکی کبھی سرپٹ، قابو میں آنے کو نہ کہتی تھی۔ دروازے کے سامنے طوفان بے تمیزی کی آہٹ پاکر مولانا باہر نکلے۔ مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور یقیناً ان کو مایوسی ہوئی۔ بالآخر جہاندیدہ انسان تھے۔ سمجھ گئے کہ اس لڑکے کو کتابیں دینا یعنی کہ قطعی دریا میں غرق کرنا ہوگا۔ مولانا کا خیال بے جا نہ ہوگا۔ مجھے خود بھی اس وقت تک خبر نہ تھی کہ اپنی عمر شریف کتابوں میں گزاروں گا۔ غالباً کتابوں کی فکر ہی تھی جس نے مولانا کو پاکستان نہ جانے دیا اور وقت موعود آیا تو وطن کی خاک میں سو رہے (سنہ ۱۹۵۰ عیسوی)۔

مولانا کے سب سے بڑے بیٹے امیر حیدر میرے باپ کے ہم سن تھے. خوش مزاج اور محبت والے آدمی تھے. کبھی جارچے آنا ہوتا تو چھوپس ضرور ملنے آتے تھے:

آئینہ دلان نکتہ گزران ہمہ رفتند

## سیّد محمّد

سیّد محمد جارچے میں رہتے تھے۔ وطن سے باہر نہیں نکلے، معقول آراضی زیر کاشت تھی، فراغت سے گذر بسر ہوتی تھی. جارچے میں سب سے ممتاز خاندان نوگھریا کہلاتا ہے اور عرفِ عام میں متوّلی بھی کہتے ہیں. نوگھریا کے معنی مسعودالحسن اپنے "تذکرۃ الانساب" میں بتلانے کی کوشش کرتے ہیں، شاید واضح نہ کر پائے، متولی کا مطلب صاف ہے، یعنی دادا کے مزار کی جائیداد اور بڑی چوپال کی تولیت اس خاندان کے پاس رہتی آئی ہے۔ یہ عمارت سیّدوں کی اوّلین نشست گاہ ہونے کے علاوہ امام باڑہ بھی ہے۔ جہاں عزاداری کا قدیم سامان اور بزرگوں کے تبرّکات محفوظ ہیں. بڑی چوپال کا کلید بردار ہونا برادری میں خاص اعزاز کی علامت ہے۔ سید محمّد کے تین بھائی اور تھے۔ رضی محمد اور ولی محمد ملازمت کے سلسلے میں باہر رہے. وصی محمد کو وہ اپنے پاس رکھتے تھے. سیّد محمد خود بھی چاہتے تو مزے سے باہر ملازمت مل جاتی، پڑھے لکھے آدمی تھے اور معاملات میں اس قدر ہوشیار کہ تھوڑی سی ذاتی سوجھ بوجھ کسی نیاز مند کو بخش دیتے تب بھی گرہ میں کافی بچی رہ جاتی. مگر خاندانی روایات کا تقاضا تھا کہ وطن نہ چھوڑیں تاکہ خاندان متولی کے مقامی اثرات میں فرق نہ آئے اور پورا قصبہ ان کی موجودگی کا احساس کرے سید محمد کے مزاج میں زمینداروں کا ساٹھسا نہ تھا اور حیثیت کے باوجود طمطراق سے پرہیز کرتے تھے. برادری میں لازماً حتیٰ کہ غیر برادری میں بھی، کسی کے گھر کوئی

تقریب ہو، اُن کو بذات خود والنیٹر بن جانے میں تکلّف نہ ہوتا تھا۔ زمیندار دوسروں کو حکم دینے کے عادی ہوتے تھے خود رضاکار بن کر کام کرنا نہایت کسرِشان کی بات تھی۔ سیّد محمد اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ تھے۔ آدمی کے روزمرّہ معمولات سے اسکی سیرت سمجھ میں آتی ہے۔ سیّد محمد کا معمول یہ تھا کہ صبح ہوتے ہی برادری کی تمام بڑی بوڑھیوں کا دروازہ کھٹکھٹانا، خیریت پوچھنا اور ہر ایک سے سودا سلف کی فہرست لے کر بازار پہنچ جانا، وہاں متفرق سامان کی خریداری کرنے اور واپس سب کو دینے میں تقریباً دوپہر ہو جاتی تھی۔ ان کو سامان سے لدا دیکھ کر کوئی ہنس پڑتا تو وہ کہتے تھے، تم کو کیا معلوم۔ جارچے میں لیڈر وہی ہے جس کو بڑھی بوڑھیوں کی پشت پناہی حاصل ہو۔ عورتوں کی بدلگامی سے جان بچانا بھلے آدمی کی اولین ضرورت ہے۔ سیّد محمد کے چھوٹے بھائی، ولی محمد کو میرے والد اپنا خاص الخاص دوست بتاتے تھے۔ انھوں نے جو نیا باغ لگایا اس کا نام ولی باغ رکھا۔ چھولس میں کسی نے ولی باغ نہ کہا اور عام زبانوں پر ولی باغ نہ چڑھا۔ چونکہ بیکار مباش کچھ کیا کر۔ ایسا مضمون ہے جو میرے والد صاحب قبلہ پر بہت صادق آتا تھا۔ وہ اپنے کو مشغول رکھنے کے لیے طرح طرح کے پروگرام سوچتے رہتے تھے۔ دادا کا عرس، سالانہ مجالس، شیعہ کانفرنس کا علاقائی اجلاس، آموں کی فصل میں مشاعرہ، برسات اچھی ہوگئی تو کبھی کبھار پہلوانوں کا دنگل، یا مصاحبوں کا جو مشورہ بھی پسند آگیا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ سب نہیں تو اکثر معاملوں میں چندہ ضروری تھا۔ ولی محمد سے حق دوستی جتانے کے لیے میرے باپ سرفہرست ان کا نام لکھتے تھے۔ اور چندے کی مہم پر نکلنا ہوتا تو سب سے پہلے موٹی رقم ولی محمد سے وصول کر کے لاتے تھے۔ ولی محمد جارچے ضرور آتے ہوں گے، چھولس کبھی نہ آتے تھے۔ چندہ دے کر جان چھڑا لیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر مہدی حسن کا نام خاندان نوگھریا کے بزرگوں میں یاد رکھنے کے قابل ہے وہ سید محمد وغیرہ کے والد علی محمد کے بھائی تھے، لکھنؤ میں ڈاکٹر تھے۔ ملازمت کا عرصہ گزار کر جارچے میں سکونت اختیار کر لی انکی ساری اولاد نے

اعلیٰ تعلیم میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ مسعود الحسن "تذکرۃ الانساب سادات جارچہ" کے مولف، ڈاکٹر مہدی حسن کے بیٹے ہیں۔ دوسرے بیٹے بشیر حسن بھی ڈاکٹر تھے اور میرٹھ میں پریکٹس کرتے تھے۔ یہ لوگ میری دادی اماں کے ننھیالی عزیز تھے۔ غالباً سارے بھائیوں میں منظور حسن کو عزیزداری برتنے کا سلیقہ سب سے زیادہ آتا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ میری دادی کے پاس ضرور ملنے آتے تھے۔
ڈاکٹر مہدی حسن کی نسل میں مہدی رضا اور ان کے بھائی ناصر میرے ہمسن ہیں۔ میرا بچپن میں جارچے جانا ہوتا تو ان دونوں بھائیوں کے ساتھ کھیل کود میں بہت جی لگتا تھا۔ مہدی کو بہت زیادہ شرارتیں یاد تھیں۔ اتفاقاً کم وبیش نصف صدی بعد کراچی میں ملاقات ہوگئی (سنہ ۱۹۹۲ عیسوی) وہ فی الحال میری خالہ زاد بہن توحید بانو کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ ان کے منہ پر براہ راست لمبی سفید ڈاڑھی دیکھ کر عجیب سا لگا۔ ہمارے جارچہ جلوس میں خاص طریقے سے سوئیاں نکالنے کا رواج ہے۔ سوئیاں نیچے لٹکتی جاتی ہیں اور ایک بڑی بی لڑکیوں کو حکم جاری کرتی رہتی ہیں: "پنکھا جھلتی رہو۔" ایسا ہی نقشہ دیکھنے میں آیا۔ مہدی تکلف سے پیش آئے اور شرما کر ملے۔ پندرہ بیس منٹ بیٹھے ہوں گے۔ میں ان کے قیافے میں اپنی یادوں کے مہدی کو ڈھونڈتا رہا۔ ناصر کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے خشک اور مختصر جواب دیا: "کوئٹہ میں ہے۔" مجھے بھی بے تکلف ہوتے جھجک سی آئی۔ یہ فقرہ میرے منہ سے نکل کر مہدی کی طرف بھاگنا چاہتا تھا اور میں رو کے بیٹھے رہا کہ حضور، آپ سے مل کر جارچے کی پرانی یادگار، ہالوں کے تعزیے کی زیارت ہوگئی۔

## مرتضیٰ حسین۔ لیاقت حسین

مرتضیٰ حسین جارچے کے مکھیا تھے۔ بولاوالوں کے خاندان سے تعلق تھا۔ اور

اس خاندان کو قصبہ میں غیر معمولی حیثیت حاصل تھی۔ خاندان کے بزرگ بو علی تھے، عرفِ عام میں بولا مشہور ہو گئے۔ قصبے سے باہر تالاب کے کنارے مرتضیٰ حسین کی بلند کرسی کی بیٹھک تھی۔ جہاں وہ اکثر اوقات درباری انداز کا مجمع جمائے رکھتے تھے عام قاعدہ ہے کہ لقب یا خطاب نام کے مقابلے میں زیادہ مشہور ہو جاتا ہے۔ لوگ ان کو مہندی کے خضاب کی رعایت سے لال داڑھی والا کہتے تھے۔ وہ اور ان کے کنبے کے لوگ آٹھ گاؤں کی زمینداری میں حصے دار تھے۔ مگر زمینداروں والی قباحت نے کبھی پیچھا نہ چھوڑا، یعنی آمدنی سے خرچ کی سطح اوپر چلی گئی اور کبھی کبھی سرکاری مال گزاری کی ادائیگی میں بھی زحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی مرتضیٰ حسین کے ٹھاٹ میں زندگی بھر کسی طرح کی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ ان کا علانیہ ضابطہ یہ تھا کہ جارچہ ہماری چھڑی کی نوک پر ہے اور جب تک ہم یہاں بیٹھے ہیں اسی انداز سے چھڑی کی نوک پر رہے گا۔ سارا قصبہ تصدیق کرتا تھا کہ دریں چہ شک۔

ہندوستان کی قدیم روایت کے مطابق کسی فرد کا مکھیا ہونا خاص امتیاز کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی چھ سو برس سے اوپر کی حکومت کا دور سچ پوچھیے تو مکھیا راج تھا اور مکھیا کو وسیع مراعات حاصل تھیں۔ یہ رسم بھی خلاف واقع نہ تھی کہ جس طرح اکثر شہروں میں قاضی یا مفتی کا اعزاز موروثی، اسی طرح دیہات میں مکھیا مدتوں تک ایک ہی خاندان میں ہوتا چلا جاتا تھا۔ سیاسی مفکرین کا مانا ہوا اصول ہے کہ حکومت دھونس زبردستی سے آٹھ دن بھی نہیں چلتی۔ محکوموں کی منشا اور رضامندی پہلی شرط ہے۔ امور کو سادگی سے نمٹانا اور سب کے لیے سہولت فراہم کرنا حاکموں کی نہ صرف ذمہ داری بلکہ دانش مندی کی کسوٹی بھی ہے۔ عموماً مکھیا کا رابطہ فوجدار سے نیچے درجے والے انتظامی کارکنوں اور افسروں سے رہتا تھا۔ زیادہ سنگین واردات ہو جائے تو فوجدار خود بھی مکھیا کو بلا کر پوچھ لیتا تھا کہ بتاؤ، ظلم واقع شد؟ اتنی فارسی مکھیا سمجھتا تھا۔ اگر اس کی پگڑی اقرار میں ہل گئی کہ واقع شد، تو سمجھیے کہ فوراً سزا

کا حکم صادر ہو گیا اور مکھیا جی کی گواہی گذری کہ حضور، میں نے اپنے آدمی بھیج کر تصدیق کرالی، کوئی ظلم نہیں ہوا معاملہ جھوٹا ہے، تو فوج دار استغاثہ خارج کرکے مدعی کو عدالت سے باہر نکال دیتا تھا۔ نہ لاتعداد پیشیاں، نہ وکیلوں کی جھنا جھٹی نہ بے حساب رقم خرچ ہوئی، اور نہ مدت تک جان پھنسی رہی، اسی طرح اگر مکھیا عامل کو جاکر اطلاع پہنچائے کہ حضور، سوکھا پڑ گئی، خلقت بھوکی مر رہی ہے، تو گاؤں کی مال گزاری پوری یا نصف معاف ہو جاتی تھی۔ مکھیا اپنے علاقے اور اپنی برادری کا نہایت معزز آدمی ہوتا تھا۔ اور خواہ مخواہ جھوٹ بولنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ مرتضیٰ حسین مکھیا کے ضمن میں ان باتوں کا اتفاقیہ ذکر اس لیے آ گیا کہ آج کل مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کا ایک حربہ اور ہتھیار یہ بھی ہے کہ ان کے عہد حکومت کو طرح طرح کے الزام عاید کرکے بدنام کیا جاتا ہے۔

لیاقت حسین مذکورہ بالا مرتضیٰ حسین کے بھتیجے تھے۔ وہ جارچے کے سیدوں میں آخری بزرگ تھے جن کی وضع اور سیرت میں زمینداروں والی خوبیاں پوری طرح جھلکتی تھیں۔ لیاقت حسین کے قیافے سے ظاہر ہوتا تھا کہ ضرور بڑے آدمی ہیں اور وہی کیفیت ان کی نشست برخاست کے آداب سے ثابت ہوتی تھی میں نے آنکھ کھول کر ان کے چہرے پر بالکل سفید ڈاڑھی دیکھی حالانکہ وہ بوڑھے نہ ہوئے تھے۔ لیاقت حسین کی داڑھی ایسی نہ تھی جیسی کہ اہلِ سنت حضرات حج سے واپس آکر منہ پر لٹکا لیتے ہیں کہ مجبوراً یہ بھی سہی، اور نہ شیعوں کی مختصر داڑھی سے مشابہت رکھتی تھی جو خشخشی کہلاتی ہے۔ چہرے کے صاف اور کھلتے ہوئے رنگ پر اُن کی داڑھی کا وقار دیکھ کر مغل عہد کے امرائے کبار یاد آجاتے تھے۔ اُن کے پاس وسیع زمینداری تھی۔ اور آٹھ گاؤں میں حصہ دار تھے۔ خاتمہ زمینداری سے قبل آٹھ گاؤں کا حصہ دار معمولی آدمی نہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر ان کا وہی مضمون تھا، جس کو فارسی میں کہتے ہیں، سگ باش برادرِ خورد مباش۔ وہ ہر جگہ چھوٹے حصہ دار تھے۔ بڑے حصہ دار ساری آمدنی وصول کرکے عیش مارتے تھے اور ان کو اپنا

حصّہ لینے کے لیے طرح طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔ اس صورت حال کی بنا پر اُن کی عمر عزیز کا خاصا عرصہ مقدمے بازی اور عدالت کچہری کے چکر کاٹنے میں گزرا۔ پھر بھی جیسا کہ کوئی شاعر کہہ گیا ہے، اس مصیبت میں بھی اپنا دور چلتا ہی رہا۔ مجھے تفصیلات کا علم نہیں البتہ قیاس کہتا ہے۔ لیاقت حسین ویسی ہی جنس کے زمیندار رہے ہوں گے جن کی زندگی میں رہن یا بیع یعنی زمین کا تیا پانچہ کرنے کی نوبت معمولاً آتی رہتی ہے۔ وہ بظاہر فضول خرچ تو نہ تھے بس اتنی بات تھی جیسا کسی نے بتایا کہ جوانی میں سواری کا شوق تھا اور اصطبل میں متعدد انتخاب گھوڑے رہتے تھے مگر اپنے طبقے کی عادات و روایات کا خیال ہر زمیندار کو رکھنا پڑتا تھا اور وہ بھی رکھتے تھے مثلاً ان کا دسترخوان وسیع تھا اور جار چے میں باہر سے جو بھی آیا اس کے ساتھ تواضع سے پیش آتے تھے۔ کوئی اہل سوال پہنچ گیا تو اس کی حاجت پوری کرنا زمینداروں کی بلا استثنا عادت تھی۔ لیاقت حسین کے لیے کفایت شعار بن کر رہنا ممکن نہ تھا۔ زمیندار سمجھتے تھے کہ اس قسم کی حرکت اپنے طبقے کے ساتھ دغا بازی ہے۔ ہمارے گھر کی بولا والوں سے پرانی رشتے داری رہی ہوگی حال میں تو کوئی ہوئی نہ تھی۔ میرا بیٹا آفتاب ہادی کوئی سال بھر کا رہا ہوگا کہ میری ماں نے گود میں لے کر کسی بی بی کو یاد کیا اور کہا اس لڑکے کے ہونٹ ان کے سے ہیں وہ بولا والوں کے خاندان کی تھیں اور ہمارے کسی بزرگ سے اُن کی شادی ہوئی تھی۔ لیاقت حسین کی ساری اولاد جوان ہو کر جار چے سے باہر منتشر ہوگئی وہ بیشتر اکیلے رہتے تھے۔ کھانا بھتیجوں کی بیویاں تیار کر کے بھیج دیتی تھیں۔ مگر جس شخص کے پاس وقت بے وقت مہمانوں کی آمد لگی رہتی ہو اس کے لیے صبح سے شام تک کون مطبخ گرم رکھے۔ ظاہر ہے خاندان میں کوئی عورت خوشی سے ان کی خدمت بجانے کے لیے تیار نہ تھی۔ آخر انھوں نے میری ماں کے پاس کہلوایا کہ میرا آٹا بھنکا بھنکا پھرے ہے۔ دو وقت کی روٹیوں کا محتاج ہوں کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ میری ماں کوشش میں لگ گئیں۔ ہمارے خاندان میں علی حیدر

نام کے ایک بزرگ لکھنؤ کی خاتون سے نکاح کرکے وطن لے آئے تھے۔ وہ بڑی سلیقہ منداور وضعدار بی بی تھیں۔ بڑھاپے کی شادیوں کا حشر معلوم ہمارے دادا علی حیدر کا انتقال ہوگیا۔ دادی لکھنؤ والی اکیلی اور تقریبًا بے سہارا رہ گئیں میری ماں نے دادی لکھنؤ والی کو چپکے سے آمادہ کرکے لیاقت حسین کے ساتھ نکاح کرادیا۔ ہمارا خاندان چھوس میں کشمیری کہلاتا ہے کشمیریوں کو یہ بات اچھی نہ لگی اور بعد میں انھوں نے تھوڑی سی لے دے مچائی۔ فریاد عباس ہمارے خاندان میں سب سے زیادہ سن رسیدہ بزرگ تھے۔ تقریبًا سو برس کی عمر پائی۔ وہ کہتے تھے۔ اجی اس کو نکاح کرنا ہی تھا تو مجھ سے کرلیتی۔ بتاؤ چارچے پہنچی ہے۔ دادی لکھنؤ والی اپنی سسرال والوں کی ایسی ہی باتوں سے اکھڑتی تھیں۔ فقط میرے باپ کا رویّہ مکمل غیر جانبداری کا رہا۔ نہ خوشی نہ افسوس، شادی ہوگئی تو کیا غضب ہوا، نہ ہوتی تو کونسا نقصان تھا۔ لیاقت حسین اور دادی لکھنؤ والی دونوں کی اچھی گزرنے لگی۔ مگر شاید زیادہ دن چارچے میں نہ رہ پائے۔ پاکستان بن گیا اور عام چل چلاؤ پھیلا تو وہ بھی مہاجرت کرگئے۔ عرصہ نہ گزرا ہوگا کہ لیاقت حسین کا ایک خط میرے باپ کو موصول ہوا۔ "اشد ضروری سمجھ، تحصیل میں جاکر میری ساری جائیداد کی نقلیں بنوا، ورنہ اول تو یہاں ملا ہی کیا، جو کچھ تھوڑا بہت ملا سب میرے ہاتھ سے چھنا جارہا ہے نقلیں فوراً بھیج۔ تحصیل کے اہل کاروں سے کوئی کام کرالینا آج کل کی بات تو جانے دیجیے مغلوں کے زمانے میں بھی آسان نہ تھا۔ میرے والدصاحب اپنے اوپر اعصابی امراض، گھبراہٹ، حبس ریاح، اور اختلاج طاری کیے گھر میں لیٹے تھے۔ کہاں جاتے۔ خدا جانے لیاقت حسین کی معاوضے میں حاصل کی ہوئی جائیداد کا کیا حشر ہوا، اور ان پر کیا گزری۔ وقت ذرا سا آگے کھسکا، اور پھر دادی لکھنؤ والی کا خط میری ماں کے نام آیا۔ نہایت لمبی داستان سے بھرپور تھا۔ خلاصہ یہ کہ لیاقت حسین جب تک تھے میرے عیش و آرام میں کوئی خلل نہ پڑا ادھر سب نے مل کر مجھ پر وہ سختی پکڑی ہے کہ خدا کی پناہ۔ میں نکاح کرکے پچھتاتی ہوں، تو نے مجھے کس مصیبت میں

پھنسایا۔ غالباً میری ماں نے خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ اتنی دور بیٹھی کر بھی کیا سکتی تھیں۔ مجھے یاد ہے، ہم لوگ آخری دفعہ ملنے کے ارادے سے گئے تو لیاقت حسین نے تبلایا اب سب طے ہو گیا ستمبر کے مہینے میں جانا ہے۔ دادی لکھنؤ والی برجستہ بولیں، دیکھتے ہیں وہ ستمگر کب آئے گا۔ لکھنؤ کی رعایت لفظی کا کمال دادی لکھنؤ والی کو خوب آتا تھا۔ لیاقت حسین جس دن رخصت ہوئے پورے علاقے نے کہا، جارچہ آج کے بعد سے سیدوں کا نہ کہلائے گا۔

●

# حکیم یوسف حسین

حکیم یوسف حسین، میری دادی اماں صغرا بیگم کے ماموں تھے۔ طبیبوں کے خاندان سے تعلق تھا۔ احتراماً حکیم کا لقب لوگوں نے نام کے ساتھ جوڑ دیا تھا، ورنہ طبابت کو انھوں نے باقاعدہ پیشہ اور مشغلہ کبھی نہیں بنایا۔ اور نہ مطب کھول کر بیٹھے۔ ابتدائی دور میں ملازمت کی، پھر وطن واپس آ گئے۔ میرے والد نے ایک دفعہ ضمناً بتایا کہ گنج باسودا ضلع بھیلسہ وسطی ہند میں جہاں ہماری زمینداری تھی وہاں اسٹیشن ماسٹر رہے تھے، اس کا مطلب یہ کہ ریلوے میں ملازم تھے، مجھے علم نہیں کہ کچھ پنشن بھی پاتے تھے البتہ جارچے میں زرعی آراضی تھی، اس کی آمدنی سے ان کے مصارف کی کفالت ہو جاتی تھی۔ کوئی اولاد نہ تھی۔ یعنی کہنا چاہیے کہ زن و فرزند کے بوجھ سے فارغ البال تھے۔ نہ جدی سلسلے میں براہ راست کوئی عزیز تھا۔ صغرا بیگم کو وراثت پہنچی۔ حکیم صاحب نے قبل وفات میری دادی اماں سے وصیت کی کہ مکان اور جو کچھ اثاثہ اس کے اندر ہے وہ سب تمہارا۔ رہ گئی مزروعہ زمین، اسکی بابت مجھے کئی پشتوں سے علم ہے کہ جس کے پاس گئی وہ لاولد رہا۔ یہ تم کو اور تمہاری واحد اولاد علی ہادی کو نہ دوں گا، اس کی بابت میں ایک فیصلہ کر چکا ہوں۔

مسجد، اماباڑے، اور دیگر کارِ خیر کے لیے وقف کر جاؤں گا۔ اُن کی اسی وصیت پر عمل ہوا۔ میری دادی اماں نے مکان کسی صاحب کو فروخت کر دیا اور جو رقم پائی اس کا فائدہ ہم نے اٹھایا۔ فی الحال میں اور میرے دونوں بھائی تقی ہادی اور نقی ہادی حکیم یوسف حسین کا نام لینے والے اور ان کی یادگار ہیں۔ ان کی زندگی واقعی طور سے ایک حکیم کی زندگی تھی اور ان کے روزمرّہ معمولات میں حکیمانہ اطوار جھلکتے تھے حکمائے یونان اور اُن کی متابعت کرنے والے مسلمان مفکرین کی نمایاں صفت عمر دراز ہے۔ حکیم یوسف حسین نے بھی لمبی عمر پائی اور مدّت تک زندہ رہے۔ صبح کا مفصل ناشتہ جس سے دوپہر کے کھانے کا حساب برابر ہو جائے وہ اپنی خواہر نسبتی یعنی بیوی کی بہن، باقری بیگم کے گھر کرتے تھے۔ وہاں سے اپنے گھر چلے جاتے تھے جو دوسرے محلہ میں ذرا فاصلے پر واقع تھا۔ اُن کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ اور سارا دن پڑھنے لکھنے میں گزارتے تھے۔ ملنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ بیشتر لوگ علمی استفادہ کرنے کی خاطر آتے تھے، ذرا سی دیر باتیں کر کے چلے جاتے تھے، چوپالی ماحول کے آدمی کی بالکل رسائی نہ تھی۔ حکیم صاحب کے گھر پر یونانی زبان کے لفظ "اکادمی" کا اطلاق مبالغہ نہ ہوگا۔ وہاں خالص مردانہ مجمع ہونیکے باوجود حاضرین شائستگی ملحوظ رکھتے تھے، سنجیدہ نشست ہوتی تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ حکیم صاحب کے سامنے قصبے کے تازہ بتازہ اخبارات کی سرخیاں بیان کرے، یا اس نوعیت کی بات چیت شروع کر دے، جس کو انگریزی میں ڈھیلی گفتگو کہتے ہیں۔ قصبے میں گزشتہ شب کہاں چوری ہوگئی کس کی بھینس کھل گئی۔ بازار میں بنیئے کیا حرکتیں کر رہے ہیں۔ اس قسم کے معاملات سے حکیم صاحب کو مطلقاً کوئی مطلب نہ تھا اور نہ وہ ایسی پست سطح کی باتیں سننا پسند کرتے تھے۔ البتہ اگر کسی نے سوال کیا کہ آج کل کونسی کتابیں پڑھ رہے ہیں یا یہ کہ فلاں مسئلہ ہماری سمجھ میں نہ آیا تو خوش ہوتے تھے اور تفصیل سے جواب دیتے تھے۔ عقاید و تاریخ حتیٰ کہ فقہ و تفسیر کی کتابیں اکثر سامنے رہتی تھیں اور یہ موضوعات ذہن میں خوب روشن تھے۔ یا پھر

طب کی کتابیں دیکھتے رہتے تھے۔ جو ان کا خاندانی ورثہ تھیں۔ لئیق الحسن اپنی تالیف جارچہ، میں حکیم یوسف حسین کو شاعروں کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ لیکن ان کی جو کتابیں ہمارے گھر آئیں اس ذخیرے میں اشعار کا مجموعہ نہ ملا۔ ممکن ہے مجھے جس وقت کتابوں کے عنوان ٹھیک سے پڑھنے کی تمیز ہوئی اس سے پہلے کسی اور کے ہاتھ پڑ گیا ہو۔ میں اپنی ایک رشتے کی خالہ، شبیر فاطمہ کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ اپنے باپ اور دادا اور دوسرے بزرگان جارچہ کے حالات کچھ یاد ہوں تو بتائیے۔ خالہ چھبّو نے اپنے باپ کی جگہ دادا اور دادا کی جگہ باپ کے نام گڈ مڈ کر دیے۔ اس کو بڑھاپا کہتے ہیں یا خدا معلوم کہ مجھے اشتباہ ہوا اور سماعت ضعیف ہونے کی بنا پر صحیح سن نہ پایا، حکیم یوسف حسین کی بابت البتہ ان کے حافظے میں بعض دلچسپ یادیں محفوظ اور تازہ تھیں، مثلاً: "میں ذرا سی بچی تھی، ہمارا گھر ان کے پڑوس میں تھا، میں ان کے پاس جا کر ان کی گود میں بیٹھ جاتی تھی، وہ خوش تو بہت ہوتے تھے، مگر یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ میرے پڑھنے لکھنے میں خلل ڈالنے کہاں سے آ گئی۔ مجھے چلتا کر کے پھر لکھنے میں لگ جاتے تھے۔ وہ قرآن لکھتے رہتے تھے۔" (شبیر فاطمہ) اصل میں قرآن لکھنا اسلام کے عہد اوائل سے مسلمانوں کی ایک ضرورت تھی۔ اس ضرورت نے ان کو خطاطی کے فن سے آگاہ کیا اور ان کے سامنے فنون لطیفہ کا ایک نیا میدان کھلا۔ مسلمانوں نے اس فن کو اپنے ذوق میں جگہ دی۔ قرآن کی کتابت اور خطاطی کے فن میں قریبی رشتہ رہا ہے جس کو ضرورت اور ذوق کے امتزاج کی شائستہ مثال کہنا چاہیے۔ جہاں تک برصغیر ہند کا تعلق ہے ویسے تو ہزاروں لاکھوں بندگان خدا نے قرآن کی کتابت کی ہوگی، لیکن کاتبِ قرآن کی حیثیت سے جو شہرت اورنگ زیب عالمگیر کے حصے میں آئی وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ عالمگیر مسلمانوں کے فارغ البال اور معاشی تفکرات سے آزاد طبقے کے لیے ایک پاکیزہ روایت چھوڑ گیا۔ شہروں میں زندگی کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ قصبات کے ماحول میں ابھی کل پرسوں تک ایسے صالح بزرگوں

کو ڈھونڈا جا سکتا تھا جن کے وسائل ان کی سادہ زندگی کے کفیل اور متفرق احتیاجات سے فراغت کے ضامن تھے۔ ان کے مشاغل و معلومات میں قرآن کی کتابت ضرور شامل تھی اور وہ اس امرِ خیر کو قربتاً الی اللہ کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ چھپائی کا طریقہ عام ہو جانے کے بعد بھی قدیم رسم برقرار رہی، اس لیے کہ کتابتِ قرآن کی فضیلت اور برکت کا بدل کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

حکیم یوسف حسین کے پاس وقت گزارنے کا دوسرا شغف مرثیہ تھا۔ وہ تحت اللفظ کے کامیاب ذاکر تھے۔ شیعوں میں وہ قصبات میں رہتے ہوں یا شہروں میں۔ مرثیہ بصورت تحت اللفظ پڑھنا ایک قابل قدر فن اور تہذیبی اضافہ تصوّر ہوتا ہے۔ مرثیہ پڑھنا اور سننا دونوں شائستگی اور ذوق کی علامت تھے اور ابھی تک ہیں۔ منبر پر جا کر تحت اللفظ پڑھنا اور علمائے کرام کی تقریر و بیان میں کئی اعتبار سے نمایاں فرق ہے۔ مدرسے میں زبانی یاد کی ہوئی روایات کا تحت اللفظ سے کوئی جوڑ نہیں بیٹھتا۔ اس فن میں دسترس کے لیے اعلیٰ درجے کی علمی استعداد چاہیے۔ مولوی حضرات کا منبر پر جانا ایران سے وارد کی ہوئی روایت ہے۔ تحت اللفظ کو خالص ہندوستانی شیعوں کی ایجاد و اختراع کہنا مناسب ہو گا۔ ہمارے معاشرے میں یہ فن اشراف و عمائد کے ساتھ منسوب ہو گیا۔ تقسیم ملک سے پہلے تک شمالی ہند میں مہاراجہ محمود آباد اور دکن میں نواب شہید یار جنگ شیعہ برادری میں سب سے ممتاز ہستیاں تھیں اور دونوں تحت اللفظ مرثیہ پڑھتے تھے۔ قصباتی شیعہ بھی جو مرثیہ پڑھنے کا شوق رکھتے تھے اکثر خوش حال اور صاحب حیثیت لوگ تھے، ذاکری کے فن کو مالی منفعت کا وسیلہ بنانا معیوب سمجھتے تھے، اور اوّل تو اپنے وطن سے باہر جا کر مرثیہ پڑھتے ہی نہ تھے، اتفاقاً کہیں چلے گئے تو کسی کی جرأت نہ تھی کہ جس طرح مولوی صاحبان کی جیب میں سفر خرچ کے نام سے لفافہ ڈالا جاتا ہے، ان کی جیب میں بھی چپکے سے لفافہ رکھ دے۔ اس فن کا تقاضا ہے کہ پورا مرثیہ تقریباً حفظ ہونا چاہیے۔ لہٰذا عموماً باذوق ذاکر جو خوش نویسی

کے ماہر اور آزادی کی نعمت سے بہرہ مند تھے اپنی پڑھت کے مرثیے خود نقل کرتے تھے اور ظاہر ہے نقل کرنے میں مرثیے کا ہر بند زبانی یاد ہو جاتا تھا فن تحت اللفظ خوانی کی آخری اور سب سے مشکل شرط ادائیگی ہے۔ مرثیہ مسدس کے بندوں کی شکل میں آگے بڑھتا ہے اور ہر بند کے چھ مصرعے موسیقی کے سرگم کی طرح تبدریج آواز کا تغیر اور اتار چڑھاؤ مانگتے ہیں۔ ذاکر بڑے ریاض اور مشق کے بعد ادائیگی کا راز سیکھ پاتا ہے خصوصاً چار مصرعے ادا کرنے کے بعد آخری دو، یعنی ٹیپ کا ادا کرنا پہاڑ اٹھانے سے کم دشوار کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے باکمال ذاکر بھی قاعدے کے ساتھ محض چار یا چھ مرثیوں سے زیادہ نہیں پڑھ پاتے اور وہی ان کی پڑھت کے مرثیے کہلانے لگتے ہیں۔ مرثیہ خوانی کو کامیاب اور دلچسپ بنانے کے لیے باذوق سامعین کا مجمع بھی ضروری ہے وہ جانتے ہیں کہ کون سے مصرعے پر کتنی داد اور کس درجہ بلند آواز میں دینا چاہیے، ذاکر رخصت اور شہادت پر پہنچے تو گریۂ و بکا کے لیے بھی وہی ذمہ دار ہیں۔ سامعین کو رونے کے الگ الگ قاعدے یاد ہوتے ہیں۔ حکیم یوسف حسین کا ایک دفعہ جھوسں کے امام باڑے میں جو دیوان خانہ کہلاتا ہے مرثیہ پڑھنا بستی کا یادگار واقعہ بن گیا۔ مجھے ہوش آیا تو لوگ وہ مجلس بھولے نہ تھے اور یاد کرتے تھے۔ حکیم صاحب نے منبر پر جاکر مرثیہ شروع کرنے سے قبل ایک رباعی پڑھی جس کی ادائیگی سے سامعین حیرت میں رہ گئے اور سبحان اللہ، واہ واہ کا ایسا شور مچایا کہ امام باڑے کی چھت اڑا کر رکھ دی، بعض بزرگ ڈیڑھ ٹانگ سے اور بعض سروقد داد دینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ رباعی کے آخری دو مصرعے تھے:

یوں جھک کے جدائی سے ملا وقتِ وداع
جب سے اب تک کمر میں خم باقی ہے

# باقری بیگم

باقری بیگم، حکیم یوسف حسین کی سالی، یعنی بیوی کی بہن تھیں، قصبے سے باہر تالاب کے کنارے ان کا بڑا سا مکان تھا جس کی کرسی بہت زیادہ اونچی اور صحن کی کشادگی دُور تک پھیلے لق ودق میدان کی برابر تھی۔ باقری بیگم کے شوہر کب اللہ کو پیارے ہوئے یہ کسی کو یاد نہ تھا۔ قرآن اور نمازیں پڑھتے پڑھتے وہ خود بھی اس موضوع کو اپنی یادوں سے محو کر چکی تھیں۔ کوئی اولاد نہ تھی اکیلا دم تھا۔ صوفیوں کے تصوّرات میں یادِ الٰہی کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ اس کی فی الفور برکت وحکمت یہی ہے کہ دل خوش رہتا ہے، گذشتہ غم فراموش ہوجاتے ہیں اور آئندہ کوئی غم پاس نہیں آتا۔ حسرت موہانی اردو کے بڑے شاعر تو تھے ہی، اللہ والے آدمی بھی تھے۔ انھوں نے یہ عقیدہ ایک شعر میں پیش کیا ہے مجھے صرف پہلا مصرعہ یاد رہ گیا: شادماں تھا جو ترے رنجِ طرب کار سے دل۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے غم میرے پیچھے بھاگتے پھرے اور میں کبھی ہاتھ نہ آیا، آخر تھک کر جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ ایسی ہی کیفیت باقری بیگم کے اطوار سے ہر وقت نمایاں رہتی تھی۔ ان کے گھر کی رونق کا بھی جواب نہ تھا۔ حکیم یوسف حسین کے کاشت کار بھڑبھونجے تھے۔ جن کی عورتیں دن بھر باقری بیگم کے کاموں میں لگی رہتی تھیں اور دو ایک رات کو وہیں سوتی تھیں۔ جارچے میں آٹا پیسنے کا انجن لگا تھا مگر حکیم صاحب کو گھریلو چکی کا آٹا پسند تھا۔ ایک عورت آٹا پیسنے پر تعینات تھی اور اس کا مستقل رہنا سہنا ضرورت میں شامل تھا۔ عموماً چکّی پیسنے والی عورتیں صبح ہونے سے پہلے اپنا کام شروع بلکہ بعض اوقات ختم کر چکی ہوتی ہیں۔ میری دادی اماں کا جانا ہوتا تو رونق اور زیادہ بڑھ جاتی تھی حکیم صاحب کے پاس ایک اور بزرگ سونے کو آتے تھے جن کی چلم رات کو گھنٹہ

دو گھنٹے کے لیے مشکل سے ٹھنڈی ہوتی ہوگی۔ حقہ حکیم صاحب بھی پیتے تھے، لیکن زندگی کے تمام معمولات کی طرح حقہ نوشی میں بھی اعتدال ملحوظ تھا۔ شب و روز میں تین چار دفعہ پیتے ہوں گے۔ باقری بیگم کے دالان میں صبح ہوتے ہی کچھ حصے میں فرش بچھ جاتا تھا۔ لڑکیاں ان سے قرآن مجید پڑھنے آتی تھیں۔ شاید یہ ان کا زندگی بھر کا مشغلہ تھا جس کو وہ نہایت شوق اور مستعدی سے انجام دینے کی عادی ہوگئی تھیں۔ اگر کوئی لڑکی ان کے کسی کام کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو وہ منع کر دیتی تھیں، ان کے گھر کام کرنے والیاں بہت، لڑکیوں کو اپنا سارا وقت پڑھنے میں صرف کرنا چاہیے۔ گرمیاں ہوں یا جاڑے کا موسم، باقری بیگم کے ہاتھ میں پنکھا ضرور رہتا تھا۔ جیسا کہ الف لیلیٰ کے قصّوں میں جادو کی چھڑی کے متعلق سنتے ہیں ایسا ہی اس پنکھے میں بھی کوئی طلسمات یقیناً پوشیدہ تھا۔ جب تک ہاتھ میں رہتا تھا ساری لڑکیاں ادب سے پڑھنے میں لگی رہتی تھیں، اور جہاں ہاتھ سے رکھا، وہ ہنگامہ بلند ہوتا کہ گویا خدانخواستہ حضرت سلیمانؑ کی انگلی سے انگشتری گر گئی۔ لڑکیوں کو جاتے وقت روزمرّہ کا سبق سرسری طور سے ہی سہی مگر سنانا پڑتا تھا۔ وہ سخت آزمائش کا وقت ہوتا تھا اور کسی کو باقری بیگم کی جھڑکیوں سے امان نہ تھی طبیعت میں ذرا سا مزاح بھی تھا اور لڑکیوں کے ماں باپ خصوصاً ابا جان کی بابت ناگفتنی کلمات کہنے میں تکلف نہ کرتی تھیں۔ جمعہ کو تعطیل، ہفتے کے دن بھی یہی قاعدہ تھا کہ گزشتہ ہفتہ بھر کا سبق جہاں سے جی چاہا سننا شروع کر دیا۔ وہ دن بھی ایسی زبردست چیخ پکار سے شروع ہوتا تھا کہ یوم حساب کہنا چاہیے۔ معصوم بچیاں آنکھیں پھاڑے ایک دوسرے کو دیکھتی رہتی تھیں کہ خدا جانے پنکھے کی ڈنڈی کا نوکیلا سرا کونسی آیت پر جھک پڑے اور وہ ٹھیک سے یاد ہو نہ ہو۔

ہمارے وطن کی عورتیں ویسے تو نواح دہلی کی بامحاورہ زبان بولتی ہیں مگر قاف کی آواز اہل دکن کے انداز سے نکالنے کا رواج عام ہے۔ باقری بیگم کا نام کوئی نہ لیتا تھا۔ بجّو کی مختصر عرفیت سب اہل برادری کی خصوصاً عورتوں کی زبان پر

کسی نہ کسی رشتے کے ساتھ چڑھی تھی۔ میری ماں ان کو خالہ بجو کہتی تھیں اور ہم سب بھائی بہن بھی یہی رشتہ لگا کر یاد کیا کرتے تھے۔ باقری بیگم کی طبیعت ہر وقت جارچے کی فکروں میں غلطاں پیچاں رہتی تھی اور جارچہ ان کی رائے کا احترام کرتا تھا۔ کبھی سیدوں میں کوئی قصہ قضیہ کھڑا ہوتا اور لوگ جمع ہوتے تو باقری بیگم دو چار عورتوں سمیت وہاں ضرور موجود رہتی تھیں۔ اگر کسی کا گھر چھوٹا ہوا اور مردوں کی تعداد زیادہ، تو باقری بیگم اور ان کی جماعت کوٹھے پر بیٹھ جاتی تھی اور مفید مشورے حسبِ موقعہ اوپر سے نازل ہوتے رہتے تھے۔ یہی صورت برادری ہیں رشتے اور منگنی کے وقت درپیش آتی تھیں۔ فریقین باقری بیگم کی صوابدید کو ضروری سمجھتے تھے اور ان کی رضامندی میں بڑی برکت تھی۔ وہ منشأ ظاہر نہ کریں تو آسان بات نہ تھی کہ لڑکے کی ماں بے تکلف لڑکی والوں کی دہلیز تک چلی جائے۔ اکثر قطعی طور سے ہونے والی منگنی سمجھ لیجیے کہ چوپٹ ہوگئی۔ اگر اتفاقاً باقری بیگم کے منہ سے ذراسی تلخی کے ساتھ نکل گیا، "اے بی بی، لونڈیا کی زبان جھاڑ دیں دے ہے۔"

●

# آبادی بیگم

آبادی بیگم کی پیدائش چھولس میں اور شادی جارچے میں ہوئی تھی۔ میر علی حسن میرے نانا اُن کے چچازاد اور کاظم حسین سگے بھائی تھے۔ باپ کا نام عنایت حسین تھا۔ شوہر کے گھر کی کیفیت اور حیثیت ان کی بیٹی شبیر فاطمہ سناتی تھیں۔ "ہمارے دادا ظہور علی نے ٹھیکیداری کی اور بہت سا روپیہ کمایا، اور دو شاندار مکان تعمیر کیے۔ ہمارے ابا عیوض علی نے روزگار کی طرف خاص توجہ نہ کی، اور نہ جارچے سے باہر جاکر کہیں زیادہ عرصہ گزارا۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور نیک طبیعت

پائی تھی. زندگی میں جو کچھ فائدے پہنچے ان کو امام آخر الزماں علیہ السلام کی بخشش کا طفیل سمجھا کیے۔ تھوڑی سی زمین اور مختصر سا باغ تھا. سادگی کے ساتھ بسر کر گئے۔ ایک دفعہ قصبے میں کسی برہمن کے ساتھ جائیداد کی منتقلی کا معاملہ پیش آیا۔ وہ ان کی ایمان داری کا قایل ہو گیا اور بہت تعریف کرتا تھا۔ ہم سب پانچ بہنیں اور چار بھائی تھے میرے چاروں بھائیوں نے آج کل کی تعلیم سے فائدہ اٹھایا اور اچھی ملازمتیں پانے میں کامیاب ہوئے۔" (شبیر فاطمہ)

جار چے میں کوئی شادی غمی کا اتفاقیہ موقع در پیش آتا اور جلوس سے خلقت کا لشکر پہنچتا تو میری ننھیال کے مردوں اور عورتوں کا پڑاؤ آبادی بیگم کے گھر رہتا تھا۔ ویسے بھی وقتاً فوقتاً کوئی اپنے ذاتی کام سے جاتا تو ان کے پاس ہو کر آنا ضروری تھا، اور کھانے کا وقت ہو نہ ہو وہ پوچھ ضرور لیتی تھیں۔ خوش قسمت عورتوں کی ایک ردیف وہ ہے جو ساس بہو کے رشتے کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ لیتی ہیں اور ساس کی حیثیت سے بہو کے ساتھ تعلقات میں تلخی کا داخلہ ممنوع رکھتی ہیں۔ اس معاملے میں آبادی بیگم نے ہمیشہ دانش مندی کا ثبوت دیا، اور اس کا فائدہ سب سے زیادہ ان ہی کو پہنچا۔ انھوں نے نہ کسی بہو کو کبھی ٹیڑھی نظر سے دیکھا اور نہ کسی کے ساتھ بیجا تین پانچ لگائی، خواہ مخواہ کی اعتراض تراشی، نکتہ چینی اور عیب جوئی سے ان کی طبیعت بالکل پاک تھی. قدرتی طور سے بہت سارے بچوں کو پالنے والی عورت کے تجربات اور سانحات اس کو رقیق القلب بنا دیتے ہیں، اور دوسروں کے ساتھ، حتیٰ کہ بہو کے ساتھ بھی شفقت برتنا اس کی عادت بن جاتی ہے۔ قصباتی ماحول میں قدیم رسومات کا جُوا ضرور عورتوں کی گردن پر رہتا ہے لیکن فرصت کی کمی نہیں ہوتی. آپس کے کسی گھر میں ان کا روزمرّہ جاؤ یوں سمجھیے کہ کلب، تفریح گاہ، مدرسہ اور اور اخبار نویس کا دفتر، بہت ساری چیزوں کا بدل ہوتا ہے، وہاں بات صاف ستھری ہوا کرے اور ہلکے پھلکے تبادلۂ خیالات تک محدود رہے، تو کوئی مضائقہ

نہیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ اس نوعیت کی نشست اعتدال کے حدود پار کر کے بہت جلد دوسروں کے عیب ثواب، غیبت، مخبری اور غیر مناسب افترا پردازی کی طرف نکل جاتی ہے۔ آبادی بیگم کو قصبے کی عورتوں کی یہ حرکت سخت ناپسند تھی۔ وہ نہ تو ایسے جھمگھٹ میں جا کر بیٹھتی تھیں اور نہ کبھی اجازت دیتی تھیں کہ قانون کی زبان میں کہنا چاہیے اس قسم کا قابلِ اعتراض مجمع ان کے گھر اکٹھا ہو۔ انھوں نے زندگی بھر اس ضابطے میں فرق نہ آنے دیا کہ سکون اور خاموشی سے اپنے گھر میں بیٹھنا سب سے بڑی عافیت اور خیر و برکت کی بات ہے۔ اس احتیاط کی افادیت یہ تھی کہ عورتوں میں کہیں لڑائی جھگڑا کھڑا ہوا تو ان کی مداخلت سے مسئلہ فوراً سلجھ جاتا تھا۔ آبادی بیگم کے سب سے چھوٹے بیٹے ظہور اکبر کا مزاج اوّل تو شروع سے عجیب و غریب عادتوں کا مجموعہ رہا ہو گا، آخری عمر میں غیر معمولی دلچسپ آدمی ہو گئے تھے۔ عبادت سے رغبت تھی اور صالح انسان ہونے میں شک نہ تھا۔ البتہ خواب بے حد نظر آتے تھے اور خواب دیکھ کر اس قدر فکرِ جہاں طاری ہوتی تھی کہ ماہوار پنشن کی بیشتر رقم دنیا کے بڑے آدمیوں کو بذریعہ ڈاک ہدایات بھیجنے میں خرچ کر ڈالتے تھے۔ وہ اپنی کسی بہن کو تازہ خواب سنانا چاہتے تو سب بے تکلف روک دیتی تھیں کہ خدا کے لیے ہمارا دماغ نہ چاٹو، صرف میری ماں ان کی لمبی باتوں کو خاموشی سے سن لیتی تھیں۔ ایک دفعہ وہ اپنی آپا کے پاس تشریف لائے، اتفاقاً میرے باپ بھی گھر میں تھے۔ وہ اتنا پوچھ بیٹھے کہ کہو میاں ظہور اکبر کیا حال ہے۔ ظہور اکبر اس زمانے میں راتیں نماز اور وظیفہ پڑھ کر کاٹتے تھے اور جادو کی ہنڈیا سے بہت زیادہ پریشان تھے۔ میرے باپ لاحول پڑھتے باہر بیٹھک کی طرف چل دیے اور ظہور اکبر آپا سے جادو کی ہنڈیا کا قصّہ گھنٹوں بیان کرتے رہے۔ جس کا طربیہ اختتام یہ تھا کہ اڑتی ہوئی ہنڈیا کو وظیفوں کے زور سے نیچے اتار کر مانے۔

# کلثوم بیگم

کلثوم بیگم جارچے میں پیدا ہوئیں اور شادی چھولس میں ہوئی۔ اُن کے شوہر میر ابوالحسن اپنے وقتوں میں چھولس کے سب سے بڑے زمیندار تھے، کلثوم بیگم سے ان کی دوسری شادی تھی۔ دادی کلثوم ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں اور مجھے اچھی لگتی تھیں۔ اس لیے اچھی لگتی تھیں کہ انکے پاس ایک عینک تھی، ویسے میری دادی اماں کے پاس بھی عینک تھی مگر ان کی تاکید سے میں ڈرتا تھا۔ اور عینک چھونے کی ہمت نہ تھی۔ دادی کلثوم کو باتوں میں لگا دیکھ کر آسانی سے ان کی عینک لے بھاگتا تھا۔ عینک لگاکر زمین ایسی عجیب و غریب معلوم ہوتی کہ اصطخری، ابنِ حوقل، مسعودی اور ادریسی، غرضکہ بڑے بڑے جغرافیہ داں بھی اس درجے کا یا اس سے زیادہ دقیق مشاہدہ نہ کرپائے ہوں گے۔ میں عینک ناک پر رکھ کر آسمان کی طرف نہ دیکھتا تھا۔ پورے صحن میں اس شان سے گھومتا تھا جیسے شیخ ابن بطوطہ جہانگردی پر نکلا ہے اور دہلی سلطنت کے قاضی القضاۃ کی مسند پر لات مار کر چین جانے کی جلدی میں ہے۔ آخر دادی کلثوم میری ماں پر چیختی تھیں کہ پکڑ کے لا میری عینک توڑ دے گا۔ دادی کلثوم کی باتوں سے نمٹنا آسان کام نہ تھا۔ وہ دیر تک سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے بعد پوچھتی تھیں، کیوں بہن، جا ہے کہ بیجا؟ یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔ اگر پوری بات غور سے نہ سنی ہو تو جواب مشکل ہو جاتا تھا۔ مثلاً جا کی جگہ بے جا یا اس کے برخلاف کہدیا تو دادی کلثوم کی طبیعت سخت بدمزہ ہو جاتی تھی۔ میری ماں پر اکثر ڈپٹ اور جھاڑ پڑتی رہتی تھی۔ وہ جھلا کر کہتی تھیں، تیری عقل کو ہوا کیا ہے، سراسر بیجا بات کو جا بتلا رہی ہے۔ میری ماں نے ہٹپٹا کر کچھ کہنا چاہا تو دادی کلثوم کو معذرت قبول کرنے میں دیر نہ لگتی تھی۔ وہ تاکید کرتی تھیں کہ غور سے سُن، مجھے پورا قصّہ دوبارہ بتانا پڑے گا۔ ایک دفعہ جاڑوں میں میری ماں نے ایسا بندوبست کیا کہ دادی اماں اور دادی کلثوم دونوں کے پلنگ ایک جگہ ڈال دیے۔ ہمارے

گھر میں نہایت بے ڈھنگا کچھ پکا کچھ کچا بنا ہوا لمبا سا دالان تھا۔ اصل میں دالان کا مطلب شاہجہانی طرز کے کنگورے دار کھلے دروں کی عمارت سے ہوتا ہے، ہمارا دالان ایسا نہ تھا، اس پر تین دروازے تھے اور کواڑ چڑھے تھے۔ میں اپنی دادی اماں کا فرزندِ رشید ٹھہرا، لہٰذا ان کے بستر میں سوتا تھا۔ دادی اماں کو دادی کلثوم سے باتیں کرنے کا ڈھب آتا تھا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ جہاں جا کی ضرورت تھی وہاں بے جا یا اس کے برخلاف منہ سے نکال دیا ہو۔ دونوں میں رات بھر باتیں رہتی تھیں۔ گھڑی کسی کے پاس نہ تھی نہ ان کو اس کی ضرورت کا احساس تھا۔ اصل میں گاؤں کا مرغ شہری مرغ کے مقابلے میں زیادہ مستعد ہوتا ہے اور وقت کا صحیح اندازہ کر لیتا ہے۔ وہ دونوں مرغ کی پہلی اذان پر وضو کے لیے اٹھ بیٹھتی تھیں اور نمازوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ پھر ایک موقع پر ایسا ہوا کہ دادی کلثوم کے گھر کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آیا جیسا کہ ساس بہو کے درمیان اکثر ہوتا ہے۔ وہ اپنے بھائی سید حسن کے ساتھ جارچے جا کر رہنے لگیں اور واپس چھولس نہ آئیں۔ میری دادی اور ماں کا دم جب تک باقی تھا دادی کلثوم کا ذکرِ خیر ہمارے گھر میں برابر ہوتا رہا۔ اُن کی بدولت چھولس کی عورتوں میں تہذیب اور شائستگی کا معیار بلند ہوا۔ وہ اکثر و بیشتر مجلسِ عزا میں اپنے گھر عورتوں کو بلاتی تھیں اور پورا مجمع اُن سے اخلاقی صلاح و فلاح کے نکتے اور خیر و برکت کی باتیں سُن کر واپس جاتا تھا۔

●

## چھٹا باب

# گلشنِ سبزوار (چھولس)

سادات چھولس کا تعارف میرے والد سید علی ہادی نے ایک رسالے کے ذریعہ کرایا جو انھوں نے اپنی ابتدائی عمر میں لکھا تھا۔ غالباً ان کے ذہن میں تین عنوان تھے چھپائی کی نوبت آئی (سنہ ۱۹۳۱ء) تو سرورق پر تینوں نام، چمنستان رضویہ، سادات الاخبار اور گلشنِ سبزوار درج ہوئے۔ کاتب نے اپنی طرف سے ایجاد بندہ کی یہ گنجائش نکالی کہ گلشنِ سبزوار جلی قلم سے لکھا۔ وہی عنوان لوگوں کو یاد رہا اور آج تک یاد ہے۔ اصل میں وہ حصہ اول تھا۔ خاتمے پر نوٹ دیا تھا کہ چھولس کے خاندانوں کی مفصل روئیداد اور مشاہیر کی مشرح کیفیت حصہ دویم میں شائع ہوگی۔ حصہ دویم ان کے پاس تیار ضرور تھا اور یادداشتیں جمع تھیں مگر چھاپنے کا موقع کبھی نہ آسکا۔ ایک دفعہ کراچی میں اپنے ایک محترم عزیز کے گھر عرض سلام کے لیے جانے کا اتفاق ہوا تو انھوں نے گلشنِ سبزوار کے سلسلے میں دلچسپ باتیں بتائیں (سنہ ۱۹۸۹ء) ان کی زبان سے

مختصراً جو کچھ سنا اس کا خلاصہ یاد ہے: "میں اور تمہارے باپ ہمدرس تھے۔ اور دونوں میر کرم علی سے نصابی کتابیں پڑھتے تھے۔ چھولس میں فارسی کی ایک قلمی بیاض پرانے وقتوں سے چلی آرہی تھی۔ اس کے اوراق سیّدوں کے اکثر گھروں میں پائے جاتے تھے۔ ہمارے گھر بھی ایک نسخہ موجود تھا۔ آخری دفعہ چھولس سے نکلا ہوں تو گھر کی ساری کتابیں مذکورہ بیاض سمیت ایک بوری میں بند کرکے اپنے چھوٹے بھائی تحسین حیدر کے سپرد کی تھیں۔ اور کہا تھا کہ ہمارے باپ منشی محمد رفیع کا سب سے قیمتی ورثہ اور متاع عزیز یہی کتابیں ہیں میں فی الحال کچھ نہ لے جاسکوں گا، تم سنبھال کر رکھنا۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں میر کرم علی کے سامنے بر سبیلِ ذکر کسی نے کہا کہ سادات سبزوار والی بیاض کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ طے پایا کہ علی ہادی یہ کام کریں گے اور اصل عبارت جہاں سمجھ میں نہ آئے گی میر کرم علی سے مطلب پوچھ لیا کریں گے۔ علی ہادی ترجمہ کرکے دکھاتے تھے اور میر کرم علی مناسب ترمیم و اصلاح کردیتے تھے۔ یہ گلشنِ سبزوار کی شانِ نزول ہے۔" (امیر محمد)

چھولس میں سیّدوں کا داخلہ بعد میں ہوتا ہے۔ جارچے سے تعلق پہلے قائم ہوجاتا ہے دونوں مقامات پر تصرّف میں کم و بیش نصف صدی کا فاصلہ سمجھیے۔ درمیانی عرصہ کے واقعات میں ذرا سا افسانوی انداز شامل ہوگیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ سیّد محمود سبزواری، ساداتِ بیہقی کے سالار قافلہ، درویش مجرّد، ان کے دو بھائی شاہ میر اور سید محمد، ایک بھائی کی نسل جارچے میں اور دوسرے بھائی کی نسل چھولس میں آباد ہوئی۔ علی الترتیب: ۱۔ شاہ میر کے بیٹے سید حسن اور پوتے سیّد محمود روحانی ہیں۔ ۲۔ سیّد محمد کے فرزند سیّد علاؤالدین اور پوتے سیّد علی ہیں۔

واقعات اس مرحلے تک تاریخ سے واضح ہیں کہ سید محمود سبزواری اپنی جماعت کو کشمیر میں بسا کر دہلی واپس چلے آتے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ کی طرف سے جارچہ بصیغۂ مدد معاش ملتا ہے۔ سیّد محمود سبزواری کے بھتیجے، سید حسن اس مقام کو اپنا مرکز اور اپنی نسل کا مسکن بنانے کی نیت سے آباد کرتے ہیں۔ انھوں نے جارچے کا نام سیّد مبارک شاہ کے نام پر مبارک آباد رکھا مگر عرفِ عام میں مقبول نہ ہوسکا۔ افسانوی رنگ یہاں سے

شروع ہوتا ہے کہ سیّد حسن کی اولاد میں نزاع واقع ہوا. سب سے بڑے بیٹے سید ناصر جارچے سے کشمیر چلے گئے، مشہور ہے کہ آگ لگا گئے. یہ محاورہ بھی ہو سکتا ہے. دیگر اولاد بھی بدایوں، جلیسر ضلع ایٹہ، پیدی ضلع بجنور، سونپت ضلع کرنال، اور یہاں وہاں منتشر ہوگئی. جارچہ چالیس سال تک ویران پڑا رہا. پھر اس کے بعد میر سید علی آگئے. بروایت ایران سے اور حسبِ امکان قوی کشمیر سے جارچے کا رخ کیا. دہلی سلطنت کی تاریخ اس عرصہ میں آگے بڑھتی ہے. سیّد خاندان کا عہد ختم ہو جاتا ہے اور لودیوں کا زمانہ آجاتا ہے. میر سیّد علی نے سلطان بہلول لودی کے سامنے اپنا شجرہ پیش کیا. سیّد محمود سبزواری سے نسبی رشتہ ثابت تھا. سلطان نے جارچہ بدستور سابق میر سیّد علی کو بحال کیا. یہ خبر میر سید حسین کے پوتوں کے کانوں تک پہنچی. وہ دارالسلطنت میں آئے اور سلطان کے حضور میں اپنے حق کی عرضی داخل کی. معاملہ دربار میں زیرِ غور تھا کہ سب کو اپنے جدِّ اعلیٰ سیّد محمود کی زیارت کا خیال آیا. اور مزار پر حاضر ہوئے. وہاں سیّد محمود کے مرید اور خادمِ خاص باوا ملک کو پہلے ہی خواب میں بشارت ہو چکی تھی کہ ہمارے فرزند قضیہ لے کر ہمارے پاس آرہے ہیں. تم ایک روٹی پکا کر سید علی کے ہاتھ میں دینا اور تاکید کرنا کہ روٹی کے چار حصّے کریں. ایک حصّہ خود کھالیں اور تین حصّے اپنے بھائیوں کو تقسیم کردیں. چاروں بزرگوں نے دربار میں آکر خواب کا ماجرا بیان کیا. سلطان نے سن کر کہا کہ یہی فیصلہ ہے، اور فرمان جاری کر دیا. میر سید حسن کی اولاد نے جارچے کے تین حصّے پائے اور چوتھائی حصّہ میر سید علی کو ملا. معاملہ وضاحت کے ساتھ ذہن نشین کرنے کی خاطر تکرار کی ضرورت پڑی ورنہ پہلے باب میں یہی بیان گزر چکا ہے.

سلطان بہلول نے نواحی گاؤں، چھولس کا نصف رقبہ میر سیّد علی کو مزید بطور مدد معاش عطا فرمایا. چھولس میں پہلے سے راجپوتان گہلوت آباد تھے. وہ ترکِ سکونت کر کے جانے لگے تو گاؤں کی نصف آراضی جو اُن کی ملکیت تھی میر سید علی نے خریدلی. چھولس کی سالم زمینداری ان کی نسل کے پاس منتقل ہوگئی. چوتھائی جارچے پر بھی میر سید علی کی اولاد یعنی خاندان چہارم کا قبضہ چلتا رہا. یہ صورت حال غدر سنہ ستاون تک قائم تھا

غدر کے بعد معافیاں ضبطی میں ٹھکانے لگیں۔ ملکہ وکٹوریہ کے فرمان امن وعافیت کے بعد مقدمے بازی ہوئی جس کی تفصیل نہایت روح فرسا ہے اور نصف گاؤں سیدلا کو واگزار ہو گیا۔ اس طرح میر سید علی کا زر خرید حصہ گئے گذرے وقتوں میں ان کے کام آیا۔ نور پور کی آراضی معافی بھی ضبط ہوئی اور زر خرید بچ رہی۔ میر سید علی سبزواری مدد معاش کا عطیہ پانے کے باوجود دہلی میں اقامت گزیں رہے۔ چھولس تک ضرورتاً عارضی رفت و آمد کافی سمجھی گئی۔ اوّل تو مسلمانوں کا متحرک معاشرہ تھا اور دور دور تک ایک جگہ سے دوسری جگہ نکل جانا لوگوں کی عام عادت تھی۔ دوسرے، سبزوار خراسان سے مہاجرت کی اور کشمیر میں آرہے، وہاں تک تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ تقریباً ویسی ہی آب و ہوا اور ویسے ہی چار موسم، جاڑا، بہار، گرمی، اور خزاں جو مختصر وقفے میں جلدی جلدی گزر جاتے ہیں۔ کشمیر کو ایران صغیر بیجا نہیں کہتے۔ مگر دہلی اور نواح دہلی میں مستقل سکونت کے لیے صبر اور حوصلہ درکار تھا۔ وہاں پہنچ کر قدرتی مناظر بالکل بدل جاتے ہیں۔ نہ پہاڑ، نہ وادیاں، نہ ٹھنڈی ہوائیں، نہ چشموں کا پانی۔ حدِّ نظر تک پھیلے ہوئے ہموار میدان پر چاروں طرف سے آسمان جھکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عہد قدیم کا شاعر کالی داس ہندوستان کے تین موسم، جاڑا، گرمی، برسات بتاتا ہے۔ سچ پوچھیے تو جاڑا بھی مختصر، بیشتر گرمیوں کا ڈنکا بجتا رہتا ہے۔ یہ وجہ تھی کہ عطیہ شاہی پانے والے فوراً اپنی معافیوں کے مستقر پر نہیں پہنچتے تھے۔ دوسری یا تیسری پشت گزر گئی تب وہاں جاکر رہنے کی ہمت پڑتی تھی۔

چھولس ایک گاؤں ہے جیسا کہ ہندوستان کے گاؤں ہوتے ہیں، اور ظاہر ہے سارا ہندوستان دیہات کا ملک ہے، مسلمان شہری تمدن لے کر وارد ہوئے تھے۔ برّصغیر کے نقشے پر شہروں کا وجود ان کے ذوق کا ممنون ہے۔ سلطنت کا مفاد سادات و شیوخ کو دیہات میں لے گیا۔ جہاں ان سے قانون و امن کی برقراری میں مدد لی گئی۔ یہ بات بالکل صحیح، البتہ ایک معاملہ اور نہ بھولنا چاہیے۔ سادات اور حامیانِ علیؑ

خاص قسم کے تاریخی تجربات سے گزرے تھے اور اپنی مجبوریاں نظر میں رکھ کر شہروں سے دور دیہات کی رہائش کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کے سامنے اپنی روایات کو قائم رکھنے، اپنی اجتماعی سالمیت کی حفاظت کرنے، اور مختصر یہ کہ زندہ رہنے کا سوال تھا۔ شہری مرکزوں پر آباد شیعہ مصلحتاً اپنے جماعتی عقائد کے معاملے میں سوادِ اعظم کے سامنے رازداری سے کام لیتے تھے اور ان کی آزاد حیثیت بڑی آسانی سے تحلیل ہو جاتی تھی۔ شاید اسی بنا پر علی گڑھ میں تاریخ کے استاد، پروفیسر محمد حبیب نے اپنے حسن ابن صباح والے مضمون میں یہ بات کہہ ڈالی کہ تیرہویں صدی عیسوی سے قبل کسی مسلمان کے لیے یہ تبلانا مشکل تھا کہ وہ سنّی ہے یا شیعہ ہے۔

فی الحال پنجاب کا نقشہ تقسیم نے بدل دیا۔ گنگا جمنا کے میدان میں آج تک ایسی بستیاں پھیلی ہیں جن کے شیعہ باشندوں کی تاریخ عہدِ سلطنت سے شروع ہوتی ہے۔ ملک کی آزادی و خاتمہ زمینداری کے وقت تک وہ ان دیہات کے زمیندار تھے اور اکثر وہیں بود و باش رکھتے تھے۔ ان کی نسلیں کچھ منتشر ہو گئیں اور تھوڑی سی اب بھی خستہ حالی میں مست اپنے مرکزوں پر مضبوط قدم جمائے ہیں۔ اگر برِّصغیر میں مسلمانوں کے داخلے کا حساب سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے شمار کیا جائے تو اسی مرحلے سے شہادت موجود ہے کہ سادات کا رجحان دیہات کی طرف ہے اور ان کو شہروں کے بجائے دیہاتی سکونت میں خیریت اور سلامتی نظر آتی ہے۔ سلطان محمود کے ساتھ آنے والوں میں سید ابوالفرح واسطی پہلے بزرگ ہیں جو اپنی اولاد کو پنجاب میں بسا کر چھوڑ گئے۔ روایت یہ ہے کہ سلطان محمود نے ہندوستان پر فوج کشی کا ارادہ کیا تو خواب دیکھا کہ فتح چاہتے ہو تو فلاں سید کو ساتھ رکھنا، اور سلطان نے خط لکھ کر سید ابوالفرح کو ان کے وطن واسط سے بلایا تھا۔ واسط بغداد کے نزدیک ایک قریہ ہے۔ سلطان محمد بن سام غوری نے فتح ترائن کے بعد دہلی کو مرکزِ سلطنت بنایا تو سید ابوالفرح واسطی کی اولاد پنجاب سے دہلی کی طرف حرکت کر گئی اور گنگا کی وادی میں بستیاں قائم کر لیں۔ بلکہ ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے سے آباد دیہات کو سیدوں نے اپنے تصرّف میں لے لیا، ورنہ سنبھلیڑا اور کھینیڑا قسم کے نام نہ ہوتے۔

چھولس کے سید بھی اپنے گاؤں کے نام سے شرماتے ہیں یہ دیہات موجودہ مظفر نگر اور بجنور کے اضلاع میں واقع ہیں ۔ وہاں پہنچ کر سیّد ابوالفرح کی نسل کے لوگ سادات بارہہ کہلانے لگے ۔ اس لقب کے بارے میں طرح طرح کی تاویلات ہیں ۔ مددِ معاش کا بہت بڑا عطیہ ہمیشہ ان کے پاس رہا ۔ مشہور ہے کہ ہمایوں کے فرمان میں از کنگ تا سنگ کے الفاظ درج تھے ۔ سلطان التمش کے عہد سے مغلوں کے دورِ آخر تک سادات بارہہ نے اہم فوجی خدمات انجام دیں اور حکومت کے معاملات سے بہت قریب رہے مگر دیہات کی سکونت کبھی نہ چھوڑی ۔ وہ اپنے مرکزوں کی مزاحیہ علامات کے ذریعہ تعارف پر خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے ۔ سادات بلگرام نے دوسری راہ پکڑی ۔ وہ علمی سرگرمیوں میں لگے رہے اور علوم کے مختلف شعبوں میں امتیازی مقام حاصل کیا ۔ بلگرام گاؤں نہ سہی بہت بڑا شہر بھی نہیں کہہ سکتے ۔ ہمیشہ سے ایک چھوٹا سا قصبہ رہا ہے ۔ سید ابوالفرح واسطی کی نسل بہار تک پھیلتی چلی گئی ۔ مگر گاؤں میں رہائش کا سلسلہ رکھنا گویا کہ ریاضی کا قاعدہ کلیہ تھا جس کو بھولنے سے خرابی کی صورت پیدا ہوسکتی تھی ۔ اس قاعدے پر ابھی کل پرسوں تک عمل درآمد جاری رہا ۔ سر سلطان احمد کے باپ ، خان بہادر سید خیرات احمد کے گاؤں کا نام پالی اور سر علی امام کے باپ ، امداد امام اثر کے گاؤں کا نام نیورا تھا ۔ شاد عظیم آبادی پٹنہ میں رہتے تھے ۔ شاعر ضرورت سے زیادہ نستعلیق ہوتے ہیں ۔ انھوں نے اپنے اجداد کے گاؤں کا نام نہیں بتلایا ۔ اپنے نسب کی اتنی سی نشاندہی کرکے چپ ہوگئے ۔ کہ سادات بارہہ کا غلام ہوں ۔ وہ کاروانِ عدم کو گیا میں غبار ہوں ۔

مسلمانوں کے معاشرے میں مذہبی اختلافات کی بنا پر بڑی جنگیں تو نہیں لڑی گئیں البتہ وقتاً فوقتاً نمودار ہونے والی تحریکوں کے حامیوں کی خبر خوب اچھی طرح اور اکثر و بیشتر لی گئی ۔ سوادِ اعظم کی اکثریت نرمی و درگذر ، مدارا و مروت ، اور تالیف و تاکید کی زحمت میں کبھی نہیں پڑی ۔ خونریزی بالکل اجنبی چیز نہ تھی ۔ محدود یا انفرادی سطح پر ہی سہی ، شکار ہاتھ آیا چاہیے گردنیں صاف ہوتی رہتی تھیں ۔ یہ مجبوری اور مصلحت

تھی کہ اختلافی جماعت جسے فرقہ سمجھ لیجیے ہمیشہ خطرے کی حدود سے دور چھوٹے چھوٹے محفوظ مقامات پر رہنا پسند کرتی تھی۔ اقلیتی فرقوں کے مزاج میں کچھ یکساں اور مشترکہ صفات ضرور ملیں گی۔ محمد بن قاسم سندھ سے پنجاب تک فتح کر کے چھوڑ گیا۔ (۹۳/ ۷۱۱) وہاں خارجی فرقے کے لوگ آ کر آباد ہو گئے۔ اگر محمد بن قاسم کے بعد خوارج اپنی نو آبادیاں اور قلعہ بند بستیاں نہ آباد کرتے، تو معاملہ ایسا ہی تھا کہ جیسے طوفان آیا اور گزر گیا۔ رفتہ رفتہ سلطان محمود غزنوی کا دور آ گیا۔ اس وقت وہی وسیع علاقہ جس کو خوارج کی مقاومت عالم اسلام کا حصہ بنا چکی تھی۔ اسمٰعیلی فرقے کی پناہ گاہ بن گیا تھا اسمٰعیلیہ، یعنی سواد اعظم کی معروف اصطلاح میں ملاحدہ، ایران و عراق کے ماحول میں دیکھتے تھے، کہ زمین سخت اور آسمان دور، تو جان بچانے کی خاطر قرار کے بجائے فرار کو بہتر مصلحت سمجھتے تھے۔ سلطان محمود ظاہر ہے کہ ان کے نفوذ و اقتدار کو دیکھ کر خوش نہ ہوا۔ وہ ان کے قلعوں کا انہدام کرنا چاہتا تھا مگر حالات نے مہلت نہ دی۔ سندھ و پنجاب کی سرزمین پر اسمٰعیلیہ کے اثرات مزید ایک صدی سے اوپر برقرار رہے۔ سلطان محمد بن سام غوری نے ہندوستان میں داخل ہوتے وقت بگیر و بزن کا محاذ دوبارہ کھول دیا۔ اور سختی کے ساتھ اسمٰعیلیہ کے قلعوں کو مسمار کرنا شروع کیا۔ آخر یہی مخاصمت اس کی ناگہانی موت کا سبب بن گئی۔ اور وہ اسمٰعیلی فدائی کے خنجر سے خود کو نہ بچا سکا۔ رہ گیا شیعہ اثنا عشری فرقہ، وہ سواد اعظم کے سمندر میں غوطہ لگا کر غائب ہو جانے کی ترکیب سیکھ گیا۔ اس کے حال پر سرمد کا قول نہایت ہی صادق آیا کہ "سرما بگذشت وگرما بگذشت"، اور پھر بھی زندہ رہا۔ مخالف حالات ہوں تو اقلیتی جماعتوں کے لیے جسم و جان کا رشتہ سنبھالے رکھنا ایک مشکل مہم اور سخت آزمائش بن جاتا ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر ہوشیار رہنے کے لیے شاعر کی تاکید ہے، خدا اس کو بخشے: لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام۔ آخر پندرھویں صدی عیسوی آ گئی اور ایران میں شیعوں کی عظیم سلطنت قائم ہو گئی۔ دوسری طرف ہندوستان میں مغل سلطنت کا پہیا گھمانے کی ضرورت واقع ہوئی۔ تو اس فرقے کا وزن بھاری پڑ گیا۔ یہ وجہ ہے کہ برصغیر کے اندر شیعہ نمایاں تعداد میں نظر آتے

ہیں اوراب تقیہ بھی رخصت ہو چکا ہے۔

چھولس میں سیّدوں کی مجموعی تعداد بہت زیادہ کبھی نہیں رہی۔ اکثریت متفرق برادریوں کی تھی جن کو وہ اپنی رعایا شمار کرتے تھے۔ زمینداری کے نظام نے بعض قاعدے ایجاد کیے تھے جن کی پابندی سارا گاؤں کرتا تھا اوران سے کسی کا جی نہ گھٹتا تھا۔ ملک کی آزادی، خاتمہ زمینداری، اور پنچایتی راج سے پہلے ایک دوسری دنیا تھی جو فنا ہوگئی۔ ویسے اس کے مرحوم و معدوم ہونے کے آثار غدر کے بعد پیدا ہو چلے تھے مگر امتداد وقت کے ساتھ عادتیں پختہ ہو چکی تھیں اور ذہن تبدیلی کا اندیشہ قبول کرنے کے لیے راضی نہ تھا۔ گاؤں کی زندگی میں وقت دبے پاؤں گزرتا رہتا ہے اور تغیّر کے نشانات نہیں چھوڑتا۔ عہد رفتہ میں ہمارے بزرگوں کی نسلوں نے بہت سی روایات کی بنیاد ڈالی تھی۔ سالہاسال تک ان پر عمل ہوتا رہا۔ ترمیم کی ضرورت کبھی نہ پیش آئی۔ اور نہ کسی کا جی چاہا۔ اس کو خیر و برکت سمجھا گیا کہ وہاں ہماری روایات و رسومات محفوظ ہیں۔ ان کے خلاف نہ کسی کو اعتراض ہوتا ہے، نہ کوئی مزاحمت کرتا ہے اور نہ خلل ڈالتا ہے۔ شیعہ تقویم کی رو سے غم کے موقعوں کی مجالس، مسرت کے دنوں کی میلادیں، ماہ محرّم کی عزاداری کا اہتمام، عزاخانوں کا بندوبست، تعزیہ و علم کا جلوس، عیدالاضحیٰ کی قربانی، عید غدیر کا جشن، ۹ ربیع الاول کی خوشی، غرضکہ سارے مراسم کا سلسلہ ویسی ہی ترتیب اور تسلسل کے ساتھ جاری رہا جیسا کہ پرانے وقتوں سے ہوتا آیا تھا۔ تبدیلی کے احساس سے بےخبر رہنا بے شک ایک دلچسپ تجربہ، اور ماضی کو زندہ رکھنا واقعی ایک حیرت انگیز کارنامہ، مگر معاصر صدی میں گزشتہ صدیوں کے چلتے پھرتے نمونوں کی موجودگی سب سے بڑے کمال کی بات ہے۔

دیہاتی شیعوں پر علمائے کرام کی مضبوط گرفت اور گہرے اثرات سے کسی کو بھی انکار نہ ہوگا۔ چھولس کا کوئی سید کھیت میں ہل چلاتا ہو، جو کہ انتہائی ضروری کام ہے، اور مولوی صاحب نظر آجائیں تو فوراً ہل چھوڑ کر مصافحے کے لیے دور تک بھاگتا جائے گا۔ پھر بھی اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ شیعہ فرقے کو ماضی کے زندان میں دھکیلنے کی

ذمہ داری علما پر جاتی ہے۔ ماضی سے رشتہ نہ توڑنے اور زمانے کی تیز رفتار کے ساتھ نہ چلنے کے عوامل دوسرے ہیں۔ علمائے کرام اپنی ذمہ داری محض اس قدر سمجھتے رہے اور اس کی خاطر زحمت اٹھانے سے گریز نہ کیا، کہ اپنی جماعت کو، مخصوصاً گاؤں میں رہنے والی دور افتادہ جماعت کو، اسلامی تاریخ کے ابتدائی ساٹھ برس میں رونما ہونے والے واقعات کی طرف سے اچھی طرح باخبر رکھیں۔ واقعات و حادثات آدمی کا رویہ تشکیل دیتے ہیں۔ رویہ بتدریج محکم ہو کر عقیدہ بن جاتا ہے۔

چھوئس میں دو تین نسلیں گزرنے کے بعد سیدوں کی آبادی زرعی معاشرے کے قالب میں ڈھل چکی تھی۔ گاؤں کے لوگ زمین کو نہ صرف مادّی احتیاجات کی کفیل بلکہ عزت کا وسیلہ بھی سمجھتے ہیں۔ آدمی کی حیثیت اور اوقات کا پتہ بیگھوں کی تعداد بتلاتی ہے مال گذاری کی رقم کا پیمانہ پہلے کبھی تھا۔ مزروعہ زمین کی حد بندی کے قانون نے ختم کر دیا۔ ویسے تہذیبی ارتقا کی سرگزشت میں انسان کی منظم بود و باش کے تین خاص مرحلے شمار کیے جاتے ہیں۔ پہلا قبائلی معاشرہ، دوسرا زرعی، اور تیسرا شہری تمدن کا مرحلہ جہاں آدمی بتدریج اپنے ہم جنسوں کو پہچاننا چھوڑ دیتا ہے۔ آج کل بے چہرہ مخلوق کے ہجوم کو شہر کہتے ہیں۔ گاؤں میں بھی انسان ہی رہتے ہیں مگر جیسے کوئی ہوشیار مصوّر یکساں رنگوں سے دو مختلف اور رنگین تصویریں بنا دے۔ وہی فرق شہری اور دیہاتی زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے۔ گاؤں میں زندگی بے حد مربوط ہوتی ہے۔ وہاں انسانی عواطف اور میلانات بدل جاتے ہیں۔ آپس میں قریب رہنا اور ایک دوسرے کی زبردست تاک جھانک رکھنا تو کوئی ایسی بات نہیں۔ وہاں لوگ دوسروں کے مویشیوں تک سے مفصّل جان پہچان رکھتے ہیں۔ وہ ہر ایک کی بھینس گائے اور بیل بدھیا کے عیب ثواب بتا دیں گے۔ آپ کو مزید جستجو ہو تو یہ بھی معلوم کر لیجیے کہ کس کا بیل جوئے کے نیچے کیسی چال اور کیا کمال دکھاتا ہے۔ اور کونسی بھینس موجودہ و سابق مالکوں کے کھونٹے پر سال بسال کس قدر دودھ دیتی آئی ہے۔ جغرافیا کا تصور بھی بزرگوں کی خاص میراث ہے۔ دیہاتی اپنے گاؤں کو ایک مکمل دنیا سمجھتے ہیں۔ اس کی گولائی

اور رقبے سے واقفیت ہی نہیں، محبت بھی نہایت لازمی شرط ہے۔ وہاں سے باہر بالکل دوسری دنیا ہے جس سے ان کو نہ دلچسپی اور نہ کوئی مطلب۔ اگر اتفاقاً کسی کا کہیں باہر نکلنا ہو گیا تو پہلی فرصت میں واپس آنے کو جی چاہے گا۔ آدمی گاؤں میں رہ کر اپنے وجود کی صحیح اہمیت کا احساس کرتا ہے اور اس کی صالح انا زندہ رہتی ہے۔ یہ اندیشہ ہر فرد کو شام تک گھر واپس لے آتا ہے کہ کوئی قصہ کھڑا نہ ہو جائے۔ چل کر دیکھنا چاہیے۔ عجیب بات ہے کہ نسلیں گزرتی جائیں، زمینوں کی تقسیم کا سلسلہ جاری رہے اور پھر بھی اقتصادی سطح گرنے سے کوئی نہ گھبرائے۔ سب خوش و خرم نظر آئیں اور سب کی مشترکہ خواہش یہ ہو کہ ہرچہ بادا باد تبدیلی کو زبردستی داخل نہ ہونے دیں گے۔ چھولس کے لوگوں میں کچھ دن پہلے گھوڑے کے ایک خاص اور باریک عیب کی مثال مشہور تھی۔ جس کو وہاں کے حضرات اپنے حسب حال تصور کرتے تھے۔ مسلمانوں کو ایک زمانے تک علم اسپ شناسی سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ ماہرین کی شناخت کے مطابق تھان کا ٹرّا وہ گھوڑا ہوتا ہے جس کی کمر پر زین رکھ دیجیے تو تھوڑی سی دور نہ بھاگ سکے اور تھک جائے، بس اچھا گھاس دانہ اور باقاعدہ کھریرا۔ تھان پر کھڑا ہر وقت ہنہناتا رہتا ہے ساری اُچھل کود تھان کے حدود میں، وہاں سے باہر ہو جائے تو وہ کیفیت جو میرزا سودا اپنی نظم "تضحیک روزگار" میں کسی معاصر امیر کبیر کے گھوڑے کی بیان کر گئے ہیں۔

غدر کے بعد چھولس کا جو نقشہ ابھرا اس کی نوعیت یوں سمجھنا چاہیے کہ سیّدوں میں دو جنس کی خلقت پائی جاتی تھی۔ وہ جن کے پاس مزروعہ آراضی بہت تھوڑی رہ گئی تھی اور مجبوراً ہاتھ سے کھیتی کرنے لگے تھے۔ وہ قطعی انگوٹھا ٹیک اور لکھنے پڑھنے سے لاتعلق لوگ تھے۔ اگرچہ اس جنس کے افراد اور ان پر مشتمل کنبوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ پھر بھی یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہاتھ پاؤں کی مضبوطی کے اعتبار سے وہ سب پر بھاری تھے۔ وہی ان کی قابل قدر اور قابل فخر خوبی تھی۔ سارا گاؤں ان کو اہم لوگوں کی شمار قطار میں جگہ دینے پر مجبور تھا۔ اگر کچھ خدانخواستہ قسم کی واردات پیش آجائے تو سب سے پہلے ان کو مشورے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ بلکہ اکثر وہ خود ہی بغیر بلائے پہنچ کر قضیہ

اپنے ہاتھ میں سنبھال لیتے تھے۔ انھوں نے پائجامے کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور دھوتی باندھتے تھے۔ غالباً مشاغل کی سہولت کا تقاضا ہوگا۔ یا اس بات کو حیاتی سائنس کی مسلّمہ حقیقت کہہ لیجئے کہ ماحول کے اثرات اپنی رعایت ضرور کرا لیتے ہیں۔ البتہ ایک ناپسندیدہ قباحت کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ ماحولیات کے قانون نے ان بے چاروں کے ساتھ ضرورت سے ذرا زیادہ ستم ظریفی برتی تھی۔ وہ سادات تھے، بقول معروف در این چہ شک۔ مگر اس ظاہری تغیّر اور ہیئت کذائی کا کیا علاج اور کیونکر نمٹتے کہ بیس آدمی سیادت کی گواہی دیا کریں، کوئی اجنبی ان کو دیکھ کر آسانی سے اعتبار کرنے والا نہ تھا۔ وہ خود بعض اوقات اپنے حال پر شرماتے تھے۔ کون بھلا آدمی پسند کرے گا کہ اس کے حسب نسب کے سوال پر اتنے سارے گواہوں کی ضرورت پڑے اور تحقیق کئی دن اور کئی مہینے چلتی رہے۔ اتفاقات کی نزاکت سب کو اپنے آگے جھکا دیتی ہے۔ یہ تو تھا ایک جنس کی خلقت کا معاملہ، دوسرے نمونے کی خلقت کا معائنہ بتلاتا ہے کہ ان کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ وہ تھوڑا یا بہت پڑھے لکھے ضرور تھے۔ کچھ لوگ باہر جا کر مکتبی درسیات سے فارغ ہوتے تھے یا جدید تعلیمی اداروں میں پڑھتے تھے۔ بعض کو وطن میں رہتے ہوئے پڑھنے کی آسانیاں فراہم ہو جاتی تھیں۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو ذاتی شوق سے اپنا مطالعہ آگے بڑھاتے تھے۔ تعلیم سے سب کا مقصد نوکری نہ تھا۔ ذرا اچھی حیثیت کے سیّد اپنی اولاد کو پڑھا کر بھی زمینداری کے بندوبست میں لگائے رکھتے تھے اور ان کی گذر بسر خوش حالی کے ساتھ ہوتی تھی۔ اسی طبقے میں وہ بھی شامل تھے جن کے پاس زیادہ آراضی نہ تھی پھر بھی ہاتھ سے کھیتی کرنا نہ صرف عادت اور روایت کے خلاف بلکہ سخت معیوب سمجھتے تھے۔ نوکروں سے کام لینا ایک پرانا رواج تھا۔ اس کی پروا کسی کو نہ ہوتی تھی کہ ملازم اور ان کے بال بچے آدھی پیداوار اندھیرے اجالے صاف کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ میاں کے گھر میں آدھی سے بھی کم پیداوار پہنچتی تھی مگر وہ اسی رنگ میں خوش تھے۔ اگر گاؤں سے باہر تحصیل کچہری یا کہیں جانا پڑ گیا تو ان کی قیمتی اونچی ٹوپی، شیروانی اور چھڑی دیکھ کر یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ کون ہیں اور

کہاں کے رہنے والے ہیں۔ آج کل کی اقتصادی درجہ بندی کے حساب سے ان کو غریب ہی کہنا چاہیے مگر مزاج سب کا شاہانہ تھا۔ بعض لوگ تو گاؤں میں بھی گھر سے باہر نکلنے سے پہلے شیروانی، ٹوپی، چھڑی گویا کہ پورا درباری لباس زیب تن کرنا لازم سمجھتے تھے۔ مزے کی بات یہ کہ زندگی کا مروجہ سلیقہ اور قرینہ جوان کو عزیز تھا اس کی خاطر مقروض ہوجانے سے بالکل نہ گھبراتے تھے۔ انگریز فلسفی برٹرینڈ رسل نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ انسان نے جب سے زمین کو ذریعۂ معاش بنایا اسی وقت سے اُدھار لینے کا طریقہ بھی سیکھ گیا۔ ہمارے پورے علاقہ میں گنگا کے دونوں طرف سیدوں کے دیہات میں چار ضرور آباد ملیں گے۔ ان کا تعلق ہندوؤں کی اچھوت ذات سے ہے۔ یہ لوگ ذاتی زمین سے قطعی محروم ہونے کے باوجود کاشت کاری کے تمام کام بہت ہی ہوشیاری، جفاکشی، اور مستعدی سے کرنا جانتے تھے۔ ملک کی آزادی کے بعد نئے دستور کی مراعات سے چماروں نے خاص فائدہ اٹھایا۔ اب وہ دیہاتی زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرنا چھوڑ چکے ہیں اور معماری وغیرہ دیگر متفرق پیشے اختیار کر کے خوب خوش حال ہو گئے ہیں۔ ملک کی آزادی سے پہلے ایک طرح کی پرانی دنیا تھی۔ چماروں کا اپنے گاؤں کے زمینداروں سے گہرا تعلق تھا۔ سارے کام ان ہی کے سپرد رہتے تھے۔ چماریاں بھی جنگل باہر کے کاموں میں پابندی کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ پیداوار کو چار چاند لگاتے ہیں انکی خدمت اور محنت کو بڑا دخل تھا زمیندار اس طبقے کی افادیت سمجھتے تھے ان پر عنایت کی نظر رکھنا اور مہربانی سے پیش آنا عام دستور تھا۔ علیگڑھ کے ایک محترم استاد نے ابھی کچھ عرصہ پہلے اپنی خود نوشت لکھی۔ میں ان کی شرافت، علم، اور دانش مندی کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ سوانح میں اپنے عزیزان وطن، قائم گنج ضلع فرخ آباد کے پٹھانوں کی دو عادتیں بڑی کانٹے دار بیان کر گئے۔ اگرچہ وہ آتی ہیں "ناگفتن اولیٰ تر" کی ردیف میں، مگر سچائی کا جواب نہیں ہے۔ راست گفتن کی فضیلت کو سب نے مانا ہے سنسکرت زبان کا ایک محاورہ سنا ہے کہ سچ بات بڑی مضبوط ہوتی ہے اور اس کی خوب صورتی کا کیا کہنا۔ میں استاد محترم کی وہ عبارت پھاڑ کر یہاں چپکا دوں تو تصویر

بالکل حسب حال قسم کی بن سکتی ہے۔ البتہ قباحت ضرور کھڑی ہوگی۔ قائم گنج کے پٹھان شرمیلے اور شریف لوگ تھے، خاموش ہو گئے کچھ نہ بولے۔ اندیشہ ہے کہ چھولس کے اہل برادری کو " افشائے راز" برا لگے گا اور کہیں گے کہ غیر مناسب بیان واقعہ چہ ضرور

چھولس کے سیدوں کو غدر کے بعد خوش حالی کا ایک موقعہ اور ہاتھ آیا مگر شہاب کی روشنی کی طرح وہ زمانہ جلد ختم ہوگیا اور عرصہ تک باقی نہ رہ سکا۔ سید نیل کی کھیتی کرنے لگے اور نیل تیار کرنا شروع کیا جس سے خوب فائدہ ہوا۔ انیسویں صدی کے اواخر تک بلکہ اس مدت میں بیسویں صدی عیسوی کے پانچ سات برس اور شامل کر لیجیے، یورپ میں ہندوستان کے نیل کی بڑی مانگ تھی جہاں اس سے طرح طرح کے رنگ بنائے جاتے تھے۔ کانپور نیل کی خاص منڈی شمار ہوتا تھا۔ وہاں نیل کی تجارت پر بھی دوسری تجارتی اشیاء کی طرح انگریزوں کا اجارہ تھا اور وہ بڑے پیمانہ پر مال خرید کر یورپ کے ملکوں کو برآمد کرتے تھے۔ جرمنی میں کیمیاوی طریقے سے رنگ سازی کا طریقہ دریافت ہوگیا (سنہ ۱۹۰۰ عیسوی کے قریب) تو نیل کی پیداوار کو شدید نقصان پہنچا اور منافع کا ایک بڑا وسیلہ شمالی ہند کے زمینداروں اور ان کے ساتھ شامل مہاجنوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ زمیندار جنگل میں آج کل کے فولادی پلانٹ کا بدل یعنی، اور اینٹ کے ذریعہ غیر معمولی گنجائش کے بڑے بڑے ظروف بنواتے تھے۔ وہ چوبچے کہلاتے تھے جو گول اور چوکور دونوں طرح کے ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تیاری پر زبردست رقم کی لاگت آتی تھی۔ نیل کے پودے پہلے ظرف میں گل گئے تو رقیق مواد مختلف ظروف سے گزرتا ہوا آخری ظرف میں تیار شدہ نیل کے مرحلے تک پہونچ جاتا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور صنعتی اثرات کے نتیجہ میں فیکٹری کے لیے کوٹھی کا لفظ ہماری زبان میں ایک تازہ اختراع تھی۔ بعد میں مغربی طرز کا رہائشی مکان بھی کوٹھی کہلانے لگا اور یہ لفظ ان معنوں میں ابھی تک استعمال ہوتا ہے۔

بلند شہر گزیٹیر کی اطلاع کے مطابق چھولس میں چار عدد نیل کی کوٹھیاں (فیکٹریاں) تھیں۔ (۱۹۰۳ء) انگریزی عمل داری قائم ہونے کے بعد ضلع کے انگریز کلکٹر (ڈپٹی کمشنر)

کی رہنمائی کے لیے ضروری معلومات پر مشتمل ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے عنوان سے کتابچے تیار کیے گئے جن میں یہ اندراج بھی شامل ہوتا تھا کہ ضلع کے اہم دیہات کونسے ہیں، وہاں کن لوگوں کی سکونت ہے، کیا حیثیت ہے اور کیا وسائل ہیں۔ چھولس میں واقع تین عدد نوابوں کی کوٹھیاں علی الترتیب مقدم علی حسین، مرتضیٰ حسین، اور ہادی حسین کی ملکیت تھیں۔ چوتھی کوٹھی نوابوں کی بنائی ہوئی تھی جن کو نصف گاؤں کا رقبہ انعام عطا ہوا تھا، ویسے تو یہ کوٹھیاں غدر کے بعد کی تعمیر تھیں، لیکن مغل معماروں کی چھوڑی ہوئی روایات اس وقت تک زندہ نظر آتی ہیں۔ وقت گزرتا رہے، ان کے استحکام اور اصلی حالت میں فرق نہ آنا چاہیے۔ الڈوس ہکسلے، انگریز ادیب ایک دفعہ ہندوستان کی سیاحت کرنے آیا تو مغل آثار کی بابت دلچسپ بات کہہ گیا، کہ دنیا کی تمام تاریخی یادگاریں حقیقتاً قدیم معلوم ہوتی ہیں اور یہی ان کی عظمت کے رعب کا باعث ہے۔ مغلوں کی عمارتوں میں قدامت نہیں جھلکتی۔ دیکھنے والوں کو احساس ہوتا ہے کہ ان مکانوں کے مکین ابھی کہیں گئے ہیں۔ کہے دیتی ہے شوخیِ نقشِ پا کی۔ ہکسلے کے اس خیال کی تائید میں قدیم ہندوستان کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ افسانہ از افسانہ می خیزد۔ بنارس کے ایک مہارشی جنوبی ہند کی سیر کو نکلے تو بندھیاچل کا بلند پہاڑ ان کے احترام میں جھک گیا۔ انھوں نے فرمایا، بندھیاچل یوں ہی جھکا رہیو، ہمیں واپس آنا ہے۔ سمندر کے کنارے پہنچ کر رشی جی مراقبے میں کھو گئے اور بندھیا آج تک انتظار میں جھکا کھڑا ہے۔ کچھ اسی نوعیت کا پراسرار رابطہ مغل آثار کے ساتھ ان کے بنانے والوں کا معلوم ہوتا ہے۔ شاید وہ تاکید کر کے گئے ہیں کہ اپنی شان، زینت اور مضبوطی کو برقرار رکھنا ہم واپس آئیں گے۔ ویسا ہی عالم چھولس میں نبل کی کوٹھیوں کا ہے۔ جنگل کے سناٹے میں وہ ابھی تک اپنے مالکوں کو یاد کرتی ہیں۔

گاؤں کے لوگوں کی زندگی میں یادگار واقعات عموماً کم پیش آتے ہیں۔ ایک موسم کے آغاز میں فصل بونا اور دوسرے موسم کے اختتام تک کاٹ لینا سب سے اہم واقعہ ہے مگر چونکہ ہر سال پیش آتا ہے اور اس کی لازمانی نوعیت ہے، لہٰذا یادداشت پر خاص

نقش نہیں چھوڑتا۔ اگر کوئی یادگار واقعہ اتفاقاً رونما ہو بھی گیا تو بہت دنوں تک یاد نہیں رہتا
چھولس کی آبادی میں سیدوں کا زمانہ سلطان بہلول لودی کے عہد سے شروع ہوتا ہے
سلطان بہلول اور غدر کے درمیان ساڑھے تین سو برس سے اوپر کا عرصہ حائل ہے۔ وقت
کی دوربین مشاہدے کی کوئی مدد نہیں کرتی اور فضا میں کہیں روشنی کا ہلکا سا نقطہ بھی نظر
نہیں آتا۔ بس وہی مددِ معاش، یعنی ایک کشتی تھی جس میں ملک بھر کے سارے سادات اور
متفرق اہلِ سعادت سوار تھے اور نہایت مزے سے گزرتی تھی۔ سادات بارہہ کے علاقہ
سے نزدیکی اور ان سے قرابت کے سلسلے نے سپاہیانہ زندگی کا راستہ کھول رکھا تھا
یہ وسیع پیمانے پر عمومی کیفیت تھی۔ البتہ غدر کے بعد سے ملک کی آزادی تک (سنہ ۱۸۵۷۔
۱۹۴۷ عیسوی) سیدّوں کی اجتماعی یادداشت میں بعض حادثات کے نقش ضرور محفوظ ہیں۔
پہلا واقعہ غدر اور غدر کے بعد دائر ہونے والا مقدمہ تھا۔ جس نے اہلِ برادری کو مدتوں
حیران اور سرگرداں رکھا۔ مقدمے کی کارروائی میر علی رضا نے شروع کی اور مدعیانِ مقدمہ
میں اپنے ساتھ ہر خاندان کے کم از کم ایک فرد کا نام شامل کیا۔ دعوے کی بنیاد یہ تھی کہ
ہم سادات چھولس موجودہ حکومت کے باغی قرار پائے اور سابق عطیۂ شاہی ہم سے چھین
لیا گیا۔ مگر نصف حصّہ دیہہ عطیۂ شاہی نہ تھا بلکہ ہمارے مورثِ اعلیٰ نے اپنے زرِ خاص
سے خریدا تھا۔ لہٰذا وہ ہم کو واگزار کیا جائے۔ دعوے کی دوسری ذیلی دفعہ یہ تھی کہ ہم
واقعتاً سکندر آباد کی لوٹ میں شامل نہ تھے، خواہ مخواہ کے الزام میں ماخوذ ہو گئے، ہم
کو بغاوت کے الزام سے باعزت بری کیا جائے اور بقیہ نصف حصّہ دیہہ ہمارے حق
میں بحال رہے۔ میر علی رضا نے بڑی جانفشانی سے مقدمہ تیار کیا، انھوں نے اپنی باقی
عمر اسی مقصد میں لگا دی۔ نہ آرام کی پروا کی اور نہ خرچ کے معاملہ میں اپنی بساط کا خیال
رکھا۔ سلطان بہلول لودی کے زمانے سے بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی تک جو فرمان
بسلسلۂ معافی عطا ہوئے تھے ان کی اصل یا نقلیں اور دوسری دستاویزات جمع کرنا معمولی
دردِ سر نہ تھا۔ انگریز حاکم نے مقدمے کی سماعت کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا۔ پہلے مرحلے
کی سماعت برسوں میں مکمل ہوئی۔ البتہ عدالت نے دعوے کی پہلی دلیل منظور کر لی اور

نصف چھولس سیدوں کو واپس مل گیا۔ معافی کا قاعدہ ہمیشہ کے لیے منسوخ ہوا۔ وہ نصف حصّہ زمینداری میں منتقل ہوگیا۔ مقدمے کی دوسری مد کے سلسلے میں حکم جاری ہوا۔ کہ معاملہ ملکہ معظمہ کی مرحمت اور منظوری کے واسطے لندن بھیجا جائے گا۔ میر علی رضا اور ان کی نسل کے لوگ انتظار کرتے کرتے خدا کو پیارے ہوگئے، ملکہ وکٹوریہ کی منظوری کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ ان کے بعد پھر کسی نے ان کی طرح انہماک کے ساتھ پیروی کرنے کا حوصلہ نہ دکھایا۔ خاتمہ زمینداری تک سیّدوں کو بقیہ نصف حاصل کرنے کی حسرت رہی جو پوری نہ ہوسکی۔

چھولس کا دوسرا یادگار واقعہ لوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ انیسویں صدی عیسوی ختم ہونے میں سال بھر رہ گیا تھا جب یہ قصّہ پیش آیا۔ (سنہ ۱۸۹۹ء) اصل میں غدر نے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کو حد درجہ بے بس اور ان کی نفسیات کو بری طرح مجروح کردیا تھا۔ مغربی استعمار کی کوشش تھی کہ ان کو ایسا تباہ اور ذلیل کیا جائے کہ پھر کبھی سر اٹھانے کی ہمت نہ کریں۔ انگریز اپنے ساتھ مسیحی دنیا کی میراث، مسلمانوں کے خلاف صلیبی تعصّب اور نفرت، کو لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ دوسری طرف مصیبت یہ تھی کہ عام مسلمان حقائق کا صحیح ادراک کرنا اور حالات کو حقیقت پسندی کی نظروں سے دیکھنا بالکل نہ جانتا تھا۔ چھولس میں قاعدہ چلا آرہا تھا کہ کسی ہندو کے گھر شادی کی تقریب ہو تو وہ اپنے زمیندار کو ایک روپیہ نذرانہ پیش کرے گا۔ یہ نذرانہ حبوب کہلاتا تھا۔ عربی لغت میں حبوب اناج کے دانوں کو کہتے ہیں، اصطلاحاً مطلب یہ ہے کہ کچھ اناج کے دانے میسر تھے جو آپ کو پیش کرتا ہوں۔ حبوب کا روپیہ ایک علامت تھا جو زمیندار سے رعایا کی تابع داری کا رشتہ واضح کرتا تھا۔ حبوب وصول ہوتے ہی زمیندار کی طرف سے جنگل میں ایک بڑا سا درخت کاٹنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ یعنی جو کہ بطور ایندھن شادی میں کام آئے گا، اور یقیناً درخت کی قیمت ایک روپیہ مبلغ سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ چھولس میں اونچی ذات کے ہندوؤں کی آبادی کا نقشہ یہ تھا کہ گاؤں کے مغرب میں برہمنوں کا بالکل علیحدہ محلّہ تھا۔ گڑھی کی طرف سے جو راستہ انصاریوں کے گھروں کے پاس

آکر آبادی میں داخل ہوتا ہے وہاں سے بازار شروع ہوتا تھا جو بالکل سیدھا موجودہ دیوان خانہ تک پہنچ کر نوے درجے کا زاویہ قائمہ بناتا ہوا درزیوں اور تنبولیوں کے ٹھکانے پر جاکر ختم ہوتا تھا اس پورے بازار میں بنیوں کی بادشاہت تھی اور اچھے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔ بازار کے ابتدائی سرے پر صرافوں کی دو دکانوں کا جمگھٹ تھا۔ دیسی شکر (کھانڈسازی) کا خوب رواج تھا۔ غرضیکہ قصہ جبوب سے شروع ہوا۔ برہمنوں نے فتنہ اٹھایا اور بنیوں کو اپنا ہم خیال بنالیا کہ جبوب دینا بے عزتی ہے، ہم نہ دیں گے۔ انگریزی حکومت آگئی، گاؤں ضبطی میں چلا گیا۔ سیدوں کے وہی ٹھاٹ ہیں، یہ کہاں کے مالک رہ گئے۔ آخر جبوب بند ہو گیا۔ سیدوں کو رنج ہوا اور بہت غصہ آیا۔ حالانکہ دانشمندی کا تقاضا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی افق پر ابھرنے والی تبدیلی کو سمجھ جاتے۔ انگریز مسلمانوں سے بدظن تھے اور ان کو مزید پست کرنے کی غرض ہندوؤں کی حوصلہ افزائی نئی حکومت کی پالیسی قرار پاچکی تھی۔ ہندو جارحانہ انداز میں آگے بڑھنے لگے تھے۔ اعلیٰ سطح پر سرکاری زبان انگریزی ہو گئی تھی۔ معمولی عہدوں پر اردو میں کام کرنے کی اجازت ملی تھی۔ سرسید کی زندگی میں دو بار ہندو اپنی طرف سے اردو کو ہٹانے اور اسکی جگہ ہندی نافذ کرنے کی تحریک اٹھا چکے تھے۔ کانگریس پارٹی قائم ہوتے ہی ۱۸۸۵ء اور اکثریتی منطق کا بدیہی انجام مسلمانوں کے تدبر سے پوشیدہ نہ رہ گیا تھا۔ سرسید کا انتقال چھولس کی لوٹ سے ایک سال پہلے ہوا تھا۔ چھولس کے سنجیدہ اور ہوش و حواس رکھنے والے لوگ ان نزاکتوں سے خوب واقف تھے۔ ایسی صورت میں اہل برادری کو چاہیے تھا کہ جبوب کو عزت کا سوال نہ بناتے یہ سوچ کر صبر کر لیتے کہ جہاں اتنی بڑی سلطنت گئی وہاں اپنے ذرا سے حقیر گاؤں کا جبوب بھی گیا۔ رہے نام اللہ کا۔ بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا، اتفاق کی بات مولوی فیاض حسین نام کے ایک بزرگ کا انتقال ہوا۔ وہ اصلاً جارچے کے تھے لیکن چھولس میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ انکے سوئم میں حسب دستور جارچہ، نور پور، چھولس کی ساری برادری جمع ہوئی۔ قرآن خوانی اور مجلس کے بعد حقے سامنے رکھے گئے تو کسی نے جبوب کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ طبیعتوں میں غصہ تو تھا ہی، ماحول میں جلد گرمی آگئی۔ امام باڑے کے اندر دیوار سے پشتا لگاکر بیٹھنے والے بزرگوں کا ایک الگ مزاج ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی کے منہ سے نکلا

آخراس کا کچھ بندولبست ہونا چاہیے۔ چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ ہم سے علاج کرنا آتا ہے۔ ذراسی دیر میں ٹھیک کر کے دکھا دیں۔ اکثر شکایت کا رخ بنیوں کی طرف تھا کہ صبح سے شام تک بے ایمانی کرتے ہیں۔ ہم چشم پوشی کرتے ہیں اور پناہ دیتے ہیں ورنہ گو جب دن دہاڑے لوٹ لیں۔ اور انھوں نے ایسی غداری دکھائی کہ جو بیا دینے سے منع کر دیا، دیکھ لیں گے۔ کچھ من چلے لگے میرزا سودا کا مصرعہ پڑھنے، اب ان حرامیوں کی مدارت چاہیے۔ البتہ اہل نشست میں ایسی بات نہ تھی کہ سب کا پارہ چڑھ گیا ہو۔ بہت سے مہذب اور شائستہ افراد بھی تھے جنھوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ کیا ہونے جارہا ہے۔ وہ برابر صبر و سکون کی تاکید کرتے رہے۔ اور گاؤں کے بدلگام گھوڑوں کو بے قابو ہونے سے روکنے میں دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ مگر ہوا یہ کہ پورے مجمع میں شور مچ گیا۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ معاملہ جاہلوں کے ہاتھ میں جا چکا تھا، سب یہ کہتے ہوئے نکلے کہ چلو، لوٹ لو، جو کچھ ہوگا دیکھا جائیگا۔ بستی میں رہنے والی خلق خدا، چھوٹی امت، اور ان کی دیکھا دیکھی متفرق پرجا کا ہجوم، لوٹ کا نام سنتے ہی آناً فاناً سب بازار کی طرف ٹوٹ پڑے۔ آگے آگے سید اور ان کے پیچھے خلقت، پھر کیا تھا، جس بنیے کے لٹھ رسید کیا وہ ہائے ہائے کرتا دکان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بند دکانوں کے قفل میں لٹھ مارا اور قفل اڑا دیا۔ خلقت پھرتی کے ساتھ دال، چاول، ناریل، جس کے جو ہاتھ پڑا صاف کرنے میں لگ گئی۔ ذراسی دیر میں پورا بازار لٹ گیا۔ حیرت اور عبرت کی بات یہ کہ لوٹ کا مال چھوٹس کے سیدوں کے گھروں میں قطعی داخل نہ ہوا۔ بس اتنا ہوا کہ چار چھ بیل گاڑیاں عورتوں کو بھر کر سوئم میں لائی تھیں۔ انھوں نے سوچا خالی ہاتھ کیا جائیں۔ بزازوں کی دکان سے کپڑے کے تھان رکھ کر ضرور لے گئے فوراً اندیشہ پھیل گیا کہ پولیس آئے گی تلاشی ہوگی۔ سیدوں نے اپنے گھروں سے نکال کر لوٹ کی ہر جنس اپنے چمار نوکروں کو دیدی، حتیٰ کہ دیسی شکر کی بوریاں بھی ان کے سروں پر رکھوا کر ضائع کرائیں۔ کچھ شکر چمار گھول کر پی گئے اور باقی گاؤں کے تمام کنوؤں میں ڈال آئے۔ اس حادثے کا انجام ظاہر ہے کہ اچھا نہ ہوا۔ برہمنوں سے مقابلے

ہیں سید بھی زخمی ہوئے۔ ہجوم بہت تنگ گلی سے ہو کر برہمنوں کی طرف بڑھا، وہاں انھوں نے موقع کی صورت سے فائدہ اٹھا کر سیدوں کے خوب سر پھوڑے اور آگے بڑھنے نہ دیا۔ پھر کچھ برہمن زنانہ بھیس بدل کر گاؤں سے باہر نکلے اور تھانے میں جاکر رپورٹ کرائی۔ بلند شہر کے انگریز کلکٹر نے اس کو بدامنی کا سنگین معاملہ سمجھا اور خود معائنے کے لیے آیا۔ بات یہ تھی کہ انگریزوں کے دل سے نہ تو غدر کی دہشت گئی تھی اور نہ مسلمانوں کی طرف سے پورا اطمینان ہوا تھا۔ چھولس کی لوٹ کے وقت انگریز عمل داری قائم ہوئے مشکل سے چالیس برس تو گزرے ہی تھے۔ بیرسٹر علی اوسط ہنگامے کی اطلاع سنتے ہی لکھنؤ سے آگئے۔ چھولس میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت تک انگلستان سے قانون پڑھ کر پلٹنے والوں کی تعداد زیادہ نہ ہوتی تھی۔ اس طبقے کا انگریز حاکموں کی نظروں میں خاص احترام تھا۔ مشہور ہے کلکٹر نے بیرسٹر علی اوسط کو تار دے کر بلایا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی سید لپک کر پہنچا اور وہ روئیداد سن کر چلے آئے۔ کلکٹر نے ان سے شکایت کی کہ دیکھیے آپ کے عزیزوں نے کیا غضب ڈھایا ہے ہیں؟ میکالے کا ترتیب دیا ہوا قانون تعزیرات ہند تھوڑی مدت پہلے ہی شمالی ہند پر نافذ ہوا تھا۔ بیرسٹر علی اوسط کی درخواست پر کلکٹر مان گیا کہ مقدمے میں دو فریقوں کی مار پیٹ اور باہمی فوجداری کی دفعہ لگائی جائے گی جس میں معمولی سی سزا ہے اور کلکٹر کو چھوڑنے کا بھی اختیار ہے بلکہ کلکٹر سے یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ سیدوں کے بیان سنتے ہی وہ سب کو رہا کر دے گا۔ بس سید اتنا بیان دیں گے کہ ہم نے ان کو مارا، انھوں نے ہم کو مارا۔ یہاں جاہلوں کے سر پہ نیا بھوت سوار ہوا۔ کہنے لگے ہم بیان دیں گے کہ رعایا سے پٹے، یہ کبھی نہ ہوگا۔ برادری کے سنجیدہ لوگوں نے لاکھ سمجھایا، بیرسٹر علی اوسط اصرار کر کے تھک گئے۔ مگر اُلٹا بنایا ہوا بیان دینے پر ہرگز آمادہ نہ ہوئے، یہی کہتے رہے کہ ایسا نامردی کا سبق ہم نہ پڑھیں گے، کچھ ہی حشر ہو، کلکٹر نے بذات خود بحث کی کہ پٹے نہیں تو سر میں چوٹیں کہاں سے آگئیں کہو کہ مار پیٹ ضرور ہوئی ہے، مگر سب نے الٹے سیدھے بیان دیے۔ کسی نے کہا میں جنگل میں اپنے بھوسے کا بونگا باندھ رہا تھا وہاں سے گر پڑا۔ کسی کو کچھ اور بہانہ یاد آیا۔ نتیجہ یہ کہ سیدوں کو یکطرفہ سزائیں ہوئیں اور بہت سے بہت اٹھانی پڑی بھری تنخواہ

کا نام نہ لیا۔ یہ قصہ میرے والد ہنس کر سناتے تھے۔

یادگار رواقعات کے سلسلے میں ایک اور ہے جس کا اجمالی ذکر بے محل نہ ہوگا۔ وہ چھولس کے نواح میں ذرا سے فاصلے پر آباد جاٹوں سے فوجداری کا وقوعہ ہے (سنہ ۱۳۵۱ھ ۱۹۳۳ء) غدر میں جارچہ چھولس کی ضبطی کے بعد جارچہ تو نیلامی میں دہلی کے کسی مہاجن نے خریدا۔ اور چھولس کی نصف معافی منضبطہ انگریزوں کی طرف سے سردھنا ضلع میرٹھ کے نوابوں کو بخش دی گئی۔ نوابوں کی تاریخ یہاں سے شروع ہوتی تھی کہ ہندستان پر روس کی نظر التفات دیکھ کر انگریزوں کو گھبراہٹ ہوئی۔ انھوں نے تاج برطانیہ کے سب سے درخشاں ہیرے کی حفاظت کے لیے سرحدیں آگے بڑھانے کی پالیسی پر عمل مناسب سمجھا۔ یعنی افغانستان پر قبضہ ہو جائے تو ہندستان کی طرف روس کی پیش قدمی کا خطرہ ٹلا رہے گا۔ انگریز مسلسل دو لڑائیوں کے بعد پہلی افغانستان اور خاص کابل پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر یہ کامیابی عارضی ثابت ہوئی۔ آخر میں انگریزی فوج کو شکست ہوئی اور پسپا ہونا پڑا۔ اس ساری مہم میں کابل کے کسی بزرگ نے اپنے وطن کا مفاد اور ذاتی حیا و ایمان کو بھول کر خفیہ طور سے انگریزوں کی مدد کی تھی۔ وہاں سے انگریز بھاگے تو اپنے یار وفادار اور اس کے تمام اہل خاندان کو بھی ساتھ لیتے آئے اور ان لوگوں کو سردھنا ضلع میرٹھ کا نواب بنا دیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرٹھ اور نواح میرٹھ کے مسلمان ان بزرگوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اگر سادات چھولس کا نوابوں کے ساتھ دوستانہ ربط ضبط پیدا نہ ہو سکا تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ دوسری وجہ یہ بھی شامل کی جاسکتی ہے کہ اپنے آدھے گاؤں کی ضبطی سیدوں کو بہت کھٹکتی تھی اور کسی طرح دل کو صبر نہ آتا تھا۔ بعض اوقات حالات کی افتاد اچھے بھلے آدمی کو جھگڑالو اور بدمزاج بنا دیتی ہے ورنہ سید ایسے گئے گزرے نہ تھے۔ ایک دن ہوا یہ کہ نوابوں کا کوئی اعلیٰ معتمد یا ان کے خاندان کا فرد ہاتھی پر سوار ہو کر گاؤں میں داخل ہوا۔ ایک سید غصے میں ایسا اچھلا کہ اس کو ہاتھی کے اوپر سے کھینچ لیا۔ وہ زمین پر آرہا تو مفصل مار لگائی۔ نواب خوف کھا گئے اور انھوں نے اپنا نصف حصہ گویا نصف چھولس، موضع بھٹونا ضلع میرٹھ کے ایک جاٹ کے

ہاتھ فروخت کر دیا جو غدر کے بعد نیا زمیندار بنا تھا۔ مشہور تھا کہ غدر میں کچھ انگریز کہیں محصور ہو گئے۔ وہ ان کو کئی دن تک کاندھے پر بہنگی لٹکا کر کھانے کے لیے چنے لے جاتا رہا۔ غدر ختم ہوا تو انگریزوں نے اس کو انعام میں کئی گاؤں باغیوں سے چھین کر دیے اور وہ زمینداروں میں شمار ہونے لگا۔ چھولس کی خریداری کے بعد موضع بٹھونا کے چودھری صاحب نے کاشت کاری کے لیے اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بھیج دیا، اور وہ چھولس جارچہ کے درمیان جھونپڑیاں ڈال کر بس گئے۔ جاٹ کاشت کاری کے بیحد شوقین، محنت کے عادی، ہاتھ پاؤں کے تنومند، سخت جان اور زمین کے بھوکے ہوتے ہیں۔ جارچہ چھولس دونوں طرف کا رقبہ آہستہ آہستہ ان کی طرف منتقل ہوتا رہا، اوپر سے زمیندار کی سرپرستی اور مقامی طور سے وہ خود اپنی کھیتی بڑھاتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ جاٹوں کی بالکل بیچوں بیچ آبادی سے سیدوں کی خوش حالی پر ناگوار اثرات پڑے اور قباحتیں کھڑی ہوئیں، خاص نقصان اس خاندان کو پہنچا جس کا مدتوں سے اس علاقے پر قبضہ تھا، جہاں جاٹ آکر بسے جنگل میں پرانے وقتوں سے ان کی جھونپڑیاں تھیں اور مویشیوں سمیت کھیتی کے سامان کا ٹھکانا وہیں رہتا تھا۔ وہ خاندان ویسے بھی برادری میں جہالت اور جھگڑے کے لیے ذرا سا بدنام تھا۔ عام اہل برادری ان کے لٹھ سے دور رہنے میں خیریت تصوّر کرتے تھے۔ اور کوئی ان کے منہ نہ لگتا تھا۔ آدمیوں کی تعداد بھی کسی زمانے میں اس خاندان کے اندر کافی تھی۔ ان کی عادت میں داخل تھا کہ آپس میں فتنہ فساد کر کے جوش ٹھنڈا کر لیتے تھے۔ عورتوں نے غل مچایا اور مردوں نے ایک دوسرے کے سر میں لٹھ دیا، یہ ڈرامہ مہینہ دو مہینہ بعد ضرور دہرایا جاتا تھا گھر کی بات اور تھی، باہر یہ عادت مہنگی پڑی۔

اُن لوگوں نے اپنے مویشی جاٹوں کی آبادی اور کھیتوں کی طرف لے جانا موقوف نہ کیا۔ اُن کی تھوڑی سی آراضی وہاں ضرور تھی مگر زیادہ رقبہ جاٹوں کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُن کے مویشیوں کا آزادی کے ساتھ چرنا اور گھومنا پھرنا جاٹ

پسند نہ کرتے تھے۔ احتیاط اور نگرانی کے باوجود کھیتوں میں نقصان ضرور ہوتا ہوگا کاشت کاری کی نوعیت ایسی ہے کہ بے شمار جھگڑے خواہ مخواہ کھڑے ہوجاتے ہیں۔ جاٹ بھی اپنی نسلی فطرت اور جبلت کے اعتبار سے بہت زیادہ امن پسند نہیں ہوتے۔ ان کی عادتوں میں ایک تو مینڈھ شکنی کر کے پڑوسی کے کھیت کا رقبہ چرانا بری بات نہ تھی۔ دوسری نامعقول حرکت اور شروع کی، یعنی برابر میں لگے سیدوں کے کھیت میں پانی کاٹ دینا اور بوئی ہوئی فصل تباہ کر دینا، تاکہ تنگ آکر سید اپنی زمین ان کے حوالے کرنے پر مجبور ہوجائیں، ایک سوچی سمجھی شرارت تھی۔ غرضیکہ جاٹوں اور سیدوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے غبار پیدا ہوتا چلا گیا۔ بدقسمتی سے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ اس خاندان کے لوگوں میں جس کا اوپر ذکر ہوا، اور جاٹوں میں کھیت مویشی اور اسی طرح کی کسی بات پر لٹھ پٹائی اور براہ راست ٹکراؤ ہو گیا۔ یکایک بغیر کسی آگاہی اور آمادگی کے سارے سید فوجداری کی لپیٹ میں آگئے، اکرام علی نام کا ایک نوجوان، جو بیچ بچاؤ کی نیت سے بھاگ کر پہنچا تھا۔ بے قصور مارا گیا۔ دونوں فریق کافی تعداد میں زخمی ہوئے اور شدید ضربیں آئیں، فوجداری کا مقدمہ سیدوں نے سلیقہ اور ڈھنگ سے لڑایا۔ عیاں مفت کے وکیل مل گئے، ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ پیشی کے دن بحث سننے کے شوق میں بلند شہر کے وکیل اپنا کام چھوڑ دیتے تھے اور اجلاس کا کمرہ وکیلوں سے بھر جاتا تھا۔ جارجہ چھولس کے جو لوگ پولیس میں ملازم تھے انھیں ضابطہ فوجداری زبانی یاد، وہ باری باری چھٹی لے کر آتے تھے اور بیانات یاد کراتے تھے۔ کوئی آنے میں دیر کرے تو منتظم مقدمے کی طرف سے یاددہانی جرمانے کے انتباہ سمیت فوراً کی جاتی تھی۔ مقدمہ سیدوں کے حق میں گیا اور جاٹ ملزموں نے لمبی سزائیں پائیں۔ آخر میں یہ سمجھنا انسانی فطرت کا نہایت سادہ تصور ہوگا کہ تمام سیدوں نے بھرپور اتفاق کے ساتھ مقدمے میں جان لگائی ہوگی۔ ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ اتفاقاً معاملات شروع سے آخر تک ایک آدمی ہاتھ میں تھامے رہا۔ بعض لوگ اس کی حیثیت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ سوال ذاتی منافرت سے کہیں زیادہ انا کی تسکین کا تھا۔

تنہا ایک آدمی کی ذات کو حلِ اعتماد سمجھنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی تابعداری بھی کرو۔ وہ جو کچھ کہہ دے مانو اور جس طرف قدم اٹھائے پیچھے رہو۔ ان کی طبیعت تابعداری تو در کنار اجتماعی مفاد کا تقاضا دیکھ کر سخت اور ٹیڑھی گردن میں ذرا سی لچک پیدا کرنا بھی سراسر توہین تصور کرتی تھی۔ آدمی کی غیر تربیت یافتہ انا بہت سے مذموم احساسات پیدا کرتی ہے جو اس کو تخریب کی خطرناک حد تک لے جا کر چھوڑتے ہیں۔ جاٹ دل برداشتہ ہو کر جا رہے تھے، ہمارے کچھ اہل برادری نے ان کی پشت پناہی کی اور حمایت کا یقین دلایا ان کے اکھڑے ہوئے قدم پھر سے جم گئے۔ ملٹن کی فردوس گم گشتہ میں شیطان ایک موقع پر کہتا ہے، دوزخ میں جھنڈا اونچا رکھنا جنت کی تابعداری سے بہتر ہے۔

عمرانیات اور علم اجتماع کے ماہرین نے جگہ جگہ تجربے کر کے دیکھے اور نتیجہ ایک ہی برآمد ہوا۔ یعنی یہ کہ دیہاتی زندگی کا تصور دھڑے بازی اور تفرقے کے بغیر محال ہے۔ گاؤں کی مخلوق کو نہایت قدیم وقتوں سے یہ راز معلوم ہے کہ اصلی رونق اور سرگرمی دو مقابل دھڑوں یا فریقوں میں بٹ کر رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ چھولس کا تجربہ ہے۔ برادری کے بزرگوں کی خاطر خوشامد یا کسی مولوی صاحب کے اتفاقیہ ورودِ مسعود کی بدولت سب لوگ کچھ دنوں کے لیے ایک ہو بھی گئے تو حاصل مکمل سکوت اور سناٹا، جس سے بہت جلد جی گھبرا اٹھتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خدانخواستہ کوئی بھیانک وبا پھیل گئی۔ اور بندگان خدا ڈر کے مارے گھروں میں گھسے بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں اختلاف انسانی فطرت میں داخل ہے۔ وجہ دیہاتی بہتر جانتا ہے۔۔ وہ صفت نہ ہو تو ہر وقت طرح طرح کے مزیدار تماشے کہاں نظر آئیں گے۔ دیہاتی اپنی تمام توانائی آپس کے دو حریف دھڑوں کی دمادم ٹکر کے لیے محفوظ رکھتا ہے اور ...... اسی کی نذر کر ڈالتا ہے پھر کسی اور کام کے لیے نہ دم رہ جاتا ہے اور نہ جی چاہتا ہے نقصان یکے بعد دیگرے دونوں کا ہوا کرے، نہ کوئی فریق گھبرائے گا اور نہ آگے کے لیے توبہ کرے گا۔ جہاں ایک کی طرف سے کوئی حرکت ہوئی، دوسرا جیسا کہ کسی ایرانی شاعر کا قول ہے این جواب آں غزل، خم دس جنگی والے نوک پنجے جھاڑ کر فوراً تیار ہو جائے گا۔ مثالیں

معاملہ خوب سمجھا سکتی ہیں۔ مگر فی الحال مثالوں کو واقعی کے بجائے فرضی سمجھنا خیریت کا باعث ہوگا۔ فرض کیجیے کسی دن فریقین کی نوجوان نسل نے ایک دوسرے کے سامنے بندوقیں تان کر بغیر نشانہ جمائے دھڑادھڑ کا طوفان مچادیا، مقصد کسی کو مارنا نہیں محض ڈرانا دھمکانا، ذراسی خون میں گرمی آگئی اور خلاف قانون خفیہ دیسی مستریوں کے ہاتھوں کی بنی ہوئی بندوقوں کی نال سے زنگ صاف ہو گیا۔ مقطعے کا بند پولیس رپورٹ، وہاں ایک فریق تاک کر ان حریفوں کے نام لکھائے گا جن کے فرشتوں کو خبر نہ تھی کہ بندوقیں کہاں سے آگئیں اور کس بات پر چاند ماری ہو پڑی۔ اگر کچھ دن بعد کوئی اور ناگہانی اور اس سے بھی زیادہ سنگین واردات پیش آجائے، اور قتل سے زیادہ سنگین کیا ہو سکتی ہے، تو گویا کہ دوسرے فریق کو موقع ہاتھ آیا۔ یقین جانیے کہ ملزمان مقدمہ میں مقابل کا کوئی سراسر بے قصور آدمی ضرور دھرا جائے گا۔ اخلاقی اعتبار سے پشیمانی اور ندامت کی بات تو الگ رہی، ذراسا افسوس بھی کسی کو نہ ہوگا، بعض کہیں گے واہ، نہلے پر دہلا پڑ گیا اور کچھ کی زبان پر ہوگا، جواب کا انتظار کیجیے۔

ارسطو سنہری توازن کا اصول تعلیم دیتا ہے۔ ہمارے اندیشہ و عمل دونوں میں ترازو کے کانٹے کا سا اعتدال رہنا چاہیے۔ ترازو کا کانٹا ذراسا درمیان سے ہٹ کر دائیں یا بائیں جھکا اور توازن کا اصول بگڑا، دنیا کی ساری ہنگامہ خیزی اور گڑبڑ کا سارا سبب یہی ہے۔ یہاں سنہری توازن والی بات سے قریبی تعلق رکھنے والا فارسی کا مشہور محاورہ بھی ذہن سے ٹکراتا ہے۔ "عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" شراب کے عیب تو سارے بیان کر دیے، اس کا کچھ ہنر بھی بیان کرو، دیہاتی زندگی میں وہ ساری قباحت تو ہے جس کا ذکر اوپر گذرا، لیکن وہاں کے لیل و نہار خاص نوعیت کی برکت سے خالی نہیں ہیں۔ آدمی وہاں دن کو تازہ ہوا میں سانس لیتا ہے، ماحولیاتی کثافت کے خطرات ہنوز اس تک نہیں پہنچے ہیں۔ وہاں رات کو سونے سے قبل خواب آور گولیوں کا محتاج کوئی نہ ملے گا۔ اول شب سے گہری نیند آتی ہے اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی سب جاگ اٹھتے ہیں۔ یہ تو تھی انفرادی برکت، اس سے بھی زیادہ قابل

ملاحظہ اجتماعی برکت ہے، انسانی زندگی میں ٹھہراؤ اور رچاؤ جس کے بغیر تہذیبیں رنگ اور نکھار سے خالی رہ جاتی ہیں. محض تھوڑی آبادی والی بستیوں میں ممکن ہے. آدمی کے عقاید اور رسوم جن کا براہ راست تعلق اسکی داخلی اور خارجی حیات سے ہے، ہنگاموں سے خالی بستیوں کا تحفہ اور صدیوں کے امتداد کا نتیجہ ہیں، مطلب یہ کہ ان کی تشکیل میں بڑا وقت لگا ہے. گاؤں میں اب سے پہلے کسی ہلچل کا منہ دیکھے بغیر مسلسل پشت در پشت تک رہنا ممکن تھا. آج کل شہری دنیا کا معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ زید ایک شہر میں رہتا ہے، زید کے بچے بمشکل وہاں رہ پائیں گے. ماں باپ نے نئی نسل کی تربیت کا بکھیڑا اول تو ٹیلیویژن پر چھوڑ دیا، فرض کیجئے کہیں کسی گھر میں دادی اماں کی تربیت میسر آبھی گئی تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے سکھائے ہوئے آداب دوسرے مقام پر پہونچ کر کارآمد ثابت ہوں گے. اور فرسودہ نہ سمجھے جائیں گے. جدید صنعتی معاشرے کا انسان بالکل خانہ بدوش ہو گیا ہے، بقول داغ، براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اسکو کہتے ہیں.

●

## ساتواں باب

# عزیزانِ چھولس

غالب کا مصرعہ ہے: چون قطرہ در روانی دریا گمیم ما۔ زمانے کو دریا کی روانی تصور کرنا بڑی پرانی تشبیہ ہے جو متعدد تہذیبوں کے دور سے گزرتی ہوئی آئی ہے۔ آدمی وقت کے دریا میں ایک قطرہ ہے۔ میر سید علی سبزواری کی نسل پر وقت کا عمل اس انداز کا رہا کہ خاندانوں کی تقسیم در تقسیم کا سلسلہ ضرور پیش آیا مگر سیرت اور کردار کے معاملہ میں تقریباً سب ایک سی وضع کے لوگ نظر آتے ہیں؛ نہ کوئی ایک خاندان دوسرے سے بہت آگے بڑھا، اور نہ کسی نے ایسا غیر معمولی امتیاز حاصل کر کے دکھایا کہ سب کو پیچھے چھوڑ جاتا۔ ابن یمین، ایران کا فلسفی اور صوفی شاعر زندگی کا ایک خاص تصور پیش کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، سادات چھولس نے بالاتفاق اس تعلیم کو مضبوط گرہ میں باندھے رکھا: "زمین کے چند قطعے اور ہل چلانے کے لیے دو بیل، ایک کا نام وزیر رکھ، دوسرے کو امیر کہہ کر پکار۔ دونوں وزیر و امیر تیرے غلام۔ صبح سے شام تک دونوں پر سانٹا گھا اور خدمت لے یقین جان کہ روزی کا معاملہ صحیح ہوگیا اور کیا چاہیے، کیسی بھاگ دوڑ لگائی، کس کس کے دروازے پر سلام جھکاتا پھرے گا، سگ دوانی کی ضرورت کیا پڑی ہے" ابن یمین کی تعلیم دلچسپ، سہل اور مفید سہی، مگر قباحت سے خالی نہیں ہے۔ وہ بھی کچھ اچھی بات نہیں ہوتی کہ طبیعت میں عافیت پسندی کی عادت

کاہلی کے درجے کو پہنچ جائے اور آدمی جدوجہد سے جی چرانے لگے. جہاں تک ہمارے اہل برادری کا معاملہ ہے، حالات جیسے بھی رہے ہوں اور مجبوریوں کا جو بھی دباؤ ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں عیسوی کی ایک دو دہائیاں گزرنے کے بعد ایک بڑی تعداد ادنیٰ بساط پر قناعت کرنے کے لیے آمادہ ہو چکی تھی. وہ بزرگ جن کے کھونٹے پر وزیر، امیر بندھے تھے ان کی گزربسر کسی طرح کھینچ تان کر ہو جاتی تھی، ورنہ اکثر لوگ تھوڑی سی تعلیم کے سہارے باہر نکل کر نوکریوں کی تاک میں رہتے تھے تب کہیں کام چلتا تھا. تبرکاً اور مشتے نمونہ بعض ہستیوں کا ذکر خیر، اجمالی اور سرسری ہی سہی، نہایت ضروری ہے. آئندہ نسلوں کے لیے ان کی یاد حدیثِ شوق بن جائے گی : گزشت قافلہ و نالۂ جرس باقیست.

●

## میر علی رضا

میر علی رضا، چھولس کے سیدوں میں بہت بڑی حیثیت کے زمیندار نہ تھے. اور مزاج بھی زمینداروں والانہ پایا تھا. دوسروں کے پاس زیادہ بڑی زمینداریاں تھیں. پھر بھی غدر کے بعد وہ آگے بڑھ کر نمایاں ہو گئے اور ساری برادری ان کو اپنا نمائندہ فرد سمجھنے لگی. اصل بات یہ ہے کہ اگر کسی انسانی جماعت پر، وہ بہت بڑے برصغیر میں پھیلی ہوئی ہو یا چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہو، کبھی خدانخواستہ قسم کا نازک وقت پڑ جائے اور مایوسی ایک وبا کی صورت میں آکر سب کو گھیر لے تو ذراسی حوصلہ مندی بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بن جاتی ہے. میر علی رضا وقت کا تقاضا سمجھ گئے. انھوں نے ایسے تشویشناک مرحلے پر ہمت اور ہوش مندی کا ثبوت دیا جب ان صفات کی اشد ضرورت تھی. غدر کا ہنگامہ ٹھنڈا ہوا اور انگریزی عمل داری قائم ہو گئی تو تعزیرات اور امورِ ملکی و مالی بشمولیت جائیداد منقولہ و غیر منقولہ سے متعلق نئے قوانین نافذ ہوئے جو

ہندوستانیوں کی سمجھ میں کم آتے تھے۔ خصوصاً مسلمانوں کے لیے تو بالکل ہی غیر مانوس تھے۔ ان کو اپنے صدیوں پرانے دیوانی و فوجداری کے ضابطوں کی برطرفی پر سخت حیرانی تھی۔ دوسرے انگریزوں کی نظر میں طبقۂ اشراف سے تعلق رکھنے والا ہر مسلمان، شہری ہو یا دیہاتی، حکومت کا باغی قرار پایا تاوقتیکہ برخلاف ثبوت پیش نہ کرے اور بارِ ثبوت بھی اسی کی گردن پر تھا۔ باغیوں کی گرفتاری اور پھانسیوں کی مصیبت نے سب کے دلوں پر وہ دہشت طاری کی کہ شریفوں کے لیے گھر سے باہر قدم رکھنا دشوار ہو گیا۔ چینی زبان کی کہاوت، یعنی علی الصبح گردن پر ہاتھ پھیر کر دیکھ لینا چاہیے کہ سالم ہے، غدر کے بعد مسلمان شرفا پر صادق تھی۔ کسی کو جان کا اطمینان نہ رہ گیا تھا۔ ایسے عالم میں میر علی رضا کی طرف سے نئے حاکموں کی عدالت کے سامنے نہایت ادب اور عاجزی کے ساتھ ایک عرضی گذرتی ہے حالات کو دیکھتے ہوئے عرضی کی سوجھ بوجھ اور پورے مقدمے کی تدبیر معمولی اقدام نہ تھا۔ عام کیفیت یہ تھی کہ کسی کو جان کی خیر مانگنے کے علاوہ کچھ یاد نہ تھا۔ اس وقت تنہا ایک آدمی کا دل گھبراہٹ سے آزاد رہا۔ اور اس کو بالکل تازہ اور نئی حکمت سوجھی کہ مفروضے کے طور پر مان لیا جائے ہم باغی ہیں۔ سابق حکومتوں نے جو مراعات زمانۂ ماضی میں ہم کو عطا کی تھیں۔ نئی حکومت ان سے محروم کر دینا چاہتی ہے۔ ہم صبر سے تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ جو آراضی ہمارے جدِ اعلےٰ نے اپنے زرِ خاص سے خریدی تھی اور جس کے ہم مالک ہیں اس کو چھین لینا انصاف کے خلاف ہے اور عقل عمومی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ پھر اس خیال کو قانونی شکل میں پیش کرنا، اطمینان کے ساتھ معاملے کو آگے بڑھانا، مسلسل اور لمبی پیروی کرنا یقیناً اس فردِ واحد کی ذہانت، ہمت اور عملی صلاحیت کا ثبوت تھا۔ اس کی کوششوں کے نتیجہ میں جھولس کے پٹواری کی کھوٹ وہاں کے ہر سید کو، وہ بیس ہی بیگھے کا سہی، سنہ ۱۹۴۷ء تک زمیندار دکھاتی رہی۔ عرضی کی بنیاد اور مقدمے کی رُوداد کے اشارے گذشتہ صفحات میں گزر چکے ہیں، مگر قصہ دلچسپ اور اہم تھا،

اس لیے ناگزیر طور سے تکرار ہو گئی۔ یہی کیا کم تھا کہ نصف گاؤں کی زمینداری دوبارہ سیدوں کے ہاتھ آ گئی۔ ورنہ افلاس بے عزتی اور فاقہ سامنے منھ کھولے کھڑے تھے۔ معافی والی بات تو نہیں آ سکتی تھی۔ وہ سہولت اور آسائش غدر کے بعد گئی۔ مدد معاش کے فرمان میں صاف لکھا ہوتا تھا کہ آراضی پر جملہ عائدات اور محصولات معاف ہیں۔ انگریزی عدالت کی طرف سے جو نصف گاؤں واپس ہوا اس پر مال گزاری مقرر ہو گئی۔ میر علی رضا کی جانفشانی کا سارے سیدوں نے اعتراف کیا اور سب خوش ہوئے کہ نصف میں بھی کیا مضائقہ، زمیندار تو کہلائیں گے، رہی مال گزاری، وہ بھی جیسے ہو گا دیں گے۔ ماضی سے رشتہ کیسا بھی کمزور ہو جڑا رہے تو بسا غنیمت اور بڑے شکر کی بات ہے۔ جارچہ چھولس کے سیدوں کے سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ بعض صورتوں میں غریب اور کم بساط ہونا عین برکت اور ثواب کا باعث ہے۔ وہ سادگی سے رہتے تھے اور مال گزاری ادا کرتے میں تکلف نہ ہوتا تھا۔ ورنہ اودھ کے بڑے زمیندار اور اکثر بعض تعلق دار بھی، مال گزاری کو بڑی ناگوار چیز سمجھتے تھے، خصوصاً شاہان اودھ کے دور تک، اس لیے کہ انگریز نظم و نسق میں رعایت کے قائل نہ تھے، قاعدہ یہ تھا کہ مال گزاری کا مطالبہ جاری ہوا۔ اور ایک زمیندار دوسرے کی گڑھی میں جا کر چھپ گیا۔ سب ایک دوسرے کو خوشی سے پناہ دیتے تھے کسی کے منھ سے نہ نکلتا تھا کہ میاں آخر حکومت کی بھی ضروریات ہیں کہاں سے پوری ہوں گی، اوپر سے لطف یہ کہ بقول شاعر، اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ۔ طوائف کا ڈیرا ساتھ چلتا تھا یعنی مال گزاری ادا ہو نہ ہو، محفل کے عیش میں فرق نہ آنا چاہیے۔ جارچہ چھولس کے بزرگوں کی عادتیں خدا انھیں بخشے ایسی گئی گذری نہ تھیں۔

میر علی رضا خوش حال آدمی تھے اور فراغت میسر تھی۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے جس کا راز کیمیا سازی کے نسخے کی طرح مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ ان کی ملکیت میں کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا اور وہ اپنا خاصا وقت خواہ مخواہ کے

قضیوں سے بچا کر مطالعے میں گزارنے کے عادی تھے۔ ان کی یادگار، ادبیات سے لے کر فقہ اور انشا تک کی بیشتر کتابیں جو مدرسوں کے اعلیٰ نصاب میں داخل تھیں، آج تک ہمارے گھر میں موجود ہیں۔ بعض کتابوں کے سرورق پر ان کے نام کی مہریں اور بعض پر دستخط ثبت ہیں۔ لیتھو پریس کی ابتدا اور رواج نے اس زمانے کے باذوق لوگوں کو باقاعدہ کتابیں خریدنے اور جمع کرنے کا شوقین بنا دیا تھا۔ کتاب فروش اپنے گاہکوں کے ٹھکانے تک پہنچ کر ان کو نئی کتابوں کی اشاعت سے مطلع رکھتے تھے اور مہیا کرنے میں دیر نہ لگاتے تھے۔ غالب کی فارسی کلیات کا پہلا ایڈیشن چھپتے ہی میر علی رضا کے پاس موجود تھا۔ وہ میراث ہادی حسین، پھر علی ہادی سے گذر کر مجھے منتقل ہو گئی اور ہنوز محفوظ ہے۔ سیدوں کے تقریباً ہر گھر میں کتابیں موجود تھیں اور بعض کی ملکیت میں خطی نسخے بھی تھے، مگر بعد کی نسلیں احتیاط سے نہ رکھ سکیں۔ ایسی آب و ہوا میں جہاں ہر سال برسات آتی ہے کتاب ضائع ہونے میں لگتا ہی کیا ہے۔ آدمی کتابیں پڑھنے میں جی لگا بیٹھے تو اس کو بہت سے بظاہر دلچسپ مشاغل عمداً ترک کرنے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر شکار کا مشغلہ جو زمینداروں کو بہت مرغوب تھا۔ البتہ سب یکساں نہ تھے، معاملہ پانچ انگلیوں کا سا تھا۔ وہ جنس واقعی زیادہ تھی جو شکار کی زبردست شائق تھی۔ کتاب کو وہ اپنے مطلب کی چیز نہ سمجھتے تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو عالمگیر کی طرف منسوب محاورے کے قائل تھے کہ "شکار کار بیکاراں است" میر علی رضا کا تعلق اسی قبیلے سے تھا۔ تاریخ مشرق کی ہو یا مغرب کی، ایک طبقہ دونوں جگہ ایسا نظر آتا ہے کہ اعمال نامے کی متفرق روئیداد سے قطع نظر، اس کے دم سے تہذیب کا معیار مدتوں بلند رہا۔ اور اس کی سرپرستی کی بدولت زندگی کی مجموعی نفاست میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔ جہاں تک میر علی رضا کی زندگی کا تعلق ہے خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ شہر کی بھیڑ سے دور گاؤں میں رہتے تھے، کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، بیشتر فارسی کی کتابیں اور تھوڑی سی عربی کی بھی، جو احساسات کو گرد و پیش کی کثافتوں سے پاک رکھتی تھیں کتابوں ہی کا فیض

تھا کہ نہ تو ذہن کو تاریخی ماضی سے غافل ہونے دیا اور نہ اس رشتے میں کمزوری آنے دی جو آدمی کے تحت الشعور میں اپنے اجداد کے جغرافیائی ماحول سے ایک کھوئی یاد کی طرح لگا رہتا ہے۔ وہ طبیعت کے نیک انسان تھے۔ کتابوں کے مطالعے نے مذہبی اشغال کی طرف التفات زیادہ بڑھادیا تھا۔ مگر ایک بات یاد رکھنا ضروری ہے۔ دینداری اور علمی شغف اپنی جگہ، زمیندار یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ مولوی کہلانے لگے اور نہ کسی کی یہ مجال تھی۔ میر علی رضا کا سال وفات سنہ ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء ہے اولاد نرینہ میں تین بیٹے چھوڑے۔

•

# ہادی حسین

ہادی حسین، میر علی رضا کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ تصویر حسین اور محمد رضاؔ ان کے دو بھائی اور تھے۔ ہادی حسین نے اپنے باپ کی سیدھی سادی وضع چھوڑ کر امیرانہ طور طریقے اختیار کر لیے اور اول سے آخر تک ویسے ہی طمطراق سے رہے جیسا کہ عموماً زمینداروں کا قاعدہ تھا۔ زندگی میں ان کے وقار کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بعد کے لوگوں نے بہت دنوں تک ان کو یاد کیا اور ان کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ ایک غیر معروف سا ادبی محاورہ "یادوں کی پرستش" اکثر سنا ہے۔ اس کی بلاغت یہ ہے کہ جس آدمی کی بابت کہا جائے اس کے کردار اور مقام کا تصور نمایاں کر دیتا ہے۔ انسانی شخصیت کی تعریف آسان نہیں ہے اور نہ اس کی تشکیل و تعمیر کے راز اچھی طرح روشن ہو پائے ہیں۔ کسی ایک فرد واحد کی سیرت میں کونسے عجیب کرشمے چھپے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذات سے دوسروں کو کیسے مرعوب اور متاثر کر دیتا ہے یا گرویدہ بنا لیتا ہے، یہ سب نازک سوالات ہیں۔ ارسطو کے وقتوں سے نصیر الدین طوسی کے زمانے تک ان دقائق کا حل ہاتھ نہ آسکا، اور نہ بعد میں کسی نے دعویٰ کیا کہ میں

ان باریکیوں کو سمجھ گیا۔ گھریلو عورتوں کی بات دوسری ہے کہ بعض اوقات سامان کی فہرست میں ضروری چیزیں کم، پھر بھی میزان بالکل صحیح۔ تکرار سے کہنے میں مضائقہ نہ ہوگا کہ انسان کی شخصیت ایک معمّا ہے۔

ہادی حسین اپنی زندگی ہی میں ایک داستان بن گئے تھے۔ ان کی فیاضی اور بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام والی صفت، مہمان نوازی، کے قصّے دور تک مشہور تھے۔ کسی بارات کو جو موسلا دھار بارش میں پھنس گئی ہو، روکنا اور کھانا کھلا دینا ان کے لیے مشکل کام نہ تھا۔ حیرت یہ کہ بارش ہوا کرے، باراتیوں کی گاڑیوں کے بیل اور ان کی سواری کی گھوڑیاں بھی خاطر کے مزے اڑا کر جائیں بات تو جب ہے۔ کیا برادری تھی، کہاں سے آرہے تھے، کس طرف جانا تھا اور کون لوگ تھے، ان سوالوں سے مطلب نہیں، وہ سب آدمی تھے اور بھوکے تھے۔ "بنی آدم اعضائے یکدیگر اند" اول تو زمینداری ایک خاص قسم کا معاشرتی ادارہ تھا۔ دوسرے، مسلمانوں کے طبقۂ رؤسا کا ایک واضح مزاج تھا۔ وہ کیسی بھی معمولی بساط کے ہوں، دیہات میں بیٹھ کر صدیوں تک نہایت وسیع سلطنت کو جہاز کے لنگر کی طرح تھامے رہے اور ڈگمگانے نہ دیا۔

زمینداروں کی روایات اور ان کے معترضین کی عیب تراشیاں، اب تو دونوں ہی باتیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ آگے ان مباحثوں کی یاد رہ جائیگی اس شکایت میں تھوڑا بہت وزن ہوسکتا ہے کہ امیروں کے بیشتر کام محض دکھاوا ہوتے ہیں اور اپنی شان کے مصنوعی اظہار کی خاطر یا اپنے طبقے کا وقار بڑھانیکی درپردہ نیّت سے کیے جاتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے حامیوں کی ساری باتیں بیجا نہ تھیں۔ وہ دکھتی رگ پکڑنا جانتے تھے۔ مگر برصغیر ہند کا پس منظر پہچاننے میں ان سے صریحاً خطا سرزد ہوئی، یا انھوں نے دیدہ و دانستہ چشم پوشی سے کام لیا۔ ہندوستان میں نوع آدم کی اکثریت منو کے قانون کی ماری اور ستائی ہوئی تھی جیسا کہ ہنوز ہے۔ وہ قانون جو بیرحمی کے ساتھ بے شمار خلق خدا کو اچھوت،

ناپاک اور کثیف کا عنوان چسپاں کر کے ہمیشہ کے لیے ذلت اور افلاس کے گہرے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ اور جہاں آدمی، بقول اقبال، مثالِ دانہ تہِ سنگِ آسیا بوداست۔ آدمی کو دانے کی طرح پیسنے کے لیے ڈھائی ہزار سال سے منو کے قانون کی چکی صرف ہندوستان میں چل رہی ہے۔ ایسا ماحول روس کی رعایا دیکھ لیتی تو اپنے زمینداروں کے خلاف ساری بیزاری بھول جاتی بلکہ الٹا یہاں کے کمیونسٹوں سے لڑ پڑتی کہ تم خواہ مخواہ جھوٹ بولتے ہو۔ دنیا میں جاگیرداری نظام کے پیچھے کہیں کوئی خاص فلسفہ نہ تھا۔ منو کا قانون (سمرتی)، اور اونچ نیچ ذاتوں کی تقسیم کا نظام (ورن) ایک مذہبی عقیدے کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ روس کا کسان خواب ضرور دیکھ سکتا تھا کہ کبھی میں بھی زمیندار ہو گیا تو دشمنوں کی جوتوں سے خبر لونگا۔ منو کا قانون نیچ ذاتوں کو ذہنی طور سے مفلوج اور ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے۔ ایسے ماحول میں قدرتی طور سے زمیندار مظلوموں کے کچھ کام ہی آسکتا تھا۔ یہاں سماج اس قدر ظالم ہے کہ دوسروں کے لیے ظلم کی گنجائش نہیں چھوڑتا۔

واقعات گواہی دیں گے اور مثالیں واضح کر سکیں گی کہ گنگا جمنا کے درمیان مسلمان زمینداروں کا وجود کس حد تک برکت تھا یا کہاں تک مصیبت تھا۔ زمینداری ختم کر کے اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوا، بلکہ انسانی معاملات اور نازک اور تشویشناک ہو گئے ہیں۔ البتہ ہادی حسین کا زمانہ دوسرا تھا، اور ان کا مزاج بھی مہمانوں کی تواضع کے معاملہ میں عجیب واقع ہوا تھا۔ نوعِ آدم کے ساتھ مروت سے پیش آنا ان کے کردار کی نمایاں خوبی تھی۔ اپنے برابر والوں کی خاطر سب کرتے ہیں۔ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ کوئی ننگے پاؤں آ گیا تو بھی احترام اور اہتمام میں کوئی کمی نہ آنے دیتے تھے بلکہ ایسا سلوک کرتے تھے جیسے واقعی کوئی بڑی ہستی کا آدمی آ گیا۔ وہ خود دروازے پر جاکر آوازیں دیں تو عورتوں کو ہنسی آ جاتی تھی۔ سمجھ جاتی تھیں کہ کسی ایسے ہی چلتے پھرتے کی خاطر ملحوظ ہے جس کو خاص الخاص مہمان کہا جا رہا ہے۔ گنج باسودا میں بھی یہی معمول تھا، اور ان کے اخلاق کی دور تک شہرت ہو گئی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا

تھا کہ اسٹیشن پر ٹہلنے گئے، جو مسافر نظر آیا اس سے کہتے تھے کہ پاس ہی فقیر کا ایک جھونپڑا ہے اور وہ ساتھ آنے پر آمادہ ہو گیا تو خوشی کی حد نہ ہوتی تھی۔

ہمارے پڑوس میں ایک بوڑھا مالی رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا، بھیا" سب سے بڑی آواز توپ کی نہیں، توے کی ہوتی ہے، اور پھر ہادی حسین کی تواضع کے قصّے سنانے لگتا تھا۔

ہادی حسین کی آسودہ حالی اور کشادہ دستی کا دار و مدار نیل کے کاروبار پر تھا۔ مزروعہ آراضی کی آمدنا نوی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ایک نیل کی فیکٹری کے مالک تھے۔ نیل کی تیاری سے لے کر کلکتہ بھیج کر فروخت کرنے تک بہت سارے طولانی مرحلے تھے اور اس کام میں دن رات جان لگانی پڑتی تھی۔ بیشمار مزدور اور ماہر کاریگر نیل بنانے کے لیے ملازم رکھے جاتے تھے۔ ان سب کی دیکھ بھال کرنا اور کام لینا غیر معمولی تنظیمی صلاحیت چاہتا تھا۔ ہادی حسین طبیعت کے مستعد اور ہوشیار انسان تھے۔ ایسی خوش نصیبی کم لوگوں کے حصّے میں آتی ہے کہ وہ اپنے مسائل پر ہمیشہ مضبوط گرفت رکھیں اور کسی کام کو نا بو سے باہر نہ جانے دیں۔ قوت ارادی کا کمال اپنی جگہ، پھر بھی حالات کی تلخیوں سے محفوظ رہنا اور آخری دم تک عیش سے گزارنا ایک نادر اتفاق کی بات ہے، ہادی حسین کا تذکرہ جب بھی ہوا ہر ایک کی زبان سے یہی نکلا کہ عجیب تقدیر لے کر پیدا ہوئے تھے۔

عام دستور کے مطابق ہادی حسین کی شادی ماں باپ کے انتخاب سے جار چے میں ہوئی تھی (ہلال اصغر راوی ہیں) صدر الاسلام نے ان سے کہا، ہمارے خاندان کی خاتون تھیں، اپنی سگی پھوپھی بتلاتے تھے۔ مشرف حسین اضافہ کرتے ہیں کہ گوہر علی کی بیٹی بیبا آن یزدانی اور بیرسٹر علی اوسط وغیرہ کی بہن تھیں۔ اصل نام یاد نہیں رہا سب بانو کہتے تھے۔ ان کی ذات میں ایک نیک سیرت سیدانی کی ساری صفات موجود تھیں اور شیخ سعدی کی کی مشہور تعریف ان پر صادق آتی تھی، "زنِ خوب و فرمانبرد و پارسا" انھوں نے آخر دم تک محبت اور سلیقے سے شوہر کے ساتھ زندگی گزاری مگر کوئی اولاد نہ چھوڑی

ان کے بعد دو عورتیں، چنبیلی اور گلاب بائی ہادی حسین کی زندگی میں اور داخل ہوتی ہیں. اتفاق ایسا پیش آیا کہ اولاد ان دونوں سے بھی نہ ہوئی۔

ہادی حسین کا تعلق جس خاندان سے تھا وہ جھولس میں کشمیری خاندان کہلاتا ہے. لطف کی بات یہ ہے کہ کشمیریوں کا حسب نسب اکثر حملے کی زد میں آیا اور ان کے نسب کو مشکوک قرار دینے والے ہمیشہ موجود رہے ہے. اس کے صریحی اسباب تھے. دنیا میں دوسروں کو ترچھی نظر سے دیکھنے والے ہر جگہ مل جائیں گے. مگر مخالفت کا نشانہ بننے کے لیے نمایاں حیثیت پیدا کرنی پڑتی ہے. آدمی اپنے حریفوں کو ہر محاذ پر شکست دے اور ہر معاملے میں عاجز رکھے تب کہیں اس کے خلاف کچھ دلوں میں وہ احساس پیدا ہوتا ہے جسے عوام کی اصطلاح میں للّٰہی بغض کہتے ہیں. معترضین کی دلیل یہ ہے کہ کشمیری خاندان بعد میں آکر بسا۔ لہٰذا ہماری نسل سے تعلق نہیں ہو سکتا. واقعہ صحیح مگر جو نتیجہ اخذ کیا گیا اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے. جارچے کے بعض خاندانوں کی بابت بھی یہی کہا جاتا ہے کہ بعد میں آئے. اس سے سیادت مشکوک نہیں ہو جاتی۔

پہلی بیوی کی وفات ہوگئی تو ہادی حسین نے زنانے گھر میں آنا تقریباً چھوڑ دیا. معمول یہ تھا کہ ہفتہ بھر کے وقفے سے کسی دن صبح کے وقت کبریٰ بیگم کہہ کر لمبی سی آواز لگاتے تھے. کبریٰ بیگم نے جواب میں پکار لیا کہ آجاؤ بھائی، تب داخل ہوتے تھے. کبریٰ بیگم ان کی رشتے کی بہن تھیں اور برابر والے مکان میں اپنے بھائی غلام عباس کے ساتھ رہتی تھیں. جب تک ٹھہرے کبریٰ بیگم پاس بیٹھی رہیں اور جو کچھ کہنا سننا ہوا ان کے ذریعہ ترجمانی ہوگئی. البتہ اگر کبھی بہنوں کا آنا ہو گیا تو ہادی حسین کبھی پابندی سے گھر میں آتے تھے۔ پھر بھی ان کا کھانا باہر ہی جاتا تھا. یہ معمول ایک مجبوری کا نتیجہ تھا. ہوا یہ کہ ان کے دونوں بھائی عین جوانی میں وفات پا گئے اور گھر میں بھائیوں کی بیویاں رہ گئیں. تصویر حسین کی واحد اولاد مہر بانو اور محمد رضا کی یادگار علی ہادی، دونوں بچوں کی پرورش ہادی حسین کے زیر سایہ ہوئی۔

چنبیلی اور گلاب، دونوں نے مل کر ہادی حسین کی زندگی کو سدا بہار بنائے رکھا.

وہ دونوں ایثار، فرماں برداری، اور فداکاری میں ایک دوسرے کا زندہ جواب تھیں. عورت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مرد کی منشا کو آسمانی حکم سے کم نہ سمجھے. اس کی مرضی کے آگے اپنی ہر آرزو کو بھول جائے. اپنی ہستی کو مٹانے اور قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہے. یہ خوبیاں بیکار نہیں جاتیں. ان کی بدولت اس کی ذات میں دلفریبی آتی ہے. صنف نازک کا اصلی جوہر یہی ہے. اور اس کے معنوی حسن کا راز ان ہی صفات میں پوشیدہ ہے. مرد کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے جو تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتی، کہ اتنی بڑی دنیا میں محبت سے لبریز ایک دل کہیں مل جائے اور وہ عورت کا دل ہو. اتفاقیہ طور سے کسی کو ایک کی جگہ دو عدد دھڑکتے ہوئے دل ہاتھ آجائیں تو زمانہ اس کی قسمت پر رشک کرتا ہے.

آدمی کی گرہ میں تھوڑی سی بھی عقل سلیم ہو، جسے شئی لطیف کہتے ہیں تو حیاتِ مستعار کے چار دن عیش سے گزار لینا کونسی مشکل بات ہے. خواہ مخواہ لوگ ڈرتے ہیں کہ جینا بہت نازک فن ہے. ہادی حسین نے چنبیلی اور گلاب کو مسلسل ساتھ رہنے کا موقعہ کم ہی دیا ہوگا. عموماً چنبیلی چھولس میں اور گلاب بائی گنج باسودا میں رہتی تھیں. یہ جگہ سابق ریاست گوالیار سے متعلق تھی اور ہنوز ضلع بھیلسہ میں بھوپال کے نزدیک واقع ہے. مغلوں کے زمانے تک بندھیاچل کے دونوں طرف کا وسیع علاقہ مالوہ کہلاتا تھا اور سلطنت کا اہم صوبہ تھا. مسلمان مورخین نے مالوے کے صوبے کو دکن کا دروازہ بھی کہا ہے. اصل میں ہادی حسین کی جیب میں نیل کی تجارت سے حاصل شدہ معقول رقم تھی. وہ اس کو مناسب مد میں محفوظ کرنے کی خاطر دادری کے پاس ایک گاؤں خریدنا چاہتے تھے اور ساری بات طے ہوگئی تھی. فی الحال دادری ہمارے گاؤں کی تحصیل ہے اور وہاں سے دہلی تک صنعتی علاقہ پھیلتا جا رہا ہے. بیعنامہ ہونے کو آیا تو کسی دوست نے مشورہ دیا کہ گاؤں آبی نہیں خاکی ہے اور زمین بھی زیادہ زرخیز نظر نہیں آتی. اتنی بڑی رقم کیوں پھینکتے ہو. گوالیار ریاست میں تھوڑے سے دام جمع کرنے پڑتے ہیں. اس رقم کا نصف جمع کیجیے، وہاں چک مل رہے ہیں جن کا

رقبہ بعض اوقات سالم دیہات سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ ہادی حسین نے گوالیار جاکر رقم جمع کی اور باسودا کا چک خرید لیا گنج ان کی زمین پر قائم ہوا۔ وہاں پہلے ریلوے اسٹیشن سے قصبے کی مختصر آبادی تک ویران اور سپاٹ میدان تھا۔ منڈی بن جانے کے بعد سابق مقام (باسودا) کا نام گنج باسودا ہو گیا۔ نزدیک میں ضامن علی نام کے ایک شیعہ زمیندار کا چک تھا جو کہیں اودھ کی طرف کے رہنے والے تھے۔ ان کی کوشش بھی معاون ثابت ہوئی۔ ضامن علی ریاست کے باا ثر لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ مشہور تھا کہ ایک دفعہ انھوں نے مہاراجہ گوالیار کی شاندار ضیافت کی اور مہاراجہ ایک شب ان کے چک پر ٹھہرے تھے۔ ہادی حسین کا معمول یہ تھا کہ مہینہ دو مہینہ باسودا اور پھر مہینہ دو مہینہ چھوس میں رہنے لگے۔ باسودا کے معاملات نے زیادہ لمبے قیام پر مجبور کیا اور وہاں کی مشغولیات میں بتدریج اضافہ ہونے لگا تو انھوں نے چھوس کی زمینداری کا مختار نامہ اپنے سمدھی، یعنی اپنی بھتیجی مہربانو کے شوہر ڈاکٹر زمرد حسین کے باپ، عابد حسین کے نام لکھ دیا۔ ہادی حسین کی غیر موجودگی میں چھوس کا انتظام مختار عام کی حیثیت سے عابد حسین سنبھالتے تھے۔

گلاب بائی کی زندگی باسودا میں محض پھولوں کی سیج یا عیش کی بہتی گنگا نہ تھی۔ عورت کے لیے اپنے گھر میں معمولاً پندرہ بیس نفر ملازموں کی فوج سے متفرق کام لینا خصوصاً جبکہ شوہر کبھی موجود ہے کبھی نہیں ہے خاصا بڑا دردسر ہوتا ہے۔ آدمیوں کو برتنے کے لیے، وہ کسی بھی زمرے اور درجے کے ہوں، غیر معمولی ہوشیاری اور صبر چاہیے۔ معاملہ فہمی اور مردم شناسی میں ذرا سی غفلت ہوئی اور نوکروں کا فتنہ یقین جانیے کہ قابو سے باہر نکلا۔ وہ جو کہتے ہیں ٹھنڈے گرم مزاج کا کراماتی نسخہ، تو اس کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ گلاب بائی کی بابت مشہور تھا کہ سارے نوکروں کو ٹھیک رکھتی ہیں اور ان کے سامنے کوئی ذرا سی کاہلی یا بہانہ بازی نہیں کر سکتا۔ وہ بیشتر سال میں ایک مرتبہ چھوس آتی تھیں۔ میری دادی اور ماں نے ہمیشہ ان کا ذکر خیر تعریفوں کے ساتھ کیا۔ مگر میری خالہ نذیر بانو کی یادیں زیادہ دلچسپ تھیں۔

وہ سناتی تھیں، مجھے گلاب بائی کا فقط ایک دفعہ کا آنا یاد ہے۔ میں چھوٹی تھی انھوں نے مجھے گود میں لے کر پوچھا، بتاؤ میں کون ہوں۔ میں نے یوں ہی کہدیا، گلاب' میری ماں نے جھڑکا، ممانی کہو۔ مجھے شرارت سوجھی اور کئی دفعہ کبھی آہستہ اور کبھی بلند آواز میں گلاب کہا۔ وہ قہقہے لگاتی رہیں اور مجھے خوب پیار کیا۔ آخرانھوں نے میری ماں سے کہا' اسے مجھے دیدو، میں گھبرائی' اور جب میری ماں بولیں، شوق سے لے جاؤ، تو میں ساری شرارت بھول گئی۔

چنبیلی چھوس میں گھر اور باہر سارے کاموں کی، کہنا چاہیے کہ مدارالمہام تھیں۔ ہادی حسین کو ان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ وہ نگاہ دیکھ کر دل کا راز پڑھنا اور مطلب سمجھنا جانتی تھیں۔ فارسی کا محاورہ 'از دل ریزد بر دل خیزد' انسانی تعلقات کی خصوصی نزاکت کا انکشاف کرتا ہے۔ چنبیلی کی ذات میں واقعی یہ کمال موجود تھا وہ پردہ نہ کرتی تھیں اور ہر ایک کی ان تک رسائی تھی۔ ان کا پس منظر بھی بہت اعلیٰ نہ تھا۔ مگر دوسروں کے ساتھ خاموشی سے سلوک کرنے کی عادت تھی۔ اس لیے سب ان کا احترام کرتے تھے۔ متفرق اخراجات ان کی مٹھی میں رہتے تھے مگر کسی نے ان کو ہادی حسین سے حساب کتاب کی باتیں کرتے کبھی نہ دیکھا۔ چنبیلی کی انتظامی قابلیت کا برجستہ ثبوت یہ تھا کہ وہ کھانے کے اوقات سے ذرا پہلے چوپال میں آکر ایک نظر ڈالتی تھیں اور آناً فاناً اندر سے کھانا آجاتا تھا۔ لوگ ہنستے تھے کہ چنبیلی نے ضرور جنات کو قابو میں کر رکھا ہے۔ اصلی بات یہ تھی کہ وہ مستعد اور ماہر کام کرنے والوں کو ضروری جنس سمیت پہلے سے آمادہ رکھتی تھیں۔ جس قدر مجمع دیکھا، جیسے بھی مقامی و بیرونی، "آئندہ و رونده" بیٹھے نظر آئے، سب کے بقدر ویسا ہی کھانا تیار کرا کے بلاتاخیر بھیج دیا۔ چنبیلی کے اس حسن عمل کا مظاہرہ روز ہوتا تھا۔ ہادی حسین کی شہرت اور عزت کو بڑھانے میں چنبیلی کا خاص ہاتھ تھا۔ مغربی زبانوں کا مقولہ ہے کہ مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔ بعض بزرگوں نے اس محاورے کو الٹ کر ایسا بھونڈا کر دیا اور ایسا مروڑا ہے کہ شریف

آدمی سن لے تو سر پیٹ لے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر مرد کی کُٹیا ڈبونے میں ایک عورت کے کرتب کا دخل ضرور ہوتا ہے۔

میری دادی، صغرا بیگم اکثر سناتی تھیں کہ تیرا باپ خوب بڑا ہو گیا تب سمجھا کہ میں اس کی ماں ہوں، ورنہ چنبیلی کو ہی اپنی ماں سمجھتا تھا اور وہی اس کو اپنے پاس رکھتی تھی۔ ہادی حسین کے سب سے کم عمر مصاحب جو بعد میں بہت دنوں تک زندہ رہے، اور میرے باپ نے ان کی دیکھ بھال اپنے ذمہ رکھی، ولایت حسین نام کے ایک بزرگ تھے ان کی زندہ دلی کی حرکتیں اکثر اوقات بڑھاپے میں بھی صریحاً قابلِ اعتراض اور حد سے زیادہ ہو جاتی تھیں۔ بستی میں کہیں چوری ہو جائے وہ کہتے پھرتے تھے، خدا کی سوں، میں نے ہی یہ چوری کی ہے۔ اصلی چور ہنس کر پوچھتے تھے، ہاں چچا، پوری بات بتاؤ، اور چچا ولایت خیالی داستان تصنیف کر کے فی البدیہہ سنا دیتے تھے، سنجیدہ لوگوں نے اعتراض کیا، تو کہتے تھے، مجبوری ہے، اس سے بازار کے بنیے پچھلے اُدھار کا تقاضہ بھول جاتے ہیں اور نیا ادھار ملنے لگتا ہے۔ ولایت حسین کو چنبیلی کی مہربانی اور لوگوں پر احسانات کے بہت سے قصے یاد تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ میرا لڑکپن تھا۔ میں کھانا تو دسترخوان پر سب کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیتا تھا۔ پان اور حقے کی طرف بڑے آدمیوں کے سامنے ہاتھ بڑھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ حقے کا بدل آسان تھا۔ باہر جا کر بیڑی کے دو گھونٹ اڑا لیے، مگر پان کا کیا علاج ہو۔ چنبیلی کو میری کمزوری کا علم ہو گیا۔ وہ ایک پان مٹھی میں دبائے رکھتی تھیں اور اشارے سے مجھے بلا کر دے جاتی تھیں۔ چنبیلی جب تک زندہ تھیں، میں نے بالکل نہ جانا محتاجی کیا چیز ہوتی ہے یہ کہہ کر ولایت حسین غمگین ہو جاتے تھے۔ البتہ گلاب بائی کا ذکر خیر کبھی آیا تو وہ قطعی خاموش رہتے تھے۔ بات یہ تھی کہ ہادی حسین کے لواحقین کو باری باری گنج باسودا جا کر رہنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ ولایت حسین کی نوبت آئی تو ان کو با دل نخواستہ جانا پڑا۔ وہاں ان کا جی نہ لگا۔ جب نہ رہا گیا تو ایک دن اپنی ہنر مندی دکھانے

پر مجبور ہو گئے۔ گلاب بائی کے کمرے میں جہاں کسی کو اجازت نہ تھی چپکے سے داخل ہوئے۔ ان کے تکیئے کے نیچے سے بقدر سفر خرچ رقم نکالی، ایک بڑی گھڑی (ٹائم پیس) پسند آگئی، وہ اٹھائی اور ٹرین میں سوار ہو کر دہلی کا راستہ پکڑا جہاں جارج چھولس کے بیشتر لوگوں کا مجمع رہتا تھا۔ ہادی حسین نے اور بعد میں میرے باپ نے دوبارہ ولایت حسین سے گنج باسودا جانے کو نہ کہا۔ کبھی اس قسم کا اشارہ بھی ہوا تو وہ عاجزی سے کہتے تھے، خدا کی سون، مجھے یہیں کے کام بہت ہیں، وہاں کسی اور کو بھیج دو۔

ہادی حسین کی زندگی کا آغاز ہوا تو غدر کا انقلاب گزر چکا تھا، پھر بھی پرانی دنیا کی جھلک باقی تھی۔ دیہات پر نہ تو صنعتی تبدیلی کا سایہ پڑا تھا اور نہ بنگالی رینا سانس کا تحفہ نیشنلزم، وہاں تک پہنچا تھا، جو اپنی بقا کے لیے کسی دوسری چیز کو شدید نفرت کا نشانہ بنائے رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ دیہاتیوں کی زندگی میں سادگی تھی، ان کے دل بیزاری اور بد خواہی سے پاک تھے، اور اپنے زمیندار کا احترام ان کی قدیم روایات میں شامل تھا۔ بلکہ وہ زمیندار کو ایک مثالی انسان سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے پاس جب تک حکومت رہی ان کے دیہات میں شمشیر زنی اور دیگر فنونِ حرب کی تربیت کا قاعدہ عام تھا۔ یہ مدرسے فوج کو سپاہی مہیا کرتے تھے۔ چھولس میں بھی بیسویں صدی کی ابتدا تک یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ وہاں کا ہر سید گدکے بازی جانتا تھا۔ بوڑھے استاد اس فن کے ذریعے جوانوں کو تلوار کے ہاتھ اور پینترے کی باریکیاں سکھاتے تھے۔ سیدوں کے سارے بچوں کے لیے پٹا کھیلنا لازمی شوق کی چیز تھی، جہاں کسی کا پینترا غلط ہوا، حریف کے گدکوں کی مار پڑی اور پٹ کر بیٹھ گیا۔ سانس درست ہوتے ہی پھر گدکا ہاتھ میں سنبھالا اور سامنے آگیا۔ یہ تقریباً روزانہ کی مشق تھی۔ عام مظاہروں کے دن مقرر تھے۔ عید بقر عید اور ہندوؤں کے ایک برساتی تہوار کے علاوہ دادا کا عرس گدکے بازی کا خاص دن تھا جس کا انتظار رہتا تھا اور پہلے سے تیاریاں ہوتی تھیں

پٹا کے موقعے پر ڈھول بجانے کی علیحدہ تال تھی۔ گاؤں کے تین چار بھنگی اپنے کو تال کا ماہر سمجھتے تھے۔ اصل میں بحر مضارع کے زحافات کی تال تھی، مفاعیل فاعلات مفاعیل فاعلات۔ اس تال پر پٹا باز پینترا بدلتے تھے۔ تبدریج پینترے میں ماہر رقاص کی پھرتی کا سا احساس ہونے لگتا تھا اور گدکوں کی زدو خورد تال کی آواز میں ڈوب جاتی تھی۔ ہادی حسین کا شمار بھی گدکے بازی کے استادوں میں ہوتا تھا، وہ لمبے قد کے پتلے دُبلے آدمی تھے اور ایسی عجیب پھرتی یاد تھی کہ وار کرتے وقت ان کی اونچی زقند سے مقابل حریف کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ اس لیے مشہور تھا کہ ان کے وار کی روک آسان نہیں ہے۔ عموماً ہر استاد گدکا ہاتھ میں لیتے وقت ادب سے یا علیؑ کہتا تھا، بانکپن کے ساتھ ترچھا کھڑا ہوتا تھا اور سلامی سے پہلے لوگ اس کے سر پر سے پیسے نثار کرتے تھے۔ ہادی حسین کا کھڑا ہونا گویا کہ ایک تقریب تھی۔ ہجوم کا ہر آدمی ان کے سر پر پیسہ تصدق کرنے کے لیے دوڑتا تھا اور بھنگی کی چادر پر پیسوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ پھر کئی دن تک ہادی حسین کے پینترے کی صفائی، پھکیتی کے ہاتھ، اور مارنے بچانے کے کمال پر تبصرے رہتے تھے۔ اصل بات یہ کہ پٹا غیر معمولی دلچسپی کا کھیل تھا، کوئی دوسری مردانہ ورزش اس کا بدل تھی تو وہ گھوڑے کی سواری کو سمجھنا چاہیے۔ سواری کا شوق بھی لازمۂ امارت تھا۔ اور کسی زمیندار کا اصطبل خالی ہونا سخت منحوسیت کی بات تصور ہوتی تھی۔ ہندوستان کی سرزمین اور یہاں کے مسائل نے مسلمانوں پر خصوصاً ان کے ذمہ دار طبقے پر، روشن کر دیا تھا کہ اپنی ذات میں سیف و قلم دونوں صفات جمع رکھیں تب ہی خیریت ہے۔ قدیم روایت کے مطابق مسلمانوں کے معاشرے میں اہل سیف اور اہل سعادت دو علیحدہ طبقے تصور ہوتے تھے، لیکن برِّصغیر میں صورت مختلف تھی۔ دیہات میں سکونت رکھنے والے شرفا اس نکتے کی اہمیت اور ضرورت کو زیادہ اچھی طرح سمجھتے تھے عہد سابق کے مانوس فنون حرب کی مہارت اور فارسی ادب کے شاہ کاروں کا شوق

ہندوستان کے دیہاتی رئیسوں کی تصویر کے دو لازمی رنگ تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض عالمی نوعیت کی دلچسپیاں تھیں جن کو صدیوں تک مشرق و مغرب میں ساری دنیا کے طبقۂ اشراف نے اپنی مشترکہ میراث سمجھا ہے۔ یورپ میں نپولین کا زمانہ شروع ہوا تو بندوقوں اور توپوں کا استعمال طریقہ جنگ میں مکمل انقلاب پیدا کر چکا تھا۔ اس کے باوجود ہر شہر میں شمشیر زنی سکھانے کے کلب موجود تھے اور وہاں نوجوان شریف زادوں کی تربیت میں شمشیر بازی کی مہارت ضروری عنصر تھی۔

ہادی حسین کا آخری وقت آیا اور عمر پچھتر سے متجاوز ہو گئی (۱۹۱۹ عیسوی) تو ان کا تنہا وارث سترہ سال کا ایک بھتیجا تھا۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اتنی کم عمر میں دو جگہ کی زمینداری پر کون مضبوط گرفت رکھ سکتا ہے۔ صورت روشن تھی کہ نہ زمینداری کے معاملات قابو میں رہ پائیں گے اور نہ گھر کی وہ رونق رہے گی جو ان کے دم سے قائم تھی اور وہ چھوڑ کر جا رہے تھے۔ معاشرے کی سب سے چھوٹی اکائی خاندان، اور سب سے بڑی اکائی ملک، افراد ہی دونوں کو سنبھالتے ہیں۔ روم کی عظیم سلطنت کے زوال کا ناگزیر سبب طبقۂ امراء کے گھروں میں اولاد کی کمی کو تصور کیا جاتا ہے یعنی وہ بچے پیدا ہی نہ ہوئے جو تین براعظموں میں پھیلی ہوئی زبردست رومن ایمپائر کا انتظام چلاتے اور اس کے حدود کی حفاظت کرتے۔ بزرگ تجربے کی بات کہہ گئے ہیں کہ جہانِ ہست و بود کا سارا طنطنہ آدمی کے وجود سے ہے، خاندان ہوں یا سلطنتیں قاعدہ کلیہ دونوں پر یکساں صادق آتا ہے۔

●

## قاضی شوکت حسین

قاضی شوکت حسین چھوس میں سب سے پہلے اور سب سے آخری قاضی تھے نہ ان سے پہلے کسی کو قضا کا عہدہ ملا اور نہ ان کے بعد کوئی قاضی ہوا۔ یہ بات بالکل

درست کہ قاضی فقط شہروں میں ہوتے تھے اور چھولس فقط ایک گاؤں تھا۔ مگر چھولس میں سیدوں کی مختصر سی آبادی کا نقشہ قاضی شوکت حسین کو یاد کیے بغیر واضح نہ ہو پائے گا اور وہاں کی تاریخ بھی بے معنی نہیں تو ہلکی اور ادھوری یقیناً رہ جائے گی۔ قاضی جی کی چھولس پر حکومت تھی۔ ویسے تو شاید دو بیگھہ زمین بھی ان کے پاس نہ تھی۔ ان کے دونوں پاؤں پیدائشی طور سے ناقص تھے اور وہ چھڑی کے سہارے بڑی مشکل سے چلتے تھے۔ مگر عجیب طلساتی مزاج پایا تھا۔ سارے سید ان سے ایسے ہی دبتے تھے جیسے گاؤں کی ساری رعایا سیدوں سے دبتی تھی کہا تو یہ جاتا تھا کہ ہادی حسین زیادہ پابندی سے ان کی ناز برداری کرتے ہیں، اصل بات یہ تھی کہ دوسرے باحیثیت سیدوں کی طرف سے بھی ان کو برابر دست غیب پہنچا رہتا تھا، اس لیے کہ مسائل کے حلّ و فصل میں سب کو قاضی جی کی ضرورت رہتی تھی، یہ ان کی کفالت کا سلسلہ تھا۔

قاضی جی فطرتاً خوش مزاج آدمی واقع نہ ہوئے تھے، لیکن ان کی بدمزاجی سب کو خوش رکھتی تھی۔ ان کا پارہ چڑھا اور ہر ایک کی بیاختہ ہنسی چھوٹی۔ ان کو بستی اور برادری میں پیش آنے والی خلاف قاعدہ باتیں اچھی نہ لگتی تھیں اور بہت جلد ان کی زبان پر ایسے کلمات آجاتے تھے جو آج کل کی سیاسی اصطلاح میں کہلاتے تو ہیں غیر پارلیمنٹری، لیکن دنیا کی ہر پارلیمنٹ میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔۔ لغت کے وہی پرانے الفاظ، مگر وہ اس ترکیب سے جوڑ بٹھاتے کہ سننے والوں کو حیرت ہوتی تھی اور ماننا پڑتا تھا کہ قاضی جی نے بالکل نئی بات کہہ دی۔ معمولی آدمی اس قسم کی صرف و نحو منہ سے نکالے تو واہیات، اور قاضی جی کہیں تو سب کی طبیعت بشاش ہو جاتی تھی۔ ان کا ہر قول فرحت بخش ہوتا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ کوئی فرانسیسی اخبار نویس پیریس کی پارلیمنٹ میں گھس گیا اور ذرا سی دیر میں فحش گالیوں کی فہرست تیار کر کے ہنستا ہوا باہر نکلا۔ خاص وہی فہرست تو قاضی شوکت حسین کے ہاتھ نہ لگی ہوگی، یہ بات امکان سے بعید معلوم ہوتی ہے البتہ اس سے ملتی جلتی کم و بیش

نوعیت کی چیز ان کے پاس ضرور موجود تھی جس کو وہ حسب موقعہ برتنا جانتے تھے.

قاضی جی برادری کی ناگزیر ضرورت تھے. سب کو ان کی ذات کی برکت کا احساس تھا اور اہل بستی ایک زبان ہوکر اعتراف کرتے تھے کہ ان کا دم بہت غنیمت ہے. کوئی بیمار ہو وہ روز عیادت کو جائیں گے خدانخواستہ کسی گھر میں موت ہو جائے وہ سب سے پہلے پہنچیں گے اور کفن دفن کی ساری دیکھ بھال وہ خود کریں گے. دوسرے آنا جانا رکھیں، چپکے سے کھسک جائیں، قاضی جی سوئم تک بیشتر وقت وہیں گزاریں گے اور سوگ کا تقاضا پورا کریں گے. ایسے ہی انہماک کے ساتھ وہ برادری کے افراد کی خوشیوں میں شریک رہتے تھے. بیاہ شادی کا سارا انتظام قاضی جی کے ہاتھ سے انجام پاتا تھا. صاحب معاملہ دخل نہ دے گا، وہ جو چاہیں کریں، وہی صاحب معاملہ ہیں بہرحال ایک بات میں سب سے اختلاف تھا. چھوٹس کی شادیوں میں طوائف کا مجرا ضرور ہوتا تھا۔ اور یہ رسم خاتمہ زمینداری تک جاری رہی. قاضی جی کو ناچ گانے کے نام سے چڑھ تھی اور جب تک طوائف اور نقالوں کی محفل رہتی تھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ وہ کوئی خاص مذہبی آدمی نہ تھے، بس یہ ان کی ایک ادا تھی۔

شیعوں کی قصباتی تہذیب میں مجلس عزا کو نمایاں درجہ حاصل ہے. قاضی جی کا خداداد جوہر امام باڑے میں پہنچ کر کھلتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے کے باوجود معاملہ فہمی میں جواب نہ رکھتے تھے. ان کے ذہن میں یہ حقیقت خود بخود بغیر کسی کے بتائے بیٹھ گئی تھی کہ مجالس عزا کو افراط و تفریط سے بچا کر رکھنا ہے اور اس مقدس رسم کی سنجیدگی، پاکیزگی اور برگزیدگی میں فرق واقع نہ ہونا چاہیے. دیوار سے تکیہ لگا کر منبر سے دور بیٹھنا جسمانی مجبوری تھی مگر وہ پوری مجلس پر نظر رکھتے تھے بزرگوں کے تیور دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ ذاکر سے ادائیگی اور بیان میں غلطی سرزد ہوگئی، اور زور سے ٹوک دینے میں تکلف نہ ہوتا تھا. انیس و دبیر کے لکھنؤ میں سنتے ہیں کہ ایک میر بکائی ہوا کرتے تھے. ان پر خدا کی رحمت ہو عجیب روایت چھوڑ

گئے ہیں۔ آج تک ہر بستی میں ان کی روح پہنچ کر اپنا خلیفہ تلاش کرلیتی ہے۔ وہ نہ ہوں تو مجلس میں گریہ وبکا ٹھیک سے نہ ہو، مجلس کی ساری رونق کا دارومدار ان کی ذات پر ہوتا ہے۔ قاضی جی کے زمانے میں بابو بدھنا صاحب ایک بزرگ تھے عباس حسین نام تھا۔ ذاکر منبر پر بیٹھا اور انھوں نے دہاڑیں مار کر رونا شروع کردیا۔ چاند بالکل صاف تھی ایک بال نہ رہ گیا تھا۔ ٹوپی اتار کر ایسے زور سے سر پیٹتے تھے کہ امامباڑہ گونجنے لگتا تھا۔ اس وقت جلوس میں مومنین کی ایسی زیادہ تعداد کہاں تھی۔ آدھے لوگ ذاکر کو سننے سے محروم رہ جاتے تھے۔ آخر قاضی جی نے شکایت کی سماعت فرمائی اور معاملہ ٹھیک کردیا۔ سارے مجمع کی شہادت کے مطابق، ان کے حکم کا خلاصہ یہ تھا: مردوا کے، سن لے، میں تجھے رونے سے نہیں روکتا، لیکن ٹوپی ہرگز نہ اتارنے دوں گا۔ خبردار، تونے ٹوپی اتاری، اور دیکھ میں نے چھڑی رسید کی، سر پھوڑ دوں گا کیا مجلس میں طوفان مچاتا ہے۔ تیرے باپ نے بلاوا دلوایا تھا، یہ نہیں دیکھتا اور بھی سامعین بیٹھے ہیں۔ غرض کہ قاضی جی کا ایسا ہی بے دھڑک انداز اس وقت ہوتا تھا جب وہ محسوس کرتے تھے کہ ذاکر مجلس کو طول دے رہا ہے ان کا جملہ مشہور تھا کہ بابا، روٹیاں سوکھ کر لکڑ ہو جائیں گی، جلدی نیچے کو اتر۔ اور اس قول فیصل پر مجلس ختم ہو جاتی تھی۔ تبرک تقسیم کرنا قاضی جی کے ذمہ تھا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، ان کے پاؤں ناقص تھے اور کھڑے رہنے میں زحمت ہوتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ تبرک جلدی بانٹ کر ختم کریں۔ چاروں طرف بچوں کا ہجوم اور شریر لڑکوں کا دوسری دفعہ ہاتھ بڑھانا تاخیر اور زحمت کا باعث ہوتا تھا۔ قاضی جی کے قبضے میں شاید کوئی جن تھا جو بتا دیتا تھا۔ جہاں لڑکوں نے پریشان کرنے کے لیے دوبارہ ہاتھ لمبا کیا، ان کو پتہ چل گیا، تقسیم رک گئی، دنیا خوشامد کرے، اور شریر لڑکوں کی اصل نسل، والدین کی شرافت اور ورود مسعود کے اوقات وحالات پر تقریر ہونے لگی۔ لڑکے جوان بختوں کو بالکل نہ جانتے تھے، ایسے شرماتے تھے کہ دوبارہ تبرک مانگنے سے کان پکڑ لیتے تھے۔

# میر ابوالحسن

میر ابوالحسن اپنے زمانے میں پھوس کے سب سے بڑے زمیندار شمار ہوتے تھے مگر ضرور کوئی وجہ رہی ہوگی کہ انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی ایک پکا ارادہ کرلیا تھا جس پر آخر دم تک قائم رہے، یعنی بیگھوں کی تعداد بے تحاشہ ہوا کرے، وہ اپنی زمینداری سے قطعی کوئی فائدہ نہ اٹھائیں گے۔ آدمی سو فی صدی معقول تھے اور عقل سلیم کی بالکل بھی کمی نہ تھی۔ ایسی صورت میں گذر بسر کے دو طریقے سامنے نظر آئے۔ یا تو نوکری کرنا پڑے گی ورنہ درویشی اختیار کریں گے۔ میر ابوالحسن وقتاً فوقتاً نوکری اور درویشی دونوں کا تجربہ خوشی سے کرتے رہے۔ نوکری سے جی بھر گیا۔ تو پھوس آکر درویشانہ انداز سے رہنے سہنے لگے۔ اتفاقاً درویشی نے کوئی جھمیلا کھڑا کیا تو پھوس سے باہر جاکر چپکے سے نوکری کرلی۔ اس معمول میں لمبے عرصے تک کوئی فرق نہ آیا۔

ایک اعتبار سے میر ابوالحسن کو یادگار شخصیت کہنا چاہیے۔ وہ مسلمانوں کی پہلی نسل سے تعلق رکھتے تھے جس نے غدر کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ کالج قائم بھی نہ ہوا تھا۔ (بولا یہ ملہم غیب اٹھارہ سے پچھتر۔ ۱۸۷۵ء) جب وہ تعلیمی مرحلوں سے فارغ ہو چکے تھے۔ ان کے باپ، ذاکر حسین، ہندوستان پر ملکہ معظمہ کی حکومت کا باقاعدہ اعلان ہونے سے قبل ہی کمپنی بہادر کے ملازم ہو گئے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب شہروں میں منادی کے بول دنیا اس طرح سنتی تھی، خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔ برادری کے بزرگوں میں مشہور تھا کہ پولس کے محکمے میں افسر تھے۔ ذاکر حسین کی ہوشیاری کا ثبوت اس بات سے واضح ہے کہ انھوں نے انگریزی کی افادیت کو سمجھ لیا، عام تعصبات کی پروا نہ کی، اور بیٹے کو پرانے نصاب سے ہٹا کر نئی تعلیم کی طرف لے گئے۔ غالباً ان کی نوکری کا سلسلہ کہیں

کلکتے کی طرف تھا، اس لیے کہ نوکری کا عرصہ گزار کر سبک دوشی حاصل کی تو آسام میں لکڑی کی تجارت کرنے لگے اور بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ خوب دولت کمائی۔ جار چہ پھوس کے لوگوں میں پہلے تو کیا بعد میں بھی یہ رواج جڑ نہ پکڑ سکا کہ اولاد کی تعلیم پر خاص توجہ دیں اور ہر وقت اسی خیال میں دبلے رہیں۔ یہ دردسر آج کل کے شہروں میں رہنے والے درمیانی طبقے نے اپنی جان کے لیے ایجاد کیا ہے پرانا قاعدہ یہ تھا کہ بچہ کچھ پڑھا لکھا کچھ کھیلا کودا، جس قدر مدرسے گیا اس سے زیادہ جنگلوں میں بھاگ دوڑ مچائی۔ مولوی صاحب نے زیادہ مارا پیٹا تو پلنگ پر گاؤ تکیہ لمبا رکھ کر چادر اوپر سے ڈھکی اور ان کی نماز جنازہ پڑھ دی۔ ہادی حسین کے ایک مصاحب، محمد درزی، سناتے تھے کہ ہمارے میاں نے بچپن میں لڑکوں کی صف کھڑی کر کے یہی حرکت کی تھی۔ بہر حال جب لڑکا ہاتھ پاؤں کا مضبوط ہو گیا تو جائیداد کے انتظام میں لگ جائے، زمین نہیں ہے یا تھوڑی سی ہے تو باہر نکل کر چھوٹی موٹی نوکری پکڑو ترقی آہستہ آہستہ ہوتی رہے گی۔ یا نہ ہوگی، کوئی بات نہیں۔۔ ذاکر حسین کا مزاج تمام اہل برادری سے مختلف تھا۔ وہ یقیناً آج کل کے درمیانی طبقے کی شہری خلقت سے زیادہ قریب تھے۔ وقت سے آگے قدم بڑھا کر چلنے والے دو چار ہی سہی، ہر زمانے میں مل جاتے ہیں۔

ذاکر حسین کے ارادے بیٹے کی تعلیم کے معاملے میں کافی بلند تھے مگر ابوالحسن گریجویشن کے مرحلے تک نہ پہنچ سکے۔ بس اتنا تھا کہ انگریزی بہت اچھی طرح لکھنا اور بولنا جانتے تھے، یہ ثبوت نہیں ملتا کہ گریجویٹ تھے۔ جدید مغربی تعلیم غدر سے چوتھائی صدی بعد تک خاص طبقے کی چیز تھی۔ ویسے تو ہندو کالج کلکتہ کا سال تاسیس ۱۸۱۷ عیسوی ہے۔ اس کا فیض اعلیٰ ذات کے ہندو بنگالیوں تک محدود تھا میکالے کی تعلیمی رپورٹ پیش ہوتے وقت (۱۸۳۷ عیسوی) کیفیت یہ تھی کہ مسلمان جدید تعلیمی پروگرام کے شدید مخالف تھے اور ان کی پریشانی بیجا نہ تھی۔ فارسی سرکاری دفتروں سے بر طرف کی جا رہی تھی۔ بنگالی ہندو ضرور معاملہ سمجھ گئے تھے لیکن باقی ہندؤں

کے دل میں ذرا سا تذبذب تھا۔ حد یہ کہ بہت سے انگریز بھی حمایت نہ کرتے تھے۔ انگریزوں کی دلیل یہ تھی کہ مغربی افکار کو پڑھ کر ہندوستانی ہمارے سکھائے ہوئے حربے بلا تامل ہمارے ہی خلاف استعمال کریں گے، پھر یہ سلطنت کتنے دن چل پائے گی۔ مباحثے کی گرما گرمی نے انگریز حاکموں کے لیے سخت تشویش کھڑی کردی تھی۔ میکالے کو اعتراف تھا کہ ایسا تو ہوگا۔ انگریز فلسفی ہیوم کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ ستر برس گاڑی چل جائے تو بہت سمجھیے۔ میکالے کا اندازہ کم و بیش ایک صدی کا تھا۔ برطانوی سلطنت کی عمر جانچنے میں اس سے صرف دس سال کی چوک ہوئی۔ غدر سے آزادی تک (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۴۷ء) نوّے برس کا حساب ہوتا ہے۔ جدید تعلیم سے صریحاً ہندوستانیوں کی مراد دنیاوی ترقی تھی۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ انگریزی تعلیم خوشحالی اور عزت کی کلید تھی۔ انگریزوں کا مفاد بالکل دوسرا تھا۔ وہ کسی ہندوستانی کو سیدھا، شریف اور ایماندار آدمی پاتے تھے تو اپنے پاس سے کہیں نہ جانے دیتے تھے اور یہ ہرگز نہ کرتے تھے کہ خوش ہوکر مناسب قسم کا سرکاری عہدہ تفویض کردیں۔ بلکہ دفتر میں بٹھاکر ذاتی مترجم کی حیثیت سے دن رات گھستے تھے۔ میر ابوالحسن کی ذات میں وہ ساری خوبیاں اچھی طرح موجود تھیں۔ جو انگریز حاکم اپنے سکریٹری میں ہونا مانگتا تھا۔ وہ کاغذات پڑھ کر صحیح مقصد بتاتے تھے اور ملاقاتیوں کے مسائل کی ٹھیک ترجمانی کرتے تھے ہیر پھیر سے کیا مطلب۔ اس نوعیت کی نوکریاں کلکتہ اور بمبئی جیسے بڑے شہروں میں زیادہ ہاتھ آتی تھیں۔ لہٰذا میر ابوالحسن کو بیشتر وطن سے دور قیام کرنا پڑتا تھا۔ البتہ ایک سہولت بھی تھی۔ جب طبیعت اُچاٹ ہوئی صاحب کو سلام کیا اور گھر کے لیے روانہ ہوگئے۔ انگریز ان کی نیکی اور شرافت کا بے حد اعتراف کرتے تھے۔ عرصہ گھر پر گذار کر پھر واپس پہنچے تو دوبارہ ملازمت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ برادری کے لوگوں کو ان کی ملازمت پر ہمیشہ ہنسی آتی تھی۔

جب ملکہ وکٹوریہ مری (۱۹۰۱ عیسوی) اتفاقاً ان ہی دنوں میر ابوالحسن اپنی نوکری سے چھٹی لے کر چھولس تشریف لائے۔ ان کے بازو پر بندھی ہوئی سیاہ پٹی اہل برادری کو

عجیب چیز معلوم ہوئی اور سب نے غور سے دیکھا۔ انھوں نے بتایا یہ سوگ کی علامت ہے۔ ویسی ہی سیاہ پٹی ہر سرکاری ملازم تیرہ دن، چالیس دن، یا خدا جانے کب تک اپنے بازو پر باندھے پھرتا تھا۔ ہندوستانی نوکر ملکہ معظمہ سے وفاداری کا ثبوت دے رہے تھے۔ میر ابوالحسن سرکاری حکم کے مطابق پابندی سے سیاہ پٹی باندھے رہے۔ برادری میں مشہور ہوگیا کہ رات کو بھی نہیں کھولتے۔ بات بھی بے جا نہ تھی۔ وفاداری کے لیے استواری شرط ہے۔ غالباً اسی عرصے کی بات ہے کہ وہ کسی خاتون سے ملنے گئے جوان کی قریبی عزیزہ تھیں اور رشتے میں ان سے بڑی تھیں۔ خاتون محبت سے پاس بٹھاکر بولیں کہ بھیا، میں دیکھتی ہوں بہت سے لوگوں نے تم سے کم علم پڑھا اور بڑی بڑی نوکریوں پر پہنچ گئے۔ آخر تم نے کیا پڑھا تھا، مجھے بتاؤ۔ میر ابوالحسن نے کچھ سمجھانا چاہا لیکن بڑی بی مطمئن نہ ہوئیں اور حتمی انداز میں کہا۔ نہیں بھیا، مجھے ایسا لگتا ہے تمہارا علم پرانا ہوگیا۔ اس فقرے سے برادری والوں نے مدتوں لطف لیا۔

نوکری کا سلسلہ نوجوانی میں شروع ہوا تھا اور پختہ عمر تک چلا۔ بڑھاپے کی منزل آنے سے پہلے ہی میر ابوالحسن پھلوس چلے آئے اور پھر وطن سے باہر کہیں نہیں گئے وہ بڑی حیثیت کے زمیندار تھے۔ ایسا آدمی اپنی آراضی کے انتظام پر ذرا سی توجہ بھی دیتا تو اس کے لیے خوش حالی سے گزر بسر کرنا دشوار نہ تھا۔ آخر انھوں نے ایک ہوشیار اور ہمدرد منتظم ڈھونڈ کر جائداد کے معاملات اس کے سپرد کر دیے اور اس کی جانفشانی کے نتیجہ میں ان کی آمدنی اطمینان بخش سطح تک پہنچ گئی۔ ان کے اطوار سے اس قسم کی بدمزگی کبھی ظاہر نہ ہوئی کہ گاؤں کے ماحول میں جی نہیں لگتا یا خلقت کی حرکتوں سے پریشان ہیں۔ دل میں دوسروں کے لیے ہمدردی اور خیر خواہی کا احساس ہو تو گھبراہٹ طبیعت کے پاس نہیں آتی اور آدمی دلچسپی کے بہت سے سامان ڈھونڈھ ہی نکالتا ہے۔ برادری کے لوگ ہمیشہ سے میر ابوالحسن کی نیکی کے قائل تھے، وہ مستقل آ گئے تو جو محبت ان کی ذات سے سب کو تھی اس میں اور اضافہ ہوگیا۔

پرانے بزرگوں کا قول ابھی تک لوگوں کو یاد ہے کہ ہماری بستی میں پردیس سے واپس آنے والی عموماً دو جنس کی مخلوق ہوا کرتی تھی۔ فرض کیجیے کوئی اتنے عرصہ بعد آیا کہ وطن کے در و دیوار اجنبی معلوم ہونے لگے۔ اور باہر جو عیش تھے وہ میسر نہیں رہے۔ یا خدانخواستہ نوکری سے نکالا گیا اور مجبوری میں گھر آنا پڑا ہے۔ تو مشہور تھا کہ ایسے آدمی سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ وہ برادری میں فتنہ و فساد پھیلا سکتا ہے۔ دوسری جنس کے بشر کی پہچان یہ بتلاتے تھے کہ باہر رہ کر کبھی نیک نیتی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور فقہ کے دونوں ابواب کا خیال ملحوظ رکھا، یعنی باب العبادات کے علاوہ باب المعاملات سے بھی غافل نہیں رہا۔ تو کہتے تھے اس کے داخل ہونے سے بستی میں رونق اور برکت ہوگی۔ نہ اجتماعی امن خطرے میں پڑے گا اور نہ کسی کے لیے انفرادی پریشانی کھڑی ہوگی۔ میر ابوالحسن ایسی ہی وضع کے انسان تھے۔

چھولس کی عیدگاہ میر ابوالحسن کی یادگار خدمت ہے۔ انھوں نے اپنا ایک کھیت وقف کر کے اس کے اندر عیدگاہ کی بنا ڈالی۔ دوسروں نے ثواب کی خاطر چندہ دیا ہو وہ اور بات، ورنہ ان کو ضرورت نہ تھی۔ برادران اہل سنّت کی عیدگاہ جو وہیں نزدیک جنگل میں واقع ہے، قیاس کہتا ہے کہ وہ پہلے سے موجود تھی یا اسی زمانے میں تعمیر ہوئی، واللہ اعلم۔ قابل ملاحظہ بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدا تک چھولس میں سیدوں کو بسے ہوئے تین صدیاں گزر چکی تھیں۔ اس عرصے میں انھوں نے نہ تو اپنی مسجد تعمیر کی اور نہ عیدگاہ کا خیال آیا۔ وہاں سلطان بہلول لودی یا اس کے جانشینوں کے عہد میں ہمارے بزرگوں کا داخلہ ہوا۔ اور پٹھان جو پہلے سے آباد تھے کچھ دنوں بعد بستی چھوڑ کر چلے گئے تو ان کی بنائی ہوئی مسجد میں سیّد نماز پڑھنے لگے۔ اس طرح مسجد کا معاملہ حل ہو گیا۔ عیدگاہ کی ضرورت یوں نہ پیش آئی کہ سب لوگ جارچے جانے کے عادی تھے۔ بیشتر پیدل، کچھ بیل گاڑیاں، کچھ گھوڑیاں، ان کے درمیان میں ایک دو گھوڑے غل غپاڑہ مچاتے چلے جاتے تھے اور اسی شان سے واپس لوٹنا ہوتا تھا۔ چھولس کی مختصر تعداد کہنا چاہیے کہ جارچے کی آبادی کا اضافہ تھی۔ جسے

آج کل کی اصطلاح میں توسیع کہتے ہیں۔ واقعہ یہی تھا کہ چھولس کے سیّد اپنے سارے کاموں کے لیے جارچے کی طرف دیکھتے تھے اور جارچہ ہی اصل مرکز تھا۔ میر ابوالحسن کو سب سے پہلے چھولس میں علیحدہ عیدگاہ کی ضرورت کا احساس ہوا۔ یہ بات بیسویں صدی عیسوی کی پہلی یا دوسری دہائی کی ہے۔

مسلمانوں کی وہ نسل، چہ شیعہ و چہ سُنّی، جس نے سب سے پہلے یعنی انیسویں صدی کے اواخر میں، مغربی تعلیم حاصل کی، طرزِ فکر میں پرانی وضع کے روایتی مسلمانوں سے کافی الگ اور مختلف تھی۔ سرسید کی تحریک کے خلاف مولویوں کا یہ اندیشہ ذرا سا بھی درست ثابت نہ ہوا کہ جدید افکار سے واقفیت کے نتیجہ میں لوگ مذہب کو غیر ضروری چیز سمجھنے لگیں گے اور فالتو دینیاتی بکھیڑا کہہ کر پھینک دیں گے۔ بلکہ ہوا یہ کہ ان کے دل میں مذہب کی حقیقی روح تک پہنچنے کی آرزو بیدار ہوئی جو ایک نیک فال تھی۔ وہ مذہب سے مخلصانہ وابستگی رکھتے تھے۔ البتہ قدرتی طور سے ان کا ذہن ایسی بےشمار رسومات اور روایات کے بارے میں کھٹکا اور سوالیہ نشانات پیدا ہوئے جن کو مسلمان گلے سے لگائے تھے اور کسی صورت چھوڑنے کو راضی نہ تھے۔ حد یہ کہ ان پر عمل کرنا ہی عین اسلام تصور ہوتا تھا۔ یہاں فی الحال میر ابوالحسن کا ذکرِ خیر مقصود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی ذات مذکورہ دور کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ ان کے اصلاحی اقدامات کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ مثلاً ماہ رمضان میں عورتیں افطار کا سامان مسجد میں بھیجتی تھیں ضمناً بزرگوں کی فاتحہ کا مقصد بھی پورا ہو جاتا تھا۔ کوئی سیّد اس کھانے کو ہاتھ نہ لگاتا تھا، کہتے تھے، مُردوں کی فاتحہ کا کھانا ہم نہ کھائیں گے۔ جو غریب غربا تھے وہ بھی شرماتے تھے۔ مسجد میں ایک فقیر بیٹھا رہتا تھا۔ ساری روٹیاں اور طرح طرح کی غذائیں اس کو چلی جاتی تھیں، وہ کتنا کھا سکتا تھا، سب جانتے تھے کہ رمضان میں اس کی بھینس موٹی ہوتی ہے۔ میر ابوالحسن نے یہ رسم توڑی، سب سے پہلے خود کھایا اور لوگوں کو سمجھایا کہ آخر ہمارے ہی مُردے ہیں، ہم ان کی فاتحہ

کا کھائیں گے تو ان کی روحیں بہت زیادہ خوش ہوں گی۔ یہ دلیل تمام اہل برادری کو پسند آئی اور ان کی دیکھا دیکھی سب کھانے لگے۔ مسجد کی رونق بڑھ گئی اور ماہ رمضان واقعی برکت کا مہینہ معلوم ہونے لگا۔

زمینداروں میں ہر جگہ شادیاں دھوم دھام سے کرنے کا رواج تھا۔ وہی کیفیت چھولس کے بزرگوں کی تھی کہ نہ کبھی خستہ حالی سے ہار ماننے کو تیار ہوئے۔ نہ زمینداری کا زعم اور نشہ طبیعت سے گیا۔ بیاہ شادی کے موقعوں پر مقروض ہو جانا بری بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ میر ابوالحسن کی نظر سب سے پہلے اس افسوسناک صورت حال کی طرف گئی۔ بالآخر انھوں نے غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کرکے دکھایا۔ اور پوری برادری کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان کی اولاد میں ایک بیٹا صفدر عباس اور دو بیٹیاں نرجس اور مریم تھیں۔ وہ بڑی ہوئیں اور شادی کا سوال سامنے آیا تو میر ابوالحسن نے وہیں وطن میں دو لڑکوں کو انتخاب کرکے استخارہ کیا اور ان کے ماں باپ کو بلاکر اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیا۔ دونوں فریق بے حد خوش ہوئے اور جب میر ابوالحسن نے کہا کہ نکاح آج ہی ہوگا تو ہاتھ جوڑنے لگے کہ کم از کم ہفتہ بھر کی مہلت دیجیے، ایک جوڑا بنالیں، جو قریبی عزیز باہر ہیں ان کو تو بلا ہی لیں۔ میر ابوالحسن نے شدت سے منع کر دیا۔ فوراً برادری جمع ہوئی، اور لڑکیاں رخصت ہوگئیں۔ نہ مہمانوں کا ہجوم، نہ بارات کی ہلچل، نہ ضیافت، نہ جہیز، اور نہ تقریبات کے دیگر لوازم۔ البتہ خاص معاملہ یہ پیش آیا کہ قانون وراثت کی رو سے جو حق لڑکیوں کو جائیداد میں پہنچتا تھا اس کی دستاویزیں میر ابوالحسن نے رخصت کے وقت دامادوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیں۔ خود تحصیل میں گئے اور دونوں لڑکیوں کے نام کا اندراج ان کے حصے کی زمینوں پر کرا دیا۔ وہ فقہ کے احکام کی پابندی لازم سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جارچہ چھولس میں یہ انوکھی مثال تھی۔ سارے سیدوں کو یہ بات ناگوار لگی، بہت بگڑے اور میر ابوالحسن پر چاروں طرف سے اعتراض ہوئے۔ سب شکایت کرتے تھے کہ اس شخص نے فتنے کا دروازہ کھولا،

کل کو لڑکیاں حق مانگیں گی، جائدادوں کے ٹکڑے ہوا کریں گے۔

شاید اولاد کی مثالی شادی کا مظاہرہ کافی نہ تھا۔ میر ابوالحسن اس سے بھی آگے بڑھنے کو تیار تھے۔ ان کو شوق ہوا کہ ہندوؤں کو اسلام کی دعوت دینا چاہیے اور فی الحال چماروں کو مسلمان کرنا نہایت آسان ہے۔ ہم ان سے صرف اتنا کہیں کہ کلمہ پڑھو تو ہمارے بھائی ہو جاؤ گے، ساتھ کھاؤ پیو، برابر بیٹھو کوئی فرق ہم میں اور تم میں نہ رہے گا۔ اس تجویز سے برادری والے اس قدر ناراض ہوئے اور ایسا غصہ آیا کہ میر ابوالحسن کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ سب سے زیادہ قاضی شوکت حسین پیچھے پڑ گئے۔ کہتے تھے کہ چماریاں جو دن رات کھیتوں میں کام کرتی ہیں پھر ان کی جگہ کون کام کرے گا۔ قاضی جی کو بھونڈے الفاظ استعمال کرنے کی عادت تھی۔ اصل بات یہ، کہ سلطان التمش کے عہد سے ملک کی تقسیم کے وقت تک مسلمانوں کے اہل الرائے اصحاب، جو آج کل کی اصطلاح میں دانشور کہلاتے ہیں، اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ ہم لوگ برصغیر کی انسانی آبادی کا نہایت مختصر حصہ ہیں، اگرچہ بہت دنوں تک حکومت کی ہے، زمانہ بدلا، انقلاب آیا، اور اکثریت جو ہمارے وجود سے مرعوب ہے، غالب آگئی، تو کیا ہوگا۔ اس سوال سے سب نے نظر بچائی، سنجیدہ حل سامنے تھا مگر تیاتے میں اجتماعی تعصبات سے سب ڈرتے تھے۔ میر ابوالحسن جیسے عجیب اور غیر معمولی انسان کبھی پیدا ہوئے بھی تو اختلافی آوازوں کے شور میں ان کی رائے دب کر رہ گئی۔

علی گڑھ کے پرانے قصّے اکثر سنے ہیں اور دوسرے مقامات پر بھی یہی دستور تھا کہ دیہاتی زمیندار اپنے لڑکے کو تعلیم کی غرض سے بھیجتے تھے تو قریبی عزیزوں کے ایک دو بچے خاص اپنے خرچ سے اور ساتھ کر دیتے تھے تاکہ ان کے صاحبزادے بلند اقبال کا جی لگا رہے۔ میر ابوالحسن گنجائش کے آدمی تھے اور مذہبی مزاج پایا تھا۔ انھوں نے یہ کیا کہ اپنے بیٹے صفدر عباس کے

کو ایک تو ہائی اسکول سے آگے جدید تعلیم نہ دلائی بلکہ مولوی بنانا پسند کیا۔ دو بچوں کو ان کا جی لگانے کے لیے ساتھ بھیجا۔ غالباً منصبیہ عربی کالج میرٹھ میں داخل کرایا تھا۔ صفدر عباس جیسے گئے تھے تھوڑے دن بعد ویسے ہی گھر واپس آگئے۔ ہائی اسکول کی سند کے طفیل میں دہلی جاکر نوکری پکڑی اور وہیں بتدریج ترقی پاتے رہے۔ البتہ وہ دونوں ہمراہ جانے والے بچے فضیلت کے درجے کو پہنچے اور علوم دین کے منتہی ہوکر نکلے۔ صفدر عباس کی ذات میں ایک صفت اولیائے کرام کی سی پائی جاتی تھی۔ جس کو باپ کی تربیت کا اثر کہنا چاہیے۔ برادری والوں کے عام زمیندارانہ مزاج کے خلاف وہ ہر ایک کو سلام کرنے میں ابتدا کرتے تھے اور کبھی دوسرے کو سبقت کا موقعہ نہ دیتے تھے، بلا امتیاز کہتر و مہتر، یعنی کہ کسے باشد۔ ان کا سلام یاددہانی کراتا تھا کہ چھوٹی خوبیاں بہت بڑی خوبیوں کے مقابلے میں زیادہ کارآمد ہیں جن کا بے دریغ اظہار کرتے رہیے، نہ محنت نہ لاگت۔

## منشی محمد نذیر

منشی محمد نذیر محکمہ نہر میں انجینیئر تھے اور بتدریج ترقی کرکے اس عہدے تک پہنچے تھے۔ ان کا رہائشی مکان جو ۱۹۰۵ء کے قریب تعمیر ہوا جارچہ چھولس میں جدید مغربی طرز کا سب سے شاندار نمونہ تھا۔ چھولس تو جنگ عظیم دوئم تک بتیسیر کچے مکانوں کا گاؤں تھا البتہ جارچے میں سیدوں کی شاندار حویلیاں تھیں جن کا طرز تعمیر شاہجہاں کے وقتوں سے چلا آرہا تھا۔ اس میں ہندوستان کی آب و ہوا کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلند کرسی اور دالان در دالان کے اصول کو خصوصیت حاصل تھی۔ انگریزوں نے آکر اپنی بود و باش کی احتیاج اور اپنے

تمدنی مزاج کے اعتبار سے پرانے طرز میں نمایاں تبدیلیاں کیں۔ مختصر یہ کہ ترمیم کے بعد جو نقشہ سامنے آیا اور جس نے رواج پکڑا وہ نوآبادیاتی طرز معماری کہلانے لگا۔ صاحب اپنے ہیڈ کواٹر سے باہر دورے پر جائے تو ٹھہرنے کے لیے ڈاک بنگلہ، جس کے بنیادی خط و خال میں نوآبادیاتی معماری کی نئی وضع خاص طور سے جھلکتی تھی۔ عموماً اس کا ڈھانچہ ایسا ہوتا تھا کہ درمیان میں کشادہ ہال جس میں ضرورت پڑے تو صاحب کا اجلاس ہو جائے ورنہ کلرک میز کرسیاں ڈالے کام کرتے رہیں۔ اور دونوں طرف پہلو میں آرام کے لیے کشادہ کمرے۔ چھت کا مسئلہ اس ترکیب سے درست کرتے تھے کہ گول بھاری ستونوں پر کمانی دار یا نیم دائرے کی محرابیں اور محرابوں کے اوپر دبی ہوئی گنبد جس کو ڈاٹ کہتے ہیں یہ قاعدہ اختیار کرکے عمارت کے داخلی حدود کو کہیں تک پھیلایا جا سکتا ہے۔ اصل عمارت سے ہٹا کر خاص کرسی سے ذرا پیچھے کی طرف شاگرد پیشہ ملازموں اور دیگر ضروریات کے لیے چھوٹی گنجائش کے کمرے، جہاں سامنے کے رخ پر وہی نیم دائرے کی محرابیں اور اوپر ڈاٹ، یعنی دروازے پر کواڑ اکثر ندارد، ضرورت ہو تو پردہ ڈال دیجیے۔ اور وہیں مزید فاصلے پر گھوڑے کا اصطبل۔ اس کو نوآبادیاتی طرز معماری کا دھندلا سا نقشہ کہنا چاہیے۔ محمد نذیر نے اپنا مکان اسی نمونے کا بنایا تھا جو ابھی تک سالم حالت میں کھڑا ہے۔ (البتہ ادھر سننے میں آیا کہ پہلو کے ایک کمرے کی چھت سقیم حالت کو پہنچ گئی ہے) جھولس میں نوآبادیاتی معماری کی ایک یادگار کا باقی رہ جانا دلچسپ بات ہے، اس لیے کہ شہروں کی تیز رفتار دنیا میں اس قسم کی چیز مشکل سے کہیں نظر آئے گی۔

سرسید کا علیگڑھ گزٹ ۱۸۶۱ء کے بعد کسی شمارے میں یہ خبر شائع کرتا ہے کہ حکومت نہریں جاری کرنے کا منصوبہ رکھتی ہے جس سے زراعت کی ترقی اور اہل ملک کی خوش حالی مقصود ہے حسب قاعدہ انگریز انجینیر کو محکمے کا سربراہ ہونا چاہیے تھا، لیکن جن ہندوستانیوں نے معمولی حیثیت سے نوکری شروع

کی، مثلاً منشی یا حسابدار ہو گئے اور قابلیت کا اظہار کیا وہ بھی ترقیات پا گئے۔ اکثر ملازم ذاتی صلاحیت کے صلے میں انجنیر بن گئے اس لیے کہ اس وقت تک اختصاصی سند کا سوال نہ تھا۔ مسلمان آبرسانی اور نہر سازی کے اصولوں سے واقف تھے۔ اور پرانے زمانے سے اس کام کا تجربہ رکھتے تھے۔ مدرسوں کی بابت یہ نہایت ترچھا تصور ہے کہ وہاں محض فقہ، تفسیر، اور حدیث کی تعلیم ہوتی تھی، اساتذہ، ریاضی، مہندسی، کیمیا، طب، فلکیات، حتیٰ کہ علم موسیقی سے بھی کامل آشنائی رکھتے تھے۔ کسی طالب علم کا جی چاہا تو یہ مضامین سیکھ سکتا تھا اور ان کے درس حاصل کرنے کا موقعہ مفقود نہ تھا۔ مسلمانوں نے آب پاشی اور نہر سازی کا کام سلطان علاؤالدین خلجی کے دور سے شروع کیا۔ عام قاعدہ تھا کہ صوبائی حاکم اپنے علاقوں میں نہریں بنواتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کا دور ختم ہونے کو آیا تو وہ پنجاب اور دارالسلطنت دہلی کے چاروں طرف کافی تعداد میں نہریں تیار کر چکے تھے۔ مغلوں کے عہد میں پرانی نہروں کی مرمت ہوتی رہی اور نئی نہریں جاری کرنے کا سلسلہ برابر آگے بڑھا۔ شاہ جہاں کے عرصۂ حکومت میں بالائی پنجاب سے لاہور تک جو نہر بنائی گئی اس کی لمبائی چوراسی ۸۴ میل تھی۔ انگریزوں نے جب نہر سازی کی طرف توجہ کی اور اس کام کے لیے محکمہ قائم کیا تو اس وقت تک مسلمانوں کا پرانا نہری نظام پوری طرح اور کارآمد حالت میں موجود تھا۔ یہ پس منظر اس لیے پیش کیا گیا کہ مدرسے کے معمولی سے تعلیم یافتہ افراد کے لیے، اور محمد نذیر بھی اسی زمرے میں شامل تھے، نہر کا انجنیر بن جانا غیر معمولی بات نہ تھی اور نہ اس پر تعجب ہونا چاہیے۔ چھولس میں ضامن علی نام کے ایک اور بزرگ بھی انجنیر تھے۔ انھوں نے کوئی عمارت تو نہیں بنائی البتہ اولاد نرینہ میں دو بیٹے یادگار چھوڑے۔ ان دونوں سے پہلے منشی محمد رفیع کے باپ، شاہ محمد کی بابت سنا کہ محکمہ نہر میں ملازم تھے اور وہ بھی ملازمت کے آخری دور میں انجنیر کا عہدہ پا گئے تھے۔

محمد نذیر گڑھی میں رہتے تھے اور وہیں انھوں نے مکان بنایا تھا۔ البتہ گڑھی کا لفظ ذرا سی وضاحت چاہتا ہے۔ . . . ویسے تو ہندی لغت میں گڑھی قلعے کو کہتے ہیں اور عموماً گڑھی کے نام سے قلعہ ہی ذہن میں آتا ہے۔ مگر یہ بات ہمارے زمانے کے کم لوگوں کو یاد رہ گئی ہوگی کہ ناگہانی اور اتفاقی ضرورت کے وقت تحفظ کی خاطر لکڑی کے بھاری لٹھے، مضبوط بانس، اور رکاوٹ کی دوسری چیزیں کھڑی کر کے جو پشتہ بندی کی جاتی تھی اور اندر کی طرف وسیع احاطہ بنا لیا جاتا تھا اس کو بھی اصطلاح عام میں گڑھی کہتے تھے۔ یہ خاص دفاعی بندوبست ہوتا تھا۔ وہاں خطرے کے وقت عورتوں اور بچوں کو ضروری سامان سمیت منتقل کر دیا جاتا تھا۔ باہر کے حملہ آور پر داخلی سمت سے نشانہ تاک کر بارودی بندوقیں، تیر، اور دوسرے ہتھیار چلاتے رہیے۔ موقع دیکھ کر جلدی سے یورش کیجیے اور پھر گڑھی میں آ جائیے۔ خطرہ دور ہو گیا تو رکاوٹیں اکھاڑ لی گئیں، گویا کہ گڑھی منہدم ہو گئی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ سیّدوں کو بستی کی آبادی سے باہر تحفظ کے مقصد سے عین اسی نمونے کی عارضی گڑھی بنانی پڑی۔ صحیح زمانہ کسی کو یاد نہیں اور بتانے والے بھی نہیں رہ گئے مگر اندازہ اور قیاس کہتا ہے کہ مغلوں کے زوال سے بعد کا معاملہ ہے۔ پہلے تو مرہٹے ہر سال دسہرے کے بعد چوتھ وصول کرنے آتے تھے، دیہات پر حملے کرتے تھے، پورے علاقوں کو لوٹتے، جلاتے، اور ویران کرتے گزرتے جاتے تھے۔ یہ مصیبت پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد ختم ہوئی (۱۷۶۱ء) اس کے بعد سکھوں نے جمنا سے اوپر پنجاب سے ملحقہ علاقوں پر لوٹ مار کی نیّت سے دھاوے شروع کیے۔ گڑھی میں ایک شہید کا مزار ہے اور ملک کی تقسیم سے پہلے تک پرانے بزرگوں کو سکّھوں سے لڑائی کا واقعہ یاد تھا۔ پنجاب پر سکھوں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد اس بلا سے نجات حاصل ہوئی (۱۸۴۷ء) ان دو تاریخوں میں سے کسی ایک کے گرد و پیش کوئی زمانہ ہے جب عارضی گڑھی کی ضرورت پیش آئی۔ امکان ہے کہ

سکھوں کی تاخت وتاراج کا مقابلہ کرنے کے لیے گڑھی بنائی گئی۔ انگریزوں کا کا دور شروع ہوا، اور مستقل امن وامان قائم ہو گیا تو بھی گڑھی کے نشانات ختم نہ ہوئے۔ وہاں باقاعدہ سیّدوں کا ایک محلہ بس گیا جو ابھی تک برقرار ہے۔ چھولس کی آبادی متفرق، لیکن گڑھی میں سیدوں کا ٹھوس جماؤ نظر آتا ہے۔ درمیان میں ذراسا فاصلہ اور ایک تالاب تھا۔ وہ آہستہ آہستہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔

محمد نذیر کے باپ کا نام ضامن علی تھا۔ جن کی اولاد میں چھ بیٹے تھے: محمد نذیر عباس حسین، سجاد حسین، باقر حسین، ہادی حسین، ذاکر حسین۔ باپ کی جائیداد پانچ بیٹوں میں تقسیم ہوئی۔ محمد نذیر اپنے حصّے سے بھائیوں کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ ان پانچوں کے پاس کفالت کے لائق آراضی تھی، قناعت کے ساتھ گزار گئے۔ گاؤں میں فرد کا رشتہ معاشرے سے مضبوط جڑا رہتا ہے اور ڈھیلا نہیں ہوتا وہاں آدمی باہر سے نوکری کر کے واپس آئے تو سب لوگ اس سے کچھ امیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ ایک تو اس کو شاندار مکان بنانا چاہیے۔ اس سے برادری میں خاندان کا نام اونچا ہوگا۔ محمد نذیر نے ریٹائر ہونے سے پہلے ہی یہ امید پوری کر دی۔ دوسرے، جیب بھاری نظر آئی تو سب مل کر جائداد خریدنے کا شوق دلاتے تھے۔ یہ بلبیویں صدی عیسوی کی پہلی یا دوسری دہائی کی باتیں ہیں جب یہی رواج تھا۔ محمد نذیر نے چھولس سے نزدیک دیانگر نام کا چھوٹا سا گاؤں خرید لیا جس کی مختصر مال گزاری تھی، مگر ایک گاؤں کا زمیندار ہونا سب کے لیے خوشی اور اطمینان کا باعث تھا۔ مذہبی تقاضے کے پیش نظر ایک امید مزید باقی رہ گئی۔ مسلمان صاحب گنجائش ہے تو حج واجب ہے محمد نذیر حج کو تشریف لے گئے، اور شیعوں کے عام قاعدے کے مطابق تمام مقامات مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ وہاں ایک عراقی عورت کی چال ڈھال دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ ، فارسی اس کی زبان تھی اور محمد نذیر بھی پرانے زمانے کے شرفا کی طرح فارسی بول لیتے تھے۔ وہ خوشی سے نکاح میں داخل ہوئی اور ساتھ چلی آئی۔ توقع تھی کہ اولاد جو برادری کی سابق بیوی سے نہ ہوئی تھی، اس سے ضرور ہو جائیگی۔۔

میاں آکر تھوڑے دن خوب مزے سے رہی، پھر ہندوستان کے موسم اور آب و ہوا کی شکایت کرنے لگی، گرمی برسات سے تنگ آکر رونا پیٹنا مچایا، کچھ اپنا دیس یاد آیا ہوگا محمد نذیر کا ناک میں دم ہوا، آخر اس کو سفر خرچ اور زر مہر دے کر کربلائے معلیٰ جانیوالے قافلے کے ساتھ رخصت کردیا۔ وہ بڑھاپے کے حدود میں داخل ہونے والے تھے یا ہوچکے تھے، ایک شادی برادری میں اور کرڈالی، مگر اولاد کا معاملہ کہنا چاہیے کہ مشیت کو منظور نہ تھا۔ چھولس کے ایک نوجوان شاعر نے جو اتفاق سے محمد نذیر کے قریبی عزیز بھی تھے، شادی کا زبردست مذاق اڑایا، لمبی ترجیع بند نظم کی۔ بعض زندہ دل لوگوں نے یہ ستم ظریفی دکھائی کہ نظم کو چھپوا بھی دیا۔ تکرار کے ساتھ آنے والا شعر تھا۔

عاقل جوان بیٹی کو چولھے میں دیجیے  بڈھے کے ساتھ پر کبھی شادی نہ کیجیے

گڑھی کی آبادی ایک ضرورت کا نتیجہ تھی جس کا حوالہ اوپر گذرا۔ زمانہ گزرتا گیا پھر بھی نقشہ اور منظر سپاہیوں کے پڑاؤ سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔ یعنی اگر خیمے اکھڑ گئے اور چھپّر ٹوٹ گئے تو سارا مقام اجاڑ اور سنسان ہوجائے گا۔ پہلی دفعہ دیکھنے والا اپنے دل میں یہی سوچنے لگتا تھا۔ محمد نذیر کے دم سے یہ کیفیت ختم ہوئی۔ انھوں نے گڑھی کے بالکل قلب میں نہایت کشادہ امام باڑہ اور کنارے پر ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی۔ ان دو عمارتوں کی بدولت گڑھی کو ایک مستقل اور پائیدار محلے کی شکل نصیب ہوئی اور نقشہ بدل گیا۔ اب اس کو محلہ کہنا حق بجانب تھا۔ اصل میں سیّدوں کی مسجد بستی کے جس نقطے پر واقع تھی اور ہنوز ہے، وہاں تک گڑھی میں رہنے والے بوڑھے اور ضعیف افراد، خصوصاً برسات اور جاڑے کے دنوں میں، بڑی زحمت سے پہنچ پاتے تھے۔ محمد نذیر نے نمازیوں کی سہولت کا سامان کردیا۔ حال میں آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے لوگوں نے اس مسجد کو اور زیادہ وسیع کرلیا ہے۔ اجتماعی آرام کو دیکھتے ہوئے امام باڑہ بھی کچھ کم خیر و برکت کی چیز نہیں ہے۔ عزاداری کا مقصد اپنی جگہ رہا جیسا کہ برابر پورا ہوتا ہے۔ موت و حیات کے موقعوں پر برادری والوں کو بیٹھنے کے لیے ایک بڑی جگہ میسر آگئی۔ شادی کی تقریبات

بھی وہیں ہوتی ہیں اور سوگ کا فرش بھی وہیں بچھایا جاتا ہے۔ یہ قاعدہ مسلسل جاری ہے، جب تک مدرسے کا علیحدہ ٹھکانا نہ ہوا تھا کوئی مولوی صاحب مناسب قسم کے تشریف لے آئے اور ان کا جی چاہا تو امامباڑے میں مدرسہ بھی جاری ہو جاتا تھا گڑھی میں برسوں تک وہی واحد امام باڑہ تھا ادھر کچھ دن ہوئے (۱۹۷۵ء / ۱۳۹۵ھ) ارشاد علی نے اپنی بیوی ننّی بیگم کے نام سے ایک اور بنوا دیا، اب دو ہو گئے ہیں۔ محمد نذیر کے عملِ خیر سے آج تک ساری برادری استفادہ کرتی ہے اور جب تک خدا کا حکم ہے مستقبل میں یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا، وہ اولاد سے محروم تھے، مگر اس محرومی کا خوب تدارک ہو گیا۔ یہ دونوں یادگاریں ہمیشگی اور دوام کے اعتبار سے عجیب درجہ رکھتی ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا، شمالی ہند میں شیعہ جماعت کی تنظیم اور باقاعدہ عزاداری کا سلسلہ غفرانمآب سید دلدار علی کے ذریعہ شروع ہوتا ہے۔ وہ ایران اور عراق کی دینی درس گاہوں سے فارغ التحصیل ہو کر آنے والے پہلے مجتہد ہیں۔ آصف الدولہ لکھنؤ ان کا مرکز قرار پاتا ہے قاری جعفر علی تلاش علم میں جارچہ سے نکلتے ہیں اور غفرانمآب کے بیٹے سے درس حاصل کرتے ہیں۔ بینظیر حیدری کی چھولس میں سکونت ہے اور قاری جعفر علی کے قریبی عزیز ہیں۔ ان کی بہن قاری جعفر علی کے بیٹے عباس حسین سے منسوب ہیں۔ بینظیر حیدری چھولس میں عزاداری اور تعزیہ و علم کی ابتدا کرتے ہیں۔ ان کے قائم کیے ہوئے امامباڑے کو اولیت حاصل ہے۔ بتدریج دوسرے بزرگ بھی امام باڑے تعمیر کرتے ہیں، اس طرح مجلسوں کی تعداد اور ترتیب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ آگے چل کر یہ قاعدہ طے پاتا ہے کہ امام باڑے کے بانی کا تعلق جس خاندان سے بھی ہے، عزاداری میں اس خاندان کی مشترکہ معاونت رہے گی۔ اس طریقۂ کار سے اخراجات کا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے اور افراد زیر بار نہیں ہوتے۔ چونکہ بینظیر حیدری کشمیری خاندان سے تھے اس لیے ان کا امام باڑہ کشمیریوں سے منسوب ہو گیا۔ علی الصبح پہلی مجلس وہیں ہوتی تھی۔ محمد نذیر کا زمانہ آیا، یعنی وہ ملازمت سے واپس آ گئے، تو بینظیر حیدری

کے بیٹے اہلبیت حسین مذکورہ امام باڑہ کے نگراں تھے۔ وہیں امام باڑے کے دالانوں سے متصل ان کی رہائش کا بندوبست تھا۔ محمد نذیر اور اہلبیت حسین دونوں گہرے دوست تھے۔ محمد نذیر نے ان سے کہا کہ مجھے اپنے گھر میں فجر کی نماز کے بعد مختصر سی مجلس کرنے کی اجازت دیجیے اور وعدہ کیا کہ آپ کی مجلس کے اوقات میں خلل نہ پڑنے دوں گا۔ محمد نذیر اصول کے آدمی تھے، جب تک زندہ رہے اپنے وعدے کی پابندی برتی اور پوری ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ اہل بیت حسین والی مجلس میں نہ ذرا سی تاخیر ہوئی اور نہ کوئی فرق آیا۔ خاص اہتمام اور ضابطہ یہ تھا کہ وہ بذات خود سامعین اور ذاکروں کے پاس دعوت نامے بھیجتے تھے اور فجر کی نماز میں شریک بعض متقی اور پرہیز گار قسم کے بزرگوں کو اپنے ہمراہ لے کر آتے تھے۔ مجلس میں خوب روتے تھے اور رومال آنکھوں سے نیچے کھسکا کر دیکھتے رہتے تھے کہ کون کس قدر گریہ کر رہا ہے۔ اکثر یہ بھی منہ سے نکل جاتا تھا، جو حزن و ملال کا ماحول بڑھانے کا باعث ہوتا تھا: مومنین، غور سے سنیئے، بہت رقّت کا مضمون ہے اس تاکید پر پاس بیٹھے ہوئے لوگ رونے لگتے تھے۔ مجلس ختم ہوگئی تو محمد نذیر کے بھائی تبرک تبرک کی چیخیں مار کر فالتو خلقت کو دروازے کی طرف دھکیلنے میں لگ جاتے تھے۔ جب ناخواندہ مجمع باہر ہو گیا اور مخصوص حضرات رہ گئے جن کو بانیٔ مجلس روکنا چاہتے تھے، یعنی مدعو شدہ معززین، مرثیہ خواں اور ایسے پرہیزگار، بزرگ جو ان کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے آئے تھے، تو پھر گرم حلوے کے طباق اور پراٹھے ان کے سامنے لاکر رکھے جاتے تھے۔ محرم کے علاوہ بھی محمد نذیر کی طرف سے بستی کے خاص الخاص افراد کی تواضع کا سلسلہ برابر چلتا ہی رہتا تھا۔

## طالب علی ، مقدم علی حسین ، میر علی حسن

طالب علی کمپنی بہادر کی فوج میں سپاہی تھے۔ یہ غدر سے پہلے کی بات ہے جب انگریزوں کی تجارتی کمپنی ہندوستان کی بساط سیاست پر روز بروز اپنا اقتدار بڑھا رہی تھی۔

جیسے ناگہانی دور سے ایک ڈھیلا آکر پرسکون تالاب میں گرے اور تیز لہر کا دائرہ چاروں طرف پھیلنا شروع ہو جائے۔ ہندوستان پر روس کا خطرہ دیکھ کر انگریزوں نے چند قدم آگے کی حکمت عملی اختیار کی اور افغانستان پر قبضہ ضروری سمجھا (۱۸۳۴ء) اس منصوبے میں کامیابی نہ ہوئی، اور متعدد کوششوں کے باوجود ہر دفعہ انگریزوں کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ ایسا ہی کوئی سانحہ تھا جب طالب علی، جو کمپنی کی فوج میں ایک نوجوان سپاہی تھے افغانستان سے پسپا ہو کر بھاگنے والی فوج کے ساتھ کہیں سرحد کے پہاڑوں میں پھنس گئے۔ جاڑوں کا موسم تھا شکست کا منھ دیکھنے والے سپاہیوں کی مصیبت قیامت سے کم نہیں ہوتی۔ زمین سخت اور آسمان دور کا مضمون سامنے آجاتا ہے۔ کوئی جان سالم لے کر نکل آیا تو معجزہ سمجھیے۔ طالب علی کے پاؤں راستے بھر برف میں دھنس جاتے تھے ایک دریا کو دور تک پار کیا۔ نقطۂ انجماد کے قریب پانی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں پاؤں ٹخنوں سے علیحدہ ہو گئے اور عاجز ہو کر گر پڑے۔ بھوک اور پیاس کی شدّت نے بالکل دم نکال دیا۔ آخر جان جاتی دیکھ کر مایوسی کے عالم میں نادِ علی پڑھنا شروع کی اور تمام رات نادِ علی پڑھتے رہے صبح کے آثار نمودار ہوئے تو کہرے کے دھوئیں میں ایک بزرگ کو آتے دیکھا جن کے پیچھے سر پر غذا کا خوان لیے ایک آدمی اور تھا۔ طالب علی بیان کرتے ہیں کہ میرے سامنے خوان رکھ کر نہایت ہمدردی کے انداز میں کھانے کی فرمائش کی۔ میں اصرار کرنے لگا کہ ایسے ویرانے میں جہاں دور تک آدم نہ آدم زاد، آپ کہاں سے آگئے اور کون ہیں، جب تک نہ بتائیں گے میں نہ کھاؤں گا۔ ہنس کر فرمایا، وہی ہوں جسے یاد کرتے تھے۔ میں نے ایسی مزیدار غذا کبھی نہ کھائی تھی۔ اسے کھا کر طاقت آگئی۔ پھر حکم ہوا آنکھیں بند کرو۔ میں نے آنکھیں بند کر کے لمحہ بھر بعد کھولیں تو دریا کے پار ایسے محفوظ مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں ہماری منتشر فوج کے سپاہی آکر دو، بارہ جمع ہو رہے تھے۔ طالب علی کا قصّہ آج کل کوئی باور کرے یا نہ کرے، ان کے خاندان والے ہمیشہ بیان کرتے ہیں۔ نپولین ماسکو شہر کو جلا پھونک کر واپس لوٹا تو اس کے سپاہیوں کو راستے بھر اسی نوعیت کے بلکہ اس سے بھی بدتر حادثات سے سابقہ پڑا تھا۔

طالب علی کے دادا کا نام غلام علی تھا۔ غلام علی کے دو بیٹے، ضامن علی اور غالب علی ہوئے۔ ضامن علی کے چھ بیٹوں کے نام محمد نذیر کے ذکر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ غالب علی کے پانچ بیٹوں کی تفصیل یہ ہے: طالب علی، قاسم علی، ظہور علی، فدا حسین، محمد حسین۔

جب سے سیدوں کی گڑھی کا وجود ہوا طالب علی کے بزرگوں کی سکونت گڑھی میں تھی۔ ان کے زمانے میں دو طالب علی اور بھی تھے۔ وہ افغانستان کی جنگی مہم میں دونوں پاؤں ضائع ہو جانے کے بعد طالب علی ڈنڈے کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ دوسرے بزرگ نہایت پاکیزہ خصلت، دردمند، اور عبادت گزار واقع ہوئے تھے۔ وہ طالب علی میاں جی کہلانے لگے۔ تیسرے کی زندگی حیدرآباد دکن میں گزری تھی اور وہاں مدرسے میں استاد تھے۔ چھولس کی روایت کے مطابق نظام حیدرآباد کو پڑھایا تھا۔ جب بڑھاپے میں گھر واپس آنے کو ہوئے تو نظام حیدرآباد نے گزر بسر کے لیے ایک گاؤں خرید کر دیا تھا۔ بہرحال نظام نہ سہی، نظام کا کوئی امیر کبیر رہا ہوگا جس نے استاد کی خدمت کے خیال سے یہ انتظام کر دیا۔ ان کو برادری والے طالب علی دکھنی کہتے تھے۔ طالب علی دکھنی کی واحد دختری اولاد تراب علی نام کے ایک بزرگ سے منسوب ہوئی، اور ان کی زمینداری کا گاؤں جبکناپور جو گنگا سے اوپر واقع تھا۔ تراب علی کو منتقل ہو گیا۔ عاشق حسین، راقم الحروف کے خالو، تراب علی کی نسل سے تھے۔ میری تربیت میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ جبکناپور کی زمینداری کے حالات اکثر سناتے تھے اور بتلاتے تھے کہ ہمارے خاندان والے وہاں کی جائیداد آہستہ آہستہ بیچتے رہے، ان کے بڑے بھائی اشتیاق حسین اس تصدیق میں اضافہ کرتے ہیں کہ آخری حصہ جو بچا تھا ہمارے والد اصطفیٰ حسین گئے اور جا کر فروخت کر آئے۔

طالب علی ڈنڈے یقیناً غیر معمولی اوصاف کے آدمی تھے۔ ان کو جو مشاہدہ بیداری اور ہوش کے عالم میں میسر آیا اس کے لیے لاکھوں بندگان خدا ترستے ہیں اور خواب میں بھی نصیب نہیں ہوتا۔ وہ جوانی میں دونوں پاؤں کھو بیٹھے تھے۔ پھر بھی عرصے تک ہنسی خوشی جیتے رہے۔ اس سے ان کے صبر اور حوصلے کا پتہ چلتا ہے۔ شیخ سعدی کی تعلیم

ہے کہ آدمی زندگی کی محرومیوں کو صبر اور حوصلے سے برداشت کرتا رہے تو ولایت کی منزل دور نہیں رہ جاتی۔ شیخ اپنا ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ گردش روزگار سے کبھی نالاں اور دل شکستہ نہ ہوا مگر ایک بار جب نوبت یہ آئی کہ جوتیاں پاس نہ تھیں اور سردی میں ننگے پاؤں گھومتا پھرتا تھا۔ اس بے سروسامانی کے ساتھ مسجد کوفہ میں پہنچا۔ وہاں ایک آدمی پر نظر پڑی جس کے دونوں پاؤں نہ تھے اور زبان پر شکر جاری تھا۔ دل میں خیال آیا، خدا نے عبرت اور سبق کے لیے یہ منظر دکھایا ہے۔ یعنی صبر کے مقام میں دوسرے تم سے آگے ہیں۔ فوراً توبہ کی، اپنے مضبوط پاؤں کی طرف دیکھا اور شکر ادا کیا۔

طالب علی کا فوج میں نوکری کرنا نسلی روایت اور شوق کا معاملہ تھا۔ فوجی تربیت اور تجربہ زمینداروں کے گھروں میں پرانے وقتوں سے ایک پسندیدہ روایت تھی ورنہ طالب علی معقول آراضی کے مالک تھے ان کی اولاد میں چار بیٹے ہوئے: علی حسین، مبارک حسین عنایت حسین، الطاف حسین۔

# مقدم علی حسین

طالب علی کے بیٹوں میں علی حسین سب سے زیادہ سوجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ کسی شخص کی ہوشیاری کا معیار یہ ہے کہ وہ معاملات کو خوب صورتی کے ساتھ کامیابی کی طرف بڑھانا سیکھ جائے۔ علی حسین نے یہ ہنر سیکھ لیا تھا۔ انھوں نے ایک نیل کی فیکٹری کا منصوبہ بنایا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ فیکٹری کی تعمیر اور شروعات میں زبردست لاگت آتی تھی جس سے نمٹنا معمولی وسائل کے آدمی کا کام نہ تھا۔ وہ اس مقصد میں لگے رہے۔ محکم ارادہ اور موروثی جائیداد کا سہارا کافی ثابت ہوا۔ کاروبار میں منافع ہونے لگا تو اس میں اپنے بھائیوں کو شریک رکھا۔ سیدھا اصول ہے کہ نیت سالم تو حسن عمل قائم۔ اس سے منزل آسان رہے گی اور برکت ضرور ہوگی۔ علی حسین کی تدبیر کے سب قائل ہو گئے، ان کی معاملہ فہمی خاندان پر، برادری پر، سب دور پاس والوں پر

ثابت ہوگئی، اور رفتہ رفتہ پورے علاقہ میں ان کا نام بلند ہوتا چلا گیا۔

علی حسین مزاج کے اعتبار سے خوش و خرّم رہنے والے آدمی تھے، اکثر اوقات وسائل کی کشادگی اور خوش حالی بھی افراد کا اخلاق بلند کرنے میں مدد کرتی ہے۔ اجتماعی برتاؤ کا قاعدہ قدرتی طور سے تھرمامیٹر کے پارے کی طرح اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے، یہ قاعدہ کوئی دوسرا نہیں سکھاتا، جیب خود سکھا دیتی ہے۔ علی حسین عادتاً یا خدا جانے مصلحتاً اپنے نواح میں رہنے والی ہندو آبادی کے ساتھ خاص محبت اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ ہماری بستی کے چاروں طرف کچھ راجپوت اور بیشتر گوجر قبیلے کے گاؤں آباد ہیں۔ جاٹوں کا پھیلاؤ بعد میں ہوتا ہے۔ ان دیہاتوں میں دور تک علی حسین کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا اور سب ان کے گرویدہ تھے۔ مقدم کا لقب ہندوؤں کی مقامی برادری کا دیا ہوا تھا جو ان کے نام کا جزو بن گیا۔ نواح کے گوجر ان کو مقدم کہہ کر پکارتے تھے۔ جارچہ چھولس کے سیّدوں میں طنطنے کے زمیندار اکثر پیدا ہوتے رہے، مقدم کوئی نہ تھا، بس علی حسین ہی مقدم تھے۔ اس لقب میں ان کے اثرات کا اعتراف اور ان کی ذات سے محبت کا اظہار دونوں ہی باتیں شامل تھیں۔ ملحوظ خاطر رہے کہ بہت سے لوگ دنیا کو غیر مناسب جگہ سمجھ کر اس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ بعض اس کی اصلاح اور درستی کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اور تیسری جنس ان بزرگوں کی ہے جو سوچتے ہیں کہ زمانہ جس رفتار سے چل رہا ہے، چلنے دو۔ وہ مفاہمت میں خیریت سمجھتے ہیں۔ دنیا کو آنکھ کھول کر جیسا پایا، عمر کے آخری دنوں تک ویسی ہی رہے تو بسا غنیمت سمجھیے۔ ان کو نہ بنانے کی فکر، نہ بگاڑنے سے مطلب۔ ہر رنگ میں خوش رہنا، ہر طرح کی مخلوق کے ساتھ، چہ یگانہ چہ بیگانہ، خوش معاملگی کا آئین برتنا اور خندہ پیشانی سے ملنا جلنا ان کی عادت اور ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ مقدم علی حسین بھی اسی قسم کے انسان تھے۔

ہندوستان کی تاریخ میں غدر سنہ ستاون پرانے اور نئے زمانے کے درمیان ایک سنگ میل ہے۔ مقدم علی حسین غدر سے کچھ پہلے پیدا ہونے والی نسل سے تعلق رکھتے

ہیں. پھر بھی جب ان کا زمانہ شروع ہوا اور شعور کی عمر آئی اس وقت دیہاتی معاشرے میں بہت زیادہ تبدیلیاں داخل نہ ہوئیں تھیں. قریب نظر ہی سہی، مگر معلوم ہوتا تھا کہ دنیا اپنی جگہ پائیدار بنیادوں پر قائم ہے اور یوں ہی رہے گی اس کی استواری پر سب کو یقین تھا. گاؤں کی زندگی میں نہ کوئی چیز بظاہر کم ہوئی تھی اور نہ کسی کو اندیشہ تھا کہ آئندہ بہت سی چیزیں غائب ہو جائیں گی. عوام الناس کی یہی خواہش تھی کہ اس کارخانے کی رفتار اور رونق میں فرق نہ آنا چاہیے. یہ محاورہ اکثر سننے میں آتا تھا کہ امیر مال میں مست، فقیر حال میں مست اور کچھ کہتے تھے، غریب کھال میں مَست. غرضکہ سب خوش نظر آتے تھے. اوپر کی سطح پر جو تغیرات واقع ہوئے تھے. اندازہ یہ تھا کہ اُن کے نتائج کو بالکل نیچے تک پہنچنے میں کم از کم ایک نسل کا مزید وقفہ لگے گا. غدر میں مسلمان اور انگریز ٹکرائے تھے، ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہ تو آویزش ہوئی تھی اور نہ ایک دوسرے کے خلاف شکایت کا کوئی سبب کھڑا ہوا تھا. ہندوؤں کے دل میں انقلاب روزگار کی بدولت مسلمانوں کی عزت کچھ کم ہو گئی ہو وہ اور بات، مگر بالکل نہ گئی تھی. ویسے قدیم زمانے سے مسلمانوں کے ساتھ کھانے پینے کے معاملے میں ہندو شدید پرہیز کرتے تھے. کھانا تو درکنار وہ مسلمان کے ہاتھ کا پانی بھی نہ پیتے تھے. مسلمان ان کے برتن کو ہاتھ لگا دے تو برتن نجس ہو گیا. مٹی کا ظرف ہے تو پھوڑ دیا جائے گا، معدنی ہے تو چولھے کی راکھ یا ریت سے دیر تک رگڑائی کی جائے گی. مسلمان زمینداروں میں ہندو دوستوں کی تواضع کا طریقہ یہ تھا کہ یا تو ہندو پکانے والا ملازم رکھتے تھے، یا پڑوسی ہندوؤں کی عورتوں سے پکواتے تھے. ہندو مہمان کسی مسلمان کے خاصدان سے پان بھی اٹھا کر نہ کھاتا تھا. اس قاعدے میں تاریخی حادثات کی یادوں کا عمل دخل ہو اور تھوڑی بہت نفرت بھی شامل ہو تو تعجب کی بات نہیں. مگر قدیم بیزاری کے احساسات اور ناگوار یادیں انسانی تحت الشعور میں بہت نیچے جا کر دب چکی تھیں. اب اس قاعدے کو محض ایک عادت اور رواج سمجھا جاتا تھا. ہندوستان رواجوں کا ملک ٹھہرا. مسلمانوں کو جانے دیجیے، ہندو آپس

میں بھی چھوت بر تنے کے عادی رہتے آئے ہیں. ذات پات اور اونچ نیچ کی تقسیم ہندو معاشرے کی نمایاں علامت ہے. یہ ہمیشہ رہی ہے اور زمانہ کتنا بھی جدید ہو جائے ختم ہوتی نظر نہیں آتی. مسلمانوں کو یہ اعتراض کبھی تھا بھی تو وقت گزرنے کے ساتھ ان کے دل سے جا چکا تھا کہ ہندو ہمارے گھر کی غذا اور ہمارے ہاتھ کے پانی تک سے پرہیز کرتے ہیں جب کہ ہم نہیں کرتے. مختصر یہ کہ دیہات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان رواداری کی سطح برقرار تھی اور یورپ کا تحفہ "نیشنلزم" جو بنگال میں وارد ہو کر پورے ہندوستان میں ماحولیاتی کثافت کی طرح پھیل گیا، اور جس نے نئے سرے سے منافرت کا زہر پھیلایا، ابھی دیہاتی ہندوؤں کے گھروں تک نہیں پہنچا تھا، وہ نہ اخبار کو جانتے تھے، نہ دانشوروں کی تحریریں پڑھتے ... تھے. نہ ماضی کی عظیم الشان تہذیب کا تصوّر دل میں جاگا تھا، نہ لیڈروں کی تقریروں کا زور شور کانوں میں پڑا تھا، اور نہ حب الوطنی کے اس عقیدے سے واقف ہوئے تھے. جس میں محبت کے ساتھ نفرت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے. بلکہ الٹا معاملہ تھا کہ دیہاتی ہندو شہر کے ہندو کو بیحد چالاک سمجھ کر اس سے کھٹکتا تھا اور دور رہنے میں خیریت سمجھتا تھا. دیہات کی ایک بالکل الگ دنیا تھی جس کے دروازے پر نئے حالات دستک بھی دیں تو آسانی سے دروازہ کھلنے والا نہ تھا. وہ زمانہ جنگ عظیم اوّل کے آغاز تک پوری سالمیت کے ساتھ باقی رہا. مقدم علی حسین اور ان کے ہم عصروں کی خوش نصیبی تھی کہ وہی زمانہ دیکھنے کو ملا. ان کی زندگی فارسی محاورے کا مصداق تھی: خوب گزشت.

مقدم علی حسین کی ملنساری ایک انوکھی مثال تھی اور نواح کے ہندوؤں میں ان کے اخلاق کا بہت زیادہ چرچا تھا. گوجر خاص طور سے مشکور تھے اور اپنی ہر شادی اور غمی کا بلاوا بھیجتے تھے. مشہور تھا کہ جب تک مقدم نہ پہنچیں گے. گوجر کی بیٹی شوہر کے گھر رخصت نہ ہوگی. غدر سے پہلے تو دنیا ہی اور تھی، لبعد میں بھی پہلی جنگ عظیم تک ویسی ہی کیفیت برقرار رہی. آدمی کے دل میں اپنے

ہم جنسوں سے ہمدردی کا گہرا احساس ہو تو تعصبات دور ہونے میں دیر نہیں لگتی اور انسانیت کا وسیع تصوّر اجنبیت کے فاصلے کو ذراسی دیر میں مٹادیتا ہے۔ مقدم علی حسین جیسی ہستیاں کم تھیں جنھوں نے اپنی سطح کا خیال کیے بغیر ایسے زمانے میں گوجروں سے کھلے دل کا سلوک کیا جب وہ خود بھی اس برتاؤ کی امید نہ رکھتے تھے۔ ان کا شمار جرائم پیشہ قبیلوں میں ہوتا تھا جن کے لیے 'مندرجہ فہرست' کی اصطلاح معروف ہے۔ مویشیوں کی چوری کرنا اور جمنا کے دونوں طرف پھیلے ہوئے دیہات میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہانکنا ان کی عادت اور پیشے میں داخل تھا۔ وہ مقدم کے احسان اور مہربانی کا جواب دلچسپ انداز سے دیتے تھے۔ مقدم پسند نہ کریں۔ ان کو اس بات سے کوئی مطلب نہ تھا۔ مقدم کے گھر دودھ کا خوب بندوبست رہنا چاہیے وہ منع کریں، گوجران کے کھونٹے پر بھینیں باندھ کر چلتا ہوگا۔ جب مقدم کے کھیتوں میں ہل چلاکر واپس ہوں گے تو ایک دو موٹے تازے بیل ضرور چھوڑ جائیں گے۔ ان کو مقدم کے کولھو اور ہل وغیرہ کی ضرورتوں کا یعنی کہ بے حد خیال تھا۔ دوسری بات یہ کہ مقدم کا مویشی خانہ محفوظ جگہ تھی۔ وہاں نہ کوئی انگلی اٹھائے گا نہ کسی کو گمان گزرے گا کہ مال مسروقہ ہوسکتا ہے۔ یہ سوچنا گوجروں کے ذہن سے بالکل بعید تھا کہ ان دوستانہ حرکتوں سے مقدم اپنی برادری والوں کے سامنے شرمندہ ہوتے ہیں۔

عمر عزیز تیسرے مرحلے میں داخل ہوئی تو مقدم علی حسین کو ایک خیال آیا جو ہر دین دار خصوصاً قصباتی شیعہ متاع گرانمایہ کی طرح ہمیشہ دل میں سنبھال کر رکھتا ہے۔ وہ اپنی بیوی فیاضن بیگم کو لے کر مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔ چلتے وقت اپنی پوتی رباب بانو کو بھی ساتھ لیا جو کم وبیش چار برس کی رہی ہوگی۔ دادی اور پوتی ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے پر رضامند نہ تھیں۔ میری ماں، رباب بانو کے ذہن میں سفر کی یادیں محض خوابوں کی طرح تھیں۔ قافلہ، اونٹ، گدھے اور گھوڑا گاڑیاں، ہندوستانی زائرین اونٹوں سے گھبراتے تھے، گدھوں پر

سوار ہونے میں تکلف نہ تھا، عورتوں کا قاعدہ یہ تھا کہ ایک طرف پاؤں لٹکا کر بیٹھنا پڑتا تھا، اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے اکثر گرتی پڑتی چلی جاتی تھیں، چاؤش (گدھے والے) کسی عورت کو گرتا دیکھ کر ہنسی نہ روک پاتے تھے اور یہ جملہ ان کی زبان پر عام تھا، " امّاں، زیارت قبول" عورتوں کے ساتھ بچے ہوئے تو گھوڑا گاڑی محفوظ سواری تھی۔ گنجائش والے زائر چاؤش کو ذراسی فالتو رقم دیتے تھے، وہ راستے بھر ان کی خدمت کرتا ہوا چلتا تھا۔ میری ماں، رباب بانو کے مشاہدے میں اونٹ، گدھوں کی تصویریں محفوظ رہیں اور یہ اس قدر یاد تھا کہ میں گھوڑا گاڑی کے اندر اپنی دادی کی گود میں سوتی رہتی تھی، آنکھ کھلی تو دادا کی گود میں چلی گئی کن مقامات سے گذرنا ہوا، کربلا کب پہنچے، نجف کب آیا، وہاں سے مشہد کتنے دن میں جاکر لگے، یہ تفصیلی جغرافیہ ان کی سمجھ میں بالکل نہ آیا، یاد کہاں سے رہ جاتا۔ پٹرول کے ذریعے چلنے والی گاڑیوں کا اس وقت تک وجود نہ تھا۔ کار بیسویں صدی کے آغاز میں ایجاد ضرور ہوگئی (سنہ ۱۹۰۸ء) عام استعمال کی موٹر لاری اور بس پہلی جنگ عظیم سے کچھ عرصہ بعد کی چیز ہے۔ البتہ آدمی سفر کو ایک دلچسپ تجربہ سمجھتا آیا ہے دنیا کی سیر اور عالم نوردی کا شوق اس کے دل سے کبھی نہ گیا، نہ وہ موسموں کی شدت اور فطرت کی بے رحمی سے گھبرایا، نہ وسائل کی دشواریوں نے کبھی راستہ روکا مسلمانوں میں، وہ کہیں بھی رہتے ہوں، مذہبی تقاضے کی بنا پر بلاد اسلامی کے سفر کی روایت تھی۔ دنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی سیر سپاٹا خوب ہوتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل پاسپورٹ کی پابندی نہ تھی اور نہ حکومتوں کی طرف سے روک ٹوک ہوتی تھی۔ برٹرنڈ رسل حسرت اور افسوس کے ساتھ کہتا ہے کہ پہلی عالمی جنگ نے ایک ایسی دنیا کو فنا کر دیا جس میں آدمی زیادہ آزاد تھا اور اس کی نقل و حرکت کے خلاف مصنوعی دیواریں کھڑی نہ ہوئی تھیں۔ یہی بات جرمن ادیب، اسٹیفان زوئیگ نے اپنی خود نوشت میں بیان کی ہے کہ اس نے سنہ ۱۹۱۴ء سے قبل پاسپورٹ کے بغیر کئی براعظموں کی سیر کی اور جہاں جی چاہا گھوما پھرا۔ بہت سارے ملکوں کا تماشہ دیکھا، نہ کہیں قانون کے

کے محافظوں نے پکڑا اور نہ کسی نے جاسوسی کے الزام میں تھاما۔ ایسی بیفکری اور سہولت کا زمانہ تھا جب مقدم علی حسین اور ان کی بیوی، فیاضن بیگم، اپنی پوتی رباب بانو سمیت بلادِ مقدس کی مسافرت پر نکلے اور زیارت کا ثواب حاصل کیا۔

# میر علی احسن

ہماری برادری کے لوگوں کا کچھ دن پہلے تک دستور رہا کہ جب کبھی انگریزی پڑھے لکھے افراد کا شمار ہوتا تھا تو سب سے پہلا نام میر ابوالحسن کا لیتے تھے اور دوسرا نام میر علی احسن کا لیا جاتا تھا۔ وہ مقدم علی حسین کے بیٹے تھے۔ عام طور سے نیل کی فیکٹری کے مالک بیدار مغز لوگ تھے۔ اس لیے نہیں کہ فارغ البالی اور عقل کی تیزی میں کوئی خاص تعلق ہے، یا یہ کہ خوش حال لوگ زمانے کی نبض بہتر پہچانتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو معاملہ بالکل الٹا بھی دیکھا گیا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ نیل کی تجارت کے سلسلے میں ان کا تعلق کلکتے سے ضرور رہتا تھا اور اس شہر کے حالات سے وہ خوب واقف تھے کلکتہ، یعنی ہوگلی بندر کہنا چاہیے، غدر سے پہلے انگریزوں کی تازہ بتازہ اور طرح طرح کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ غدر کے بعد ان کا دارالسلطنت بن گیا۔

مقدم علی حسین نے فیصلہ کیا کہ اپنے بیٹے کو قدیم وضع کے مدرسے میں پڑھانے کے بجائے نئی طرز کے انگریزی اسکول میں پڑھائیں گے۔ نصاب اور طور طریقوں کے معاملوں میں دونوں ادارے، بالکل الگ تھے۔ دونوں کا فرق بنیادی اعتبار سے مشرق اور مغرب کا فرق تھا اور آج تک ہے۔ مقدم علی حسین کی خواہش پر ان کے خاندانی عزیز، محمد نذیر جو انجنیر تھے، علی احسن کو اپنے ساتھ لے گئے اور اسکول میں داخل کرا دیا محمد نذیر نے اپنی نگرانی میں علی احسن کے تعلیمی مرحلے طے کرائے اور اپنے پاس رکھا، جدید تعلیم کا مقصد علوم دین کا ماہر بنانا اور روحانیت کے مدارج اعلیٰ تک پہنچانا کبھی نہیں رہا۔ مغربی تعلیم دنیا کی طرف دیکھتی ہے اور زندگی کی آسائشیں حاصل کرنا . . . .

سکھائی ہے۔ مختصر یہ کہ سرکاری نوکری پانے کی سیدھی راہ یہی تھی۔ انگریزی حکومت شروع ہونے کے بعد تمام معقول اور مناسب ملازمتیں ان ہی کو ملتی تھیں جو انگریزی زبان لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔ براہ راست سرکاری افسر بننے کے لیے تو اسکول اور کالج کا سند یافتہ ہونا بالکل ہی لازم ہو گیا تھا۔ ابتدا میں ذرا سی رعایت کی صورت تھی اور وہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے تک رہی، یعنی انگریزی لکھنے اور بولنے کی استعداد ہے تو بھی کام چل جاتا تھا اور سند پر اصرار نہ ہوتا تھا۔ ایسے لوگ بھی بیکار نہ رہتے تھے اور نوکری کا موقعہ مل جاتا تھا البتہ دیہاتی زمینداروں کی بات ہی اور تھی۔ وہ عملی مزاج کے لوگ ہوتے تھے۔ آسمان پر اڑنا ایک کام اور زمین پر مضبوط پاؤں جمانا دوسرا کام۔ ان کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگتی تھی کہ کونسا کام بہتر ہے۔ اس طبقے کا براہِ راست مطلب تحصیل اور تھانے سے نکلتا تھا۔ لہذا یہی دو، یعنی تحصیل اور تھانے کے افسر سب سے زیادہ دماغ پر چھائے رہتے تھے۔ ان دو ملازمتوں کا جواب نہ تھا۔ عرصے تک قاعدہ چلتا رہا کہ یہ ملازمتیں دلا دینا اور ان پر تقرر کرا دینا ضلع کے رؤسائے بااقتدار کی کوشش سفارش سے باہر کی بات نہ تھی۔ تقرر نائب تحصیل دار کی اسامی سے شروع ہوتا تھا۔ زمینداروں کا خلا ملا انگریز کلکٹر سے ہر وقت رہتا تھا۔ بلکہ اکثر جاڑوں میں گورنر بہادر بھی شکار کی دعوت قبول کر کے عزت بخشتے رہتے تھے۔ مقدم علی حسین کا ذاتی رسوخ کلکٹر بہادر سے نہ رہا ہو، ضلع کے رئیسوں اور بڑے مال گزاروں تک رسائی خوب تھی۔ یہی بات ہادی حسین کے لیے کہی جاسکتی ہے ضلع کے بیشتر رؤسائے محترم ان کی حیثیت کو پہچانتے تھے۔ علی احسن کی شادی ہادی حسین کی چھوٹی بہن، امداد بیگم سے ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں سرکاری ملازمت کے امکانات علی احسن کے لیے بظاہر خوب روشن تھے۔ تعلیم اور لیاقت میں بھی کوئی کسر نہ تھی۔ پھر بھی وہ اپنے باپ اور اپنی برادری کی توقعات پوری نہ کر سکے۔ دنیا میں ایسے افراد کی مثالیں اکثر مل جائیں گی جن کی تربیت کسی خاص مقصد سے ہوتی ہے، مگر حالات دوسرا فیصلہ کرتے ہیں۔

اگر میر علی احسن خود بھی اپنی سوانح لکھتے تو اس اعتراف میں تکلف نہ کرتے کہ مجھے سرکاری عہدے کا بالکل شوق نہ تھا میں نے وہ مزاج ہی نہ پایا تھا کہ گھر میں رہوں تو خواص و عوام ملاقات اور سلام کے لیے آئیں۔ باہر نکلوں تو آگے آگے ہٹو بچو کا شور ہوتا چلا جائے۔ ممکن تھا کہ میں خاندانی اثرات کے نتیجہ میں محکمہ مال یا دیوانی کا افسر نہیں تو مناسب قسم کا اہل کار بن جاتا، ترقی بھی یقیناً ہوتی۔ مگر طبیعت وہاں کے ماحول سے جلد گھبرا اٹھتی۔ یعنی تحصیل کی مال گزاری وصول کرنا اور جائدادوں سے متعلق طرح طرح کے جھگڑے نمٹانا میرے لیے معمولی وبال جان نہ تھے۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں کہ جیسا ماحول مل گیا ویسے ہی ہو گئے، اور جو کام ہاتھ آیا اسی میں جی لگنے لگا۔ میرے خمیر میں یہ گنجائش نہ تھی۔ رہ گئی دوسری، یعنی تھانے کی نوکری جو ہماری برادری میں بعد کی نسل کے اکثر لوگوں نے حاصل کی۔ وردی پہن کر خلاف قانون وارداتوں کی روک تھام میں رات دن بھاگنا، جرائم پیشہ مخلوق سے نہایت قریبی تعلق رکھنا، بے دھڑک گالیاں برسانا وہ اور بھی زیادہ واہیات کام تھا۔ انسان کو صالح کردار کبھی ذاتی مجاہدے سے، کبھی دوسروں کی تربیت سے، اور کبھی محض خداداد برکت کے طور پر ملتا ہے۔

میر علی احسن اور ان کے کنبے کی خوش حالی کا دار و مدار نیل کی فیکٹری پر تھا۔ یہ فراغت جنگ عظیم اول سے ایک دو سال پہلے تک برقرار رہی، جیسے ہی یورپ میں نیل کی مانگ ختم ہوئی شمالی ہندوستان کے بےشمار گھروں پر افلاس کا سایہ منڈلانے لگا۔ طالب علی کا خاندان بھی اس ناگوار صورت حال سے محفوظ نہ رہ سکا، بعض خاندانوں کو مفلسی نے ایسا ستایا کہ دوبارہ ابھرنا مشکل ہو گیا۔ گزر بسر کے لیے مزروعہ زمین رہ گئی، اس کے آپس میں ٹکڑے ہوتے چلے گئے۔

انگریزی تعلیم میر علی احسن کے کام ضرور آئی مگر توقعات کے مطابق جس قدر فائدہ وہ اٹھا سکتے تھے اتنا حاصل نہ ہوا۔ انھوں نے جوانی میں بمبئی کا راستہ پکڑا۔

وہاں کسی انگریز کی پرائیوٹ فرم میں کام کرنے لگے. میری معلومات مفصل نہیں ہیں. شاید سرکاری ادارہ ہو جس کا سربراہ انگریز تھا. وہاں تعمیرات سے متعلق کام ہوتا تھا. وہ انگریز کوئی دیوانہ رہا ہوگا. فائلوں میں کرنسی نوٹ رکھ کر میر علی احسن کے پاس بھیجتا تھا وہ ضرورت کے مطابق رپورٹ تیار کر کے فائل واپس کر دیتے تھے. مدتوں یہی سلسلہ چلتا رہا. آخر صاحب نے ایک دن میر علی احسن کو کمرے میں بلا کر کہا، مجھے تمہاری ایمانداری پر پورا اعتبار آ گیا، اب تک امتحان لے رہا تھا. مگر فائلوں میں کرنسی نوٹ دیکھ کر تم نے مجھ کو بتایا کیوں نہیں. میر علی احسن نے جواب دیا اول تو یہ میرے نزدیک غیر متعلق بات تھی. دوسرے میری رائے آپ کی بابت یہ تھی کہ غالباً طبیعت میں احتیاط کی کمی ہے اور فائلوں میں رقم رکھ کر بھول جاتے ہیں. آج کی ملاقات کے بعد اپنی رائے میں ترمیم کروں گا. اس پر وہ انگریز بہت ہنسا اور پھر دوستانہ تعلقات ہو گئے. یہ نوکری نہایت معقول تھی اور اس کا سلسلہ مدتوں جاری رہا. پھر گھر پر کوئی ناگزیر ضرورت پیش آئی اور میر علی احسن کو چھولس آنا پڑا. یہاں امید کے خلاف بہت دن لگ گئے اور مقامی مشغولیات نے جان نہ چھوڑی. ممکن ہے نیل کا کارخانہ بند کر کے ملبے جوڑے حساب سے نمٹنے میں دیر لگی، یا خدا جانے کیا ہوا. دوبارہ بمبئی پہنچے تو اس انگریز دوست نے کہا کہ آپ نے تاخیر کی حد کر دی، ہم نے انتظار کر کے دوسرا آدمی رکھ لیا. فی الحال دفتر میں ایک ڈرافٹ مین، کی اسامی موجود ہے، چونکہ آپ وہ کام بھی جانتے ہیں وہاں لگ جائیے، جب آپ کی پرانی جگہ خالی ہو گی اس پر ترقی مل جائے گی. میر علی احسن نے کہا، ہماری زبان میں ایک محاورہ ہے: گھوڑے پر چڑھ کر گدھے پر نہیں چڑھتے. انگریز بولا، اس قسم کا محاورہ انگریزی زبان میں بالکل نہیں ہے آپ ہمارے قومی مزاج کو جانتے ہیں. ہم خالص عملی نکتۂ نظر رکھتے ہیں، جیسا موقعہ دیکھا ویسی ہی گزر اوقات پر آمادہ ہو گئے. میر علی احسن نے انگریز کا مشورہ نہ مانا اور واپس گھر چلے آئے.

میری ماں بابا بانو کو بمبئی اسٹاک ایکسچینج کے کچھ قصے یاد تھے، جو وہ اپنے ابا

کا حوالہ دے کر سناتی تھیں۔ غالباً میر علی احسن نے تھوڑے دن اسٹاک ایکسچینج میں بھی ملازمت کی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہندوستان میں اسٹاک مارکیٹ کی بالکل ابتدا ہوئی تھی۔

میر علی احسن خاموش رہنے والے آدمی تھے۔ جیسا کہ بوڑھے آدمیوں کو عمر گذشتہ کے واقعات اور ماضی کے تجربے سنانے کی عادت ہوتی ہے۔ ان کا مزاج اس قسم کا بالکل نہ تھا۔ البتہ میری تعلیم پر شروع سے نظر رکھی۔ وہ اپنے بیٹوں کو مناسب سطح کی تعلیم نہ دلا پائے تھے، شاید اس کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ مجھے نسفیلڈ اور رین دونوں کی کتابیں دے کر انگریزی گرامر غور سے یاد کرنے کی تاکید کی۔ یہ قواعدین یا تو ان کے پاس موجود تھیں اور یا اپنی جیب سے کسی کو پیسہ دے کر میرے لیے منگوائی ہوں گی، میں پاس جاکر بیٹھتا تھا تو کبھی کبھی بیساختہ انگریزی کا کوئی جملہ بول جاتے تھے، ورنہ مجھے دیکھا اور خوش ہو گئے۔ میری بھی ان کے سامنے موضوع نکالنے اور باتیں چھیڑنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

قصباتی زمینداروں کی زندگی کا ایک خاص رویہ اور رنگ تھا۔ وہی رفتار دیہات میں کسی کمی بیشی کے بغیر آج تک باقی ہے۔ لوگ خاص طرح کے مسائل میں ہر وقت الجھے رہتے ہیں۔ وہاں اتفاقاً کوئی حد سے زیادہ ایمان دار سیدھا اور نیک پایا گیا تو وہ اس کو اپنے کسی کام کا نہیں سمجھتے اور نہ پہلے سمجھتے تھے۔ میر علی احسن کی ذات سے چھولس اور نواح کی مخلوق کا محض اتنا سا مطلب تھا کہ کلکٹر کو انگریزی میں عرضی لکھوانا، یا مقدمے کا فیصلہ پڑھوا کر سننا اور مفہوم پوچھنا ہوا تو ان کے پاس آتے تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں ضلع کی سطح پر بھی سارے سرکاری کام انگریزی میں ہوتے تھے۔ مقدمے بازی کے ہیر پھیر کی باتیں ان سے کوئی نہ پوچھتا تھا اور نہ وہ بتلا سکتے تھے۔ بس ایک کام تھا جس کے لیے برادری کی نظر میں وہ سب سے زیادہ موزوں تھے۔ مسجد کا چندہ ہمیشہ میر علی احسن کی تحویل میں رہتا تھا۔

آدمی کی زندگی میں المیہ اس وقت داخل ہوتا ہے جب وہ معاشرے میں خود کو تنہا اور اجنبی محسوس کرنے لگے۔ میرے نانا میر علی احسن کے ساتھ یہ بات نہ تھی جارچہ چھولس کے سیدوں میں ان جیسے اور ان کی جنس کے لوگ اور بھی مل جاتے تھے۔ میاں غلام رضا نام کے ایک بزرگ میر علی احسن کے گہرے دوست اور خاص الخاص رفیق تھے۔ گڑھی کی مسجد کے پاس ان کا گھر تھا۔ دونوں میں خوب باتیں ہوتی تھیں، عالم آدمی تھے، مناقب اہل بیت میں شعر بھی کہتے تھے۔ مختلف مسائل کے علاوہ علوم عجیبہ، خصوصاً علم کیمیا و سیمیا سے بہت دلچسپی تھی اور یہی موضوعات میرے نانا صاحب کو بھی پسند تھے۔ ایک دفعہ چھولس کے ڈاک خانے میں دو پیسے کا منی آرڈر آیا۔ سارے بازار میں شہرت ہوگئی۔ معلوم ہوا میاں غلام رضا نے کبھی بابو بنیے کی دوکان سے ڈیڑھ پیسے کی دال اُدھار لی تھی۔ بابو الدار بنیا تھا۔ اس کو یاد بھی نہ رہ گیا تھا۔ تمام بنیے تعریف کرتے تھے کہ میاں لوگوں کے علاوہ ایسی ایمانداری کی امید کسی اور سے نہیں ہوسکتی۔ میاں غلام رضا سادات کے کردار کی درویشی سادگی اور پاکیزگی کا قابل فخر نمونہ تھے۔ ایسے ہی بزرگوں کے دم سے ہمارے اجتماعی اخلاق کا بھرم قائم تھا۔ میر علی احسن نے ۱۹۵۴ء میں وفات پائی۔

## مرتضیٰ حسین، مکھیا، نمبردار

مرتضیٰ حسین، چھولس کے آخری مکھیا تھے۔ وہ آزادی سے پہلے، یعنی جب پنچایتی راج قائم نہ ہوا تھا، تقریباً نصف صدی تک مکھیا رہے ہوں گے۔ یہ ایک اعزازی عہدہ تھا، جس کو ہندوستانی دیہات کی صدیوں پرانی تاریخ کے ساتھ مربوط بلکہ لازم و ملزوم ادارہ سمجھنا چاہیے۔ دیہاتی زندگی کا تصوّر پچھلے زمانے میں مکھیا کے بغیر ممکن نہ تھا۔ مسلمان حکمرانوں نے اس کی افادیت کو سمجھ کر اس میں کوئی ترمیم نہیں کی اور یوں ہی رہنے دیا۔ ان کے لیے یہ تجربہ دلچسپی سے خالی نہ تھا کہ ایک شخص مکمل مستعدی سے اپنے گاؤں کے

حدود میں قانون برقرار رکھتا ہے، امن میں خلل واقع ہونے نہیں دیتا، اور مزے کی بات یہ کہ حکومت کے خزانہ سے ایک پیسہ نہیں مانگتا، انھوں نے مکھیا کے اختیارات میں اضافہ کر کے بہت سے کام اس کی صوابدید پر چھوڑ دیے اور دیہات کو ایک طرح کی خود مختاری دے دی، اس کا بدیہی فائدہ سامنے آیا۔ حکومت طرح طرح کے دردِ سر سے بچ گئی، قواعد وضوابط کے نفاذ میں سادگی برقرار رہی، پیچیدگیاں کھڑی نہ ہوئیں، اور دیہات کے انتظام پر خرچہ کم ہو گیا۔

سیاسی مفکرین کے نزدیک عوام سرکاری مداخلت سے کبھی خوش نہیں ہوتے اور ہمیشہ گھبراتے ہیں۔ دوسرے سرکاری مداخلت اکثر خزانے پر بوجھ ڈالنے کا باعث ہوتی ہے۔ مسلمان حاکم اس نکتے کو سمجھتے تھے۔ انھوں نے تقریباً سات سو برس کے طولانی عرصہ تک، بلکہ پنجاب پر غزنوی خاندان کی حکومت کو جوڑ لیجیے تو ساڑھے آٹھ سو برس ہو جاتے ہیں، اتنی طولانی مدت تک کیونکر مسلسل حکومت کی، اس کی متعدد وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ دیہاتی رعایا سرکاری گرفت سے آزاد، اور بڑی حد تک مطمئن رہتی تھی، عام حالات میں مسلمان حاکم براہ راست مداخلت سے پرہیز کرتے تھے۔ کوئی بڑا حادثہ ہو جائے تب ہی فوجدار ضروری اقدامات کرتا تھا۔

نمبردار کی ذمّہ داری مکھیا سے مختلف تھی، وہ متفرق قسم کے سرکاری مطالبات اور محصولات کی وصول یابی میں مدد کرتا تھا۔ نمبرداری پرانی چیز نہ تھی، انگریزوں کے وقت سے اس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مغلوں کے عہد میں چودھری، کروڑی، فوتہ دار، اور دیگر علاقائی نوعیت کے اعزازی عہدیدار ہوتے تھے، ایک گاؤں میں کبھی ایک سے زیادہ یعنی کئی عدد نمبردار ہوئے، ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وصولیابی مکھیا کی سپردگی میں رہے، جیسا کہ چھوس میں یہ کام مرتضیٰ حسین نے سنبھال رکھا تھا، وہ جس طرح تھانے کے اندر دُور تک مستقیم رابطہ رکھتے تھے ویسی ہی رسائی تحصیل اور دیوانی

کے عملے سے بھی تھی۔ ان کی بیٹھک میں سرکاری اہل کاروں کی رونق رہتی تھی اور وہ ان کی خاطر تواضع سے خوش ہوتے تھے۔ بستی والوں کے لیے نمبردار کی بیٹھک محض حقہ پینے اور دو گھڑی آرام کرنے کی جگہ نہ تھی، بلکہ ایک قسم کی تفریح گاہ بھی تھی، جہاں بے حد جی لگتا تھا، جیسے شہروں میں بڑے آدمیوں کے کلب ہوتے ہیں، وہاں پہنچ کر ہر طرح کی خبریں معلوم ہوجاتی تھیں اور سارے اعلانات بھی وہیں سے جاری ہوتے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ جو اچھی یا بری بات دوسروں کے کان تک پہنچانا ہو، نمبردار کی بیٹھک میں کہہ دی جائے، ذرا سی دیر میں مشہور ہوجائے گی، وہ جھوٹی افواہیں جن کو بے دھڑک پھیلانے میں بدنامی اور جھگڑے کا خطرہ تھا، اسی ترکیب سے پھیلائی جاتی تھیں۔ مثلاً کوئی شخص وہاں جاکر بیٹھا، چپکے سے فتنہ فساد کا شوشہ چھوڑا اور رفو چکر ہوگیا۔

مرتضیٰ حسین طالب علی کی نسل سے تھے۔ ان کے سارے خاندان کی رہائش گڑھی کی طرف تھی۔ وہ اپنے ملازموں اور مصاحبوں کی فوج کے ساتھ چھوٹے سے میں رہتے تھے۔ طالب علی کے خاندان کی رشتہ داری کا سلسلہ شرفائے دہلی کے ایک پرانے خاندان سے چلا آتا تھا۔ نواب امراؤ میرزا اس خاندان کے معروف بزرگ تھے۔ وہیں مرتضیٰ حسین کی شادی ہوئی تھی۔ بیوی نے زیادہ عمر نہ پائی اور جوانی میں انتقال کرگئیں، پھر انھوں نے دوسری شادی نہ کی، کوئی اولاد نہ تھی۔ کھانے کا حساب یہ تھا کہ کبھی بھتیجیوں پر مہربان ہوئے تو کسی کے گھر کہلوادیا۔ لیکن ایسا اتفاق کم ہوتا تھا۔ بھتیجے ان کی نظر میں منہ لگانے کے قابل نہ تھے۔ وہ بتیرا اپنے کھانے کا الگ انتظام رکھتے تھے، اس لیے کہ ان کے پاس مہمانوں کا میلہ سا رہتا تھا۔ ہمارے ایک خاندانی بزرگ ابن علی کا خادم جمیلہ، ان کی روٹی ہنڈیا کرتا تھا، جمیلہ کا تعلق یوں سمجھیے کہ شاہی حرم سرا والی مخلوق سے تھا جو اچھا کھانا پکاتی ہے اور اس

سے بھی زیادہ اچھا کام، یعنی ناچنا گانا خوب جانتی ہے۔ مشہور تھا کہ چھوپس میں چائے نوشی کا رواج مرتضیٰ حسین نمبردار کی بیٹھک سے شروع ہوا۔ انھوں نے اپنے کچھ مصاحبوں کو بھی چائے کا عادی بنا دیا تھا۔ وہ صبح سویرے پہنچ کر چائے کی تیاری میں لگ جاتے تھے۔ یہی معمول شام کو رہتا تھا۔

مرتضیٰ حسین صورت اور سیرت کے معاملہ میں خاندان اور برادری کسی سے مشابہت نہ رکھتے تھے۔ ظاہری کیفیت یہ کہ ان کی بے تحاشا پھیلی ہوئی ڈاڑھی شیعوں کی عموماً خشخشی ریش مبارک سے ذرا بھی میل نہ کھاتی تھی۔ اکثر لوگ کہتے تھے اور اپنے پرائے سب کا اتفاق تھا کہ ہم دنیا بھر میں گھومے پھرے، ایسی زبردست داڑھی کسی شیعہ کے چہرے پر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہی عالم انکی سیرت اور خصلت کا تھا، عموماً سادات اکہری شخصیت کے لوگ کہے جاتے ہیں، یعنی وہ اپنے احساسات کو چھپانا نہیں جانتے۔ اچھی بات ہوگی تو دل و جان سے حمایت کریں گے، بری لگی تو فوراً غصہ آجائے گا۔ مرتضیٰ حسین کو کبھی غصہ نہ آتا تھا، بستی کے بے شمار مسائل ہر وقت ان کے سامنے رہتے تھے، طرح طرح کی ردّ و قدح میں گھنٹوں جان الجھی رہتی تھی، مگر ان کی ذات میں ضبط کا عجیب کمال تھا، مثال نہ تھی کہ کسی نے مرتضیٰ حسین کو غصے میں دیکھا ہو۔ لوگوں نے مصلحت دیکھ کر اس قسم کی عمداً حرکت کی کہ ان کو مشتعل کریں اور غصہ دلائیں تو وہ کبھی ہاتھ نہ آتے تھے۔

اخلاقیات کی رو سے ضبط ایک اچھی صفت ہے۔ مگر ایسے تحمل کا آدمی جو طبیعت کے راز کا پتہ ہی نہ دے اور تلخ و شیریں ایک ساتھ خاموشی سے پی جائے، ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ مرتضیٰ حسین کوئی ایسے ویسے خطرناک آدمی نہ تھے۔ ساری نہیں تو آدھی بستی بلا مبالغہ ان سے تھر تھر کانپتی تھی، جبکہ وہ اپنے چہرے پر شکن بھی نہ آنے دیتے تھے۔

قانون مال گزاری و لگان آراضی میں پہلی بات یہ پڑھائی جاتی ہے کہ پٹواری

سرکاری مشین کا سب سے حقیر اور چھوٹا لیکن نہایت ہی خاص الخاص پرزہ ہوتا ہے اس کی اہمیت کو کبھی نہ بھولنا چاہیے۔ چھولس کا پٹواری صبح کے وقت حاضر ہوکر نمبردار مرتضیٰ حسین کو سلام کرتا تھا۔ وہ ان کے خفیہ احکامات کا وفاداری کے ساتھ پابند تھا۔ کاشت کار کھیتوں میں کچھ ہی بویا کریں، اس کا خسرہ وہی دکھائے گا جو خفیہ حکم ملا ہے۔ مطلب یہ کہ سب کو وہی محصولات ادا کرنے پڑیں گے جو نمبردار چاہیں گے۔ ان کے پڑوس میں اکثر تیلی آباد تھے اور وہ بہت خوش حال تھے اگر کسی تیلی نے خدمت کرنے میں پھرتی نہ دکھائی یا کچھ اور خطا سرزد ہو گئی تو اس کے کولھو پر کوئی اس قسم کا ٹیکس آکر پڑے گا جو تحصیل والے بھی ٹھیک سے نہیں بتلا سکتے: اس نوعیت کے سابقے تو بہت ہی ہوتے تھے کہ آب پاشی یا کوئی دوسرا مطالبہ ان لوگوں کے نام جاری ہوگیا جن کے پاس بالکل زمین نہ تھی۔ یہ غدر ہر سال چلتا تھا۔ لوگ آکر فریاد کرتے تھے تو نمبردار بہت ہی نرم اور دھیمے لہجے میں سمجھاتے تھے کہ دیکھو بھائی، حاکم کا حکم ہے ماننا پڑے گا، اس سے کون بچ سکتا ہے، فوراً ادا کرو، ورنہ قرقی آئے گی، خواہ مخواہ مصیبت کھڑی ہوگی۔ البتہ میں آئندہ ضرور معاف کرادوں گا، تحصیل میں جاکر کاغذات کا اچھی طرح معائنہ کروں گا، مجھے تمہارا بہت خیال ہے۔ فی الحال جاؤ، رقم کا انتظام کرو۔ ان کی خنک گفتگو میں وہ طلسمات تھا کہ سننے والوں کو صبر آجاتا تھا اور طبیعت ٹھنڈی ہوجاتی تھی جن لوگوں کو معلوم تھا وہ بھی نہ کہتے تھے کہ یہ نمبردار ہی کا رسید کیا ہوا تازیانہ ہے۔ یہی معاملہ دوسری مخلوق کا تھا جو قابل دست اندازی پولیس کے ذیل میں آتی تھی۔ وہ سب بھی نمبردار سے ہر وقت گھبرائے رہتے تھے۔ یہ سمجھنا سخت مشکل تھا کہ کس وقت نظر ٹیڑھی ہوجائے گی اتنا یقین سب رکھتے تھے کہ حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچنے میں دیر نہ لگے گی۔

جاڑوں کے دن آتے ہی نمبردار کی ہیئت کذائی عجیب ہوجاتی تھی اور وہ ایک مزاحیہ ڈرامہ کا کردار معلوم ہوتے تھے۔ روئی کا کنٹوپ، روئی کی شیروانی،

روئی کا پائجامہ اور پاؤں میں دو رنگ کے موزے۔ پورا سوٹ شوخ رنگ کی چھینٹ کا ہوتا تھا اور اس پر خوب صورت تسکر پارے بنے ہوئے، جو خاص ان کے درزی کی محنت اور مہارت کا کمال تھا۔ وہ عموماً شام کو ٹہلنے ٹہل کے لیے نکلتے تھے اور نیچی نظریں کیے لوگوں کے سلام کا جواب دیتے چلے جاتے تھے۔ راستے میں کسی کے بال بچوں کی خیریت پوچھ لی تو اس کا دماغ خوشی کے مارے ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا تھا۔

دیہاتی اکثر آلام روزگار کا شکار رہتا ہے اور زندگی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی۔ مستی کے باوجود محتاجی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور تنگ دستی الگ گھیرے رہتی ہے۔ یہ تو عام بات سمجھیے کہ آدمی ذراسی اذیت یا قضیئے میں پھنسا، پھر مدت میں نکل پائے گا۔ مرتضیٰ حسین بہت بڑا سہارا تھے حدیہ کہ ان کے گھر میں گھس کر ضرورت کی کوئی چیز اٹھالے جانا نہ صرف ان کے کنبے والوں کی بلکہ جملہ اہل برادری کی عام عادت تھی۔ دیہاتیوں کو حالات کی نزاکت ایسی حرکتوں پر مجبور کیے رہتی ہے جو یقینی کہ صریحاً قانون تعزیرات کی تقریباً پانچسو سے اوپر دفعات میں سے کسی ایک چھوٹی موٹی دفعہ کے ذیل میں ضرور آتی ہیں۔ گاؤں کے ماحول کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہاں خواہ مخواہ آدمی کی طبیعت قانونی انحراف کی طرف لپکتی ہے۔ گاؤں وہاں کے باشندوں کے لیے جنت ہے، آدم جنت میں بے کار بیٹھا رہے، یہ نہیں ہوسکتا۔ وہاں شخصیت کے اظہار کا معاملہ ایسی شکل اختیار کرتا ہے کہ معقول وجہ ہو یا نہ ہو، پھر بھی جی چاہتا ہے کچھ کرکے دکھانا چاہیے، ہر چہ بادا باد۔ افسوس کی بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، ذرا سا حیرت کا معاملہ اور رہ گیا۔ دیہاتی غریب بالکل نہیں جانتا کہ وہ نادانستہ طور سے ایسی حرکت کر بیٹھا ہے جس پر قانون تعزیرات کی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم ایک بھاری دفعہ بالکل عاید ہوسکتی ہے اور پولیس کو خبر ہوگئی تو پھانسے بغیر نہ چھوڑے گی۔ ایسے ہی تجاوز کے موقعوں پر، اور یہ موقعے

روزانہ کئی دفعہ آتے تھے، مرتضیٰ حسین پوری بستی کی حفاظت کے لیے مضبوط سپر بن جاتے تھے۔ ان کا وجود غریب اور مصیبت کی ماری ہوئی خلق خدا کے لیے، جن کی پریشانیاں ان کی نفسیات میں جرائم کا بیج بوتی ہیں، واقعی ایک طرح کی آسمانی رحمت اور برکت تھا۔ مرتضیٰ حسین دنیا سے گئے تو عام آدمی کی بفکری کا زمانہ چھولس سے رخصت ہوگیا۔ ان کا سال وفات ۱۹۵۷ء ہے۔

●

# غلام سبطین تپاںؔ چھولسی

غلام سبطین تپاںؔ اور ان کے تینوں بھائی، غلام حسنین، غلام ثقلین، غلام کونین احمد، کالج میں پڑھتے تھے۔ یہ جنگ عظیم اول سے نزدیک، کچھ پہلے یا بعد کی بات ہے، جب علی گڑھ محض کالج ہی تھا، یونیورسٹی نہ ہوا تھا۔ کالج کی تعلیم حاصل کرنا اس وقت تک لوگوں کی نظر میں خاص امتیاز کی بات تھی۔ کونین احمد اپنے کو چھولس کا پہلا گریجویٹ بتلاتے تھے۔ ان کا دعویٰ صحیح ماننا پڑے گا، اس لیے کہ نہ کوئی اس دعوے پر کھٹکا اور نہ کسی نے یہ کہا کہ ڈگری دکھاؤ۔ محمد حسین، ان کے باپ معقول حیثیت کے ملازم تھے، مدت تک سیشن جج کے پیشکار رہے، بعد میں تحصیلدار ہو گئے۔ انھوں نے دو عالیشان مکان بنائے، ایک زنانہ اور ایک مردانہ، جو اولاد کے کام آئے، اولاد پاکستان گئی تو دوسرے عزیز اپنی بھینس بکری سمیت ان میں گھس گئے اور جیسے ممکن ہو سکا کسٹوڈین کی ضبطی سے بچایا۔

مستی سے گزارنا چھولس کے تمام سیّدوں کی مشترکہ صفت رہی ہے ان کو اس دلیری پر فخر تھا کہ نہ مفلسی سے ڈر کر کہیں بھاگیں گے اور نہ فاقے کے ساتھ فکر کو آنے دیں گے۔ غالب علی کی نسل ان خوبیوں سے کیوں محروم رہتی۔ غالب علی کے پانچ بیٹوں

میں محمد حسین شاید سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ محمد حسین کی اولاد کو اضافی طور سے ایک خداداد صفت اور ہاتھ آئی جو اس درجے تک کسی کے پاس نظر نہ آتی تھی اور کوئی ان کی برابری نہ کرتا تھا۔ وہ سارے بھائی غیر معمولی زندہ دل واقع ہوئے تھے۔

غلام حسنین ڈاکٹر تھے، ریٹائر ہو کر آخری زمانہ وطن میں گزرا۔ تپاں کا چھولس سے باہر کہیں جی نہ لگتا تھا۔ غلام ثقلین البتہ عشرۂ محرّم کے علاوہ شاذ و نادر چکر لگاتے ہوں گے۔ یہی عادت کونین احمد کی تھی، مگر ان کا معاملہ یہ تھا کہ ذہنی طور سے زندگی بھر چھولس میں رہے۔ دنیا میں ایسے افراد ہر جگہ مل جائیں گے جن کو مجبوریاں وطن سے باہر لے گئیں، حتیٰ کہ سات سمندر پار جا کر بسنا پڑا۔ پھر بھی اس نفسیاتی کیفیت سے مفر نہیں کہ ہمیشہ وہیں رہتے ہیں جہاں پیدا ہوئے تھے۔ کونین احمد کو چھولس کی عورتوں اور مردوں کے بیشمار قصّے یاد تھے۔ مثلاً: ایک بزرگ شدید بیمار ہوئے، بیہوشی طاری ہو گئی، بچنے کی امید نہ رہی۔ ہماری برادری میں قاعدہ ہے کہ ایسے موقع پر عورتیں جمع ہو کر سورۂ یٰسین کا ورد شروع کر دیتی ہیں۔ ان کے کان میں جو یٰسین کی آواز گئی تو آہستہ آہستہ تکیے کی طرف ہاتھ بڑھایا، اور سرہانے رکھا ہوا ڈنڈا پکڑ کر زور سے گھمانا شروع کر دیا۔ اچانک پاس بیٹھی ہوئی عورتیں ڈنڈے کی زد میں آئیں اور سب گھبرا گئیں۔ اوپر سے ایک زوردار چیخ ماری: "مجھے قبرستان بھیج کر دم لیں گی۔ یہ چیلیں کہاں سے میرے پلنگ کے چاروں طرف اڑنے لگیں۔" یہ سننا تھا کہ فوراً عورتوں نے برقعے اور چادریں سنبھال کر اپنے گھروں کا راستہ لیا۔

غلام سبطین کو انگریزی زبان پر پورا عبور تھا اور نہایت قاعدے سے بولتے تھے۔ ذہین اور حاضر جواب، جس انٹرویو میں گئے ہاتھ مارا۔ سارا خاندان خوش قیافہ، وہ کچھ زیادہ ہی وجیہہ تھے۔ ابتدائی عمر میں اعلیٰ ملازمتوں کے موقعے کئی دفعہ ملے، وہ صبر سے جم کر کہیں نہ رہ پائے۔ سب ان کی قسمت پر رشک کرتے تھے کہ ایک نوکری چھوڑی اور فوراً اس سے بہتر جگہ کسی دوسرے محکمہ میں مل گئی۔ اصل بات یہ تھی کہ غلام سبطین نوکری کے لیے پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔ وہ شاعر تھے اور شاعری کی بدولت طبیعت

میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، یعنی آزادی سے پیدائشی لگاؤ اور پابندی سے پیدائشی نفرت، وہی انداز طبیعت پر غالب تھا۔

انسانی تعلقات میں تپاں کا دل آئینے کی طرح شفاف تھا۔ نہ شاعروں والی انا، نہ خودپسندی اور گھمنڈ، نہ دوسروں کے خلاف رشک و رقابت، اور نہ نصف صدی کے عرصہ میں کوئی یہ تبلا سکتا تھا کہ ان کی ذات سے ایسا فعل سرزد ہوتے دیکھا گیا جس کا مظاہرہ سیدّوں کے لیے روز کا قصہ تھا، وہ نہ کسی پر بگڑے، نہ روٹھے، نہ لڑے، اور نہ غصہ دکھانے کی نوبت آئی۔ شاعر کی حیثیت سے ان کے مزاج میں ماورائیت تو تھی، یعنی دیہاتی دنیا کے فتنہ فساد سے بلند رہنا پسند کرتے تھے۔ گاؤں کی زمین میں بلاناغہ تازہ جھگڑے اُگتے ہیں۔ وہ جھگڑوں سے دور رہتے تھے۔ خیریت یہ تھی کہ ان کے پاس اپنی زمین بالکل نہ تھی۔ دیہاتی بیگھے بسوے کے معاملے میں سیدھا نہیں ہوتا۔ جاہل بھی ہے تو پینترے بازی سے باز نہیں آئے گا۔ تپاں واقعی طور سے چالاک اور شاطر آدمی نہ تھے۔ استادی کے داؤ نہ تو جانتے تھے اور نہ کوئی ان کو مشورے کے قابل سمجھتا تھا۔ ان سے راز کی بات کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ذراسی دیر میں بھانڈا پھوٹ کر رہے گا۔ یہ سخت مشکل تھا کہ وہ کسی مجمع میں جاکر بیٹھیں اور ہر طرح کی سنجیدگی کا ماحول دل لگی میں بدلنے سے رہ جائے۔ دیہاتی کو سرکس کا گھوڑا سمجھیے، یعنی اپنے دائرے میں اچھل کود کے کمال دکھاتا ہے۔ تپاں اس اعتبار سے دیہاتی نہ تھے۔ تعلیم کا تربیت سے ناگزیر اور گہرا تعلق ہے، وہ تربیت یافتہ انسان تھے۔

مناسب طریقے سے ہنسنا ہنسانا سب کو نہیں آتا۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو خواہ مخواہ اپنی اور دوسروں کی زندگی وبالِ جان بنائے رکھتے ہیں۔ کردار کی تربیت سے آدمی کی ذات میں خاص طرح کی عادتیں پیدا ہوتی ہیں۔ خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رکھنا، کہنا چاہیے کہ نیک عادتوں کا لُبِّ لباب ہے۔ صلحِ کل،

محبت، رحم اور کرم تو بہت ہی اعلیٰ نصب العین کی باتیں ہیں۔ یہاں مطلب معمولی درجے کی اخلاقیات سے ہے جن کی سطح زمین سے زیادہ بلند نہیں ہوتی۔ آدمی اپنی انا پر لگام سخت رکھے، رعونت خشونت کی بیماریاں نہ ستائیں، نفرت اور شکایت دل میں جگہ نہ پائے، آوارہ خواہشات چور دروازے سے داخل نہ ہوں، تو طبیعت آپ ہی خوش رہے گی۔ یونانی مفکر اپی کیورس (وفات ۲۷۰ ق م) سکندر اعظم کا تقریباً ہم عصر، فلسفۂ خوش باشی کا بانی شمار ہوتا ہے، مگر اس کی تعلیم میں عیش و عشرت؛ حظِ نفس، لذت پرستی، اور دنیاوی دولت و اقتدار کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ چیزیں روح کے سکون میں خلل ڈالتی ہیں، لہٰذا ناقابل قبول ہیں، وہ سادہ زندگی کو پہلی شرط قرار دیتا ہے۔ غمِ دنیا سے کامل آزادی دوسری شرط ہے۔ جس نے یہ شرطیں پوری کریں وہ سمجھے کہ 'بیحد، بے پایاں' اور زبردست خوشی تک پہنچ گیا، جہاں زندہ رہنا اور مست رہنا مترادف الفاظ ہیں، یعنی کہ دونوں کے مفہوم میں ذرا سا بھی فرق نہیں ہے اپی کیورس کا عقیدہ منطقی طور سے دور تک وسعت کی گنجائش رکھتا ہے۔ طبیعت کو پژمردگی سے بچانا، اور ہر وقت شاداب رکھنا' اور فکروں میں ڈوبی ہوئی خلق خدا کو قہقہوں کی آسودگی بخشنا، یہ ہنر بھی اسی کے باغ کا میوہ اور اسی کے افکار کا مختصر سا ضمیمہ ہے تپاںؔ اسی فن کے ماہر تھے اور خوش معاشی کا یہی کمال ان کے حصے میں آیا تھا۔

تپاںؔ مزاحیہ شاعری کے مرد میدان تھے۔ اس زمرے کے شاعروں کی خوبی یہ ہے کہ ان کی نظر فرد اور جماعت دونوں کے مضحکہ خیز اوضاع و اطوار تک براہ راست پہنچتی ہے۔ انھوں نے جہاں نرالا ڈھنگ دیکھا بیساختہ ہنسی اڑانے میں لگ گئے زمانہ ایسی کیفیت سے کبھی خالی نہیں رہتا جو معقول لوگ پسند نہ کریں گے اور ان کا جی گھٹے گا۔ مگر مقاومت تو درکنار زبان کھولنا بھی معمولی جرات کا کام نہیں ہوتا دوسرے احتجاج اور حجّت۔ کا اثر انگیز انداز سب کے پاس ہوتا بھی نہیں ہے۔ ایسے موقعے پر مزاحیہ شاعر کی آواز ضرور بلند ہوگی اور وہ اپنا تیر نشانے پر بٹھا کر رہے گا، تپاںؔ اپنے منصب کو سمجھتے تھے اور برمحل اقدام سے تکلف نہ کرتے تھے۔ مثلاً

برادری کے کوئی بزرگ ملازمت کا عرصہ ختم کر کے باہر سے تشریف لائے۔ نہایت شریف آدمی ہیں اور سب سے محبت رکھتے ہیں، مگر اصلاح کا شوق ہے، طرح طرح کے منصوبے دماغ میں ہیں، کبھی جوش میں لہجہ سخت ہو جاتا ہے، مزاج میں طمطراق ہے، ذرا سی دھونس دینے کی عادت بھی ہے۔ تپاںؔ ان کی شان میں مختصر سی نظم یا قطعہ لازمی طور سے ارشاد فرمائیں گے اور پوری برادری ہنسے گی، ہشیار اہلِ بستی دجّال آگیا ہے۔

افراد کا تو شمار ہی کیا کہ کون مذاق کے نشتر سے بچا اور کتنے مجروح ہوئے، وہ جنتِ ارضی جس کی خاطر انھوں نے نوجوانی میں متعدد اعلیٰ ملازمتیں چھوڑیں اور ترقی کے موقع ہاتھ سے دیے، اس پر بھی مشق ناز ہوتی رہتی تھی، وطن عزیز سے محبت کا علاقہ اپنی جگہ، مذاق میں سچ بات منہ سے نکل جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ تپاںؔ نے ایک دلچسپ اور مختصر دعائے زیارت ترتیب دی تھی۔ چھولس سے سفر پر نکلے یا کچھ دن بعد باہر رہ کر واپس آئے اور ہمسفر ساتھ ہوئے تو دونوں موقعوں پر انگلی اٹھا کر زیارت ضرور پڑھی جاتی تھی۔ السلام علیک یا بستی فقیر۔ مثنوی مولانا روم پڑھنے کا ایک خاص لحن ہے، تپاںؔ کو وہ لحن یاد تھا: السلام علیک باٹیڑھی لکیر۔

ادب کے نقاد ہجو اور تمسخر کی زمین کو پھسلواں کہتے ہیں، یعنی ذرا سی بے احتیاطی قلم سے ہوئی اور آدمی بذلہ سنجی سے ابتذال کی طرف پھسلا۔ اگر شاعر ہے تو ساری کوشش شگفتگی اور شوخی کے مضبوط کسے بندھے رستے پر کرتب دکھانے اور ابتذال سے بچنے میں صرف کرتا ہے۔ اکثر پاؤں پھسل بھی جاتا ہے۔ یہی معاملہ تپاںؔ کے ساتھ تھا۔ ایک مثال کافی ہوگی۔ حکیم ریاض علی ان کے دوست تھے ایک موقعہ پر مفصل مدحیہ قصیدہ لکھ کر حکیم صاحب کو پیش کیا، تیری معجون نے بوڑھوں کو جوانی بخشی، مصرعے میں کوئی قابلِ گرفت بات نہ تھی۔ اعتراض کرنے والوں نے کہا، مصرعۂ ثانی کے ساتھ ملا کر پڑھیے تو شعر قطعی بے معنی اور مہمل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ معجون کھانے کی دوا ہوتی ہے۔ بطور لیپ لگائی نہیں جاتی۔ دوسرے مضمون صریحًا ایسا پست ہے کہ توبہ، لیپ جس رگ پہ لگا یا وہی گرمائی ہے۔

قصباتی شرفا کے معاشرے میں شاعری نہایت ضروری چیز تھی۔ ہر شخص الٹی سیدھی تک بندی کا شوق رکھتا تھا۔ بعض مقامات پر ابھی تک روایت زندہ ہے۔ جارچہ چھولس میں ایک بزم احباب قائم تھی نتیاؔن نے سب کی خبر لی اور ہجو کے وار شروع کیے۔ شاعروں نے جل کر ان کو بزم احباب سے نکال دیا۔ انھوں نے انتقام کے طور پر ہجو کہی۔ جو ایسی بددعا بن کر لگی کہ ملک تقسیم ہوا، سب شاعر چلے گئے، ایک وطن میں نہ بچا۔ جو پاکستان نہ گیا اس نے تلاش معاش میں باہر کا منہ اٹھایا۔ بزم احباب نہیں ہے یہ ٹھگوں کی ٹولی۔

مزاحیہ شعر اور مزیدار لطیفے، نتیاؔن کی ہنرمندی کے دو میدان تھے، جیسے ایک سکّے کے دو رخ ہوتے ہیں۔ تخلیقی قوت کو مساوی حصوں میں تقسیم کیے رہنا، اس طرح کہ دونوں کا وزن باون تولے پاؤ رتی برابر بیٹھے، بہت کم فنکاروں کو آتا ہے انکے نزدیک فی البدیہہ شعر کہنا یا تازہ لطیفہ سنا دینا، دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ لطیفہ سناتے وقت طرح طرح کی مضحکہ خیز شکلیں بناتے تھے اور چیخ پکار الگ، جس سے اثر دو آتشہ سہ آتشہ ہو جاتا تھا۔ لطیفے میں پوری اداکاری کا رنگ شامل ہوتا تھا۔ اگر کوئی شہرت پا گیا اور لوگوں نے دوبارہ سننے کا اشتیاق ظاہر کیا تو ٹال جاتے تھے۔ کہتے تھے شعر اور لطیفے میں فرق ہے۔ شعر ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ لطیفہ ایک دفعہ کے بعد تازگی کھو بیٹھتا ہے۔

آدمی کو زندگی کے سفر میں ساتھ چلنے والی وفادار اور محبت شعار عورت مل جائے تو درویشی میں بادشاہت کے مزے آجاتے ہیں۔ نتیاؔن اس معاملے میں خوش نصیب واقع ہوئے تھے۔ ان کی پہلی بیوی خاندان کی تھیں جو جلد ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ دو بچے عزیز السبطین اور تمیز السبطین کم عمر چھوڑے۔ دوسری بیوی نے آکر اُن کو پالا۔ کنیز سیّدہ نام تھا۔ نتیاؔن ان کو ہمیشہ شکار پور والی کہہ کر پکارتے تھے، اس کو محبت یا مذاق جو چاہے کہہ لیجیے۔ کنیز سیّدہ نے ہمدردی اور قناعت کا عجیب مزاج پایا تھا۔ گڑھی کے سیّدوں کی زندگی میں ذرا سا قبائلی رنگ ہے۔ انھوں نے آتے ہی نتیاؔن کے سارے عزیزوں کو اپنا سمجھ لیا۔ ہم جیسے بلشیار رطب و یابس بے تکلف گھس جاتے تھے۔ کنیز سیّدہ کبھی تیوری پر بل نہ لاتی تھیں کہ آخر میرا گھر ہے یا چوپال ہے۔ لڑکے انگریزی پڑھنے جاتے تھے، بڑے بوڑھے لوگ حقّے کی تاک میں یا محض وقت گزاری کرنے، لطیفے اور شعر سننے پہنچتے تھے۔ کنیز کو ذرا ناگوار نہ گزرتا تھا کہ یہ غیر ضروری ہجوم کیوں جمع رہتا ہے۔ ستم کی بات یہ کہ کنیز سیّدہ خود بھی لطیفوں کی زد سے محفوظ اور مستثنیٰ نہ تھیں۔ ویسے تو نتیاؔن اصول کے مطابق لطیفے کی تکرار کے قائل نہ تھے، لیکن ایک لطیفہ کنیز والا ایسا تھا جو مکرر بیان ہوتا رہتا تھا: "میں گیارہ روپیہ

جیب میں ڈال کر جھولس سے شکارپور کے لیے روانہ ہوا۔ اور دادی اصغری کے گھر جاکر ٹھہرا۔ میری شہرت مجھ سے پہلے ہی شکارپور پہنچ چکی تھی کہ روزگار سے مطلب نہیں، ایک پیسہ نہیں کماتا، بیکار اور قلاش آدمی ہے، شاعری کرتا ہے۔ دادی اصغری نے چپکے سے جہاں بھی حساب لگایا انکار ہوا۔ آخر ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے کمرے کے کواڑ بند کرکے پتھر کی سِل پر گیارہ روپے زور سے تال کے ساتھ بجانا شروع کیے۔ عورتوں نے کان لگا کر چھناچھن کی آواز سنی اور پورے شکارپور میں گھر گھر جاکر خبر پھیلادی کہ جھولس والا ہزاروں روپے لایا ہے۔ صبح سے دوپہر ہوگئی، ابھی تک گن رہا ہے۔ ماشاء اللہ اسی شب میرا نکاح ہوگیا، گیارہ روپے میں ہانک لایا۔" اس پر قہقہے بلند ہوتے تھے۔ کنیز سیدہ منہ میں پان دبائے مسکراتی رہتی تھیں، نہ تردید، نہ تلخی، نہ شکایت، بلکہ ہلکی سی مسلسل ہنسی سے الٹا یہ تاثر دیتی تھیں کہ واقعی تیاآن صاحب بالکل صحیح فرمارہے ہیں۔

قریبی عزیزوں نے تیاآن کی مستی اور بے فکری کا ایک علاج سوچا کہ بچوں کو انگریزی پڑھانے لگیں تو کچھ وقت ٹھکانے کا کٹے گا۔ شاید کچھ پیسے بھی جیب میں آنے لگیں اور نہ آئیں تو مطلب مشغلے سے ہے۔ اوّل تو وہ راضی نہ ہوئے، بڑی مشکل سے آمادگی ظاہر کی مگر شرط یہ رکھی کہ جہاں جی لگے گا وہیں پڑھاؤں گا، کبھی اپنے گھر پر، اکثر و بیشتر مختلف باغوں میں درختوں کے نیچے، غرضکہ تیاآن کا اسکول ہمیشہ گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ وہ سیدوں کے بچوں سے ایک پیسے کی امید نہ رکھتے تھے۔ نواحی گاؤں کے جاٹ اپنے بچوں کو انگریزی پڑھانے کے شوقین تھے۔ ان سے کچھ رقم مل جاتی ہوگی مگر وہ برائے نام تھی۔ سیدوں کی عادت تھی کہ اولاد کی تعلیم پر خرچ کرنا قطعی فالتو مد اور فضول خرچی سمجھتے تھے، وہ سید جو بااستطاعت تھے، مثلاً میرے باپ، ان کا بھی یہی قاعدہ تھا اور بہت زیادہ پروا نہ تھی۔ البتہ میری رعایت کا ایک مضبوط جواز ادر نکل آیا۔ میری ماں رباب بانو کا سلسلہ براہ راست طالب علی کی نسل سے ملتا تھا۔ تیاآن ان کو اپنی بھتیجی اور مجھے نواسہ شمار کرتے تھے۔ میں مفت پڑھنے کا مستحق

ہوگیا، کون دے اور کون لے۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ ذرا سا مشکل تھا۔ باقاعدگی اور پابندی سے محنت کرا کے کئی سال کا ابتدائی کورس سال بھر میں نمٹا دیتے تھے جو بچّہ ان کی ہدایت اور طریقہ کار کے مطابق چلا وہی فائدہ اٹھا پاتا تھا۔ وہ ایک سال میں صحیح انگریزی کا جملہ لکھنا اور صحیح بولنا سکھا دیتے تھے۔

پاکستان بنا اور مہاجرت شروع ہوئی تو تپاں اپنی اولاد سمیت کراچی کے بجائے داتا گنج بخش کے شہر میں جا کر پناہ گزین ہو گئے۔ اولاد کے لیے ترکہ ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ علم کا ورثہ دور تک جاتا ہے۔ وہ انگریزی ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ تپاں کی وراثت کا حصّہ دار خاکسار بھی ہے۔

•

تپاں کے بزرگوں کو مسعود الحسن کا تذکرۃ الانساب جارچے میں شامل دکھاتا ہے مجموعی طور سے وہاں چار ایسی مثالیں نظر آتی ہیں۔ غلام علی کا خاندان۔ ۲۔ سید خانی ۳۔ چراغ علی کا خاندان اور ۴۔ حمزہ علی کا خاندان جو اوپر بندگی معظم سے مل جاتا ہے شجرے کی ترتیب میں سہو کی طرف گمان جاتا ہے، اس لیے کہ مندرجہ تین خاندانوں کا تعلق چھولس والی شاخ سے براہ راست واضح ہے۔ حمزہ علی کا خاندان ضرور جارچے سے آکر آباد ہوا۔ نقل مکانی کی یک طرفہ ٹریفک کو درست مان لیا جائے تو کئی اسباب سمجھ میں آتے ہیں۔ ۱۔ ازدواجی تعلق، جارچہ وطن تھا۔ چھولس میں شادی ہوگئی ۲۔ میراث، چھولس میں میراث کا حق پایا۔ جارچے سے وہاں پہنچ گئے۔ ۳۔ خاندانی مناقشہ، کنبے والوں سے بدمزگی ہوئی۔ چھولس کا رخ اختیار کر گئے۔ ۴، خواہ مخواہ، پڑوسیوں کو حیرت میں ڈالنا، علی الصبح دل میں طے کیا جارچے سے مطلب ختم، چھولس میں چل کر رہیں گے اور بال بچوں کی انگلی پکڑ کے اندھیرے میں جارچے سے چل دیئے۔

•

حمزہ علی کی نسل میں، بندگی معظم کے سلسلے سے مربوط، ملک کی تقسیم کے وقت چھولس میں تین بھائی تھے۔ آغا حسین اور مقبول حسین پاکستان چلے گئے، حاجی تجمل حسین چھولس میں رہ

گئے۔ تجمل حسین حاجی نہ تھے۔ عام شیعوں کی طرح کربلا کی زیارت بھی نہ کی تھی۔ ہماری برادری میں قاعدہ ہے، غالباً پرانی ایران کی روایت ابھی برقرار چلی آرہی ہے۔ کہ کسی آدمی کو ضرورت سے زیادہ نیاز مند، سیدھا اور نیک دیکھا تو رحم کھا کر اس کو حاجی کہنے لگتے ہیں۔ حاجی تجمل کے پاس تھوڑی سی زمین تھی۔ آخری دور میں مطب کھول بیٹھے۔ مریض ٹہلتا تھا کہ حقّے کا دور ختم ہو تو تنہائی میں عرض حال کرے۔ لوگ کیوں ہلنے لگے تھے۔ حقہ پینے والوں نے حاجی تجمّل کا مطب بند کرا دیا۔

•

اعظم حسین، قیوم حسین اور اہل بیت حسین آپس میں سگے بھائی تھے۔ اہل بیت حسین کا ذکر تبرکاً یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ نسل جس نے اپنے بچپن میں ان کو بالکل بوڑھا دیکھا، اب خود بڑھاپے کے دور میں داخل ہو چکی ہے، ان کا قد لمبا اور ہڈی چوڑی تھی ستر سے متجاوز عمر، چہرے پر جھرّیاں برائے نام، رنگ میں سرخی برقرار، اور خشخشی داڑھی، پہلی دفعہ دیکھنے والے اُن کے قیافے کی دل کشی کے قائل ہو جاتے تھے۔ ایک بارات میں جانا ہوا، ان کے تعارف کی نوبت آئی تو انکسار سے کہا فقیر کا جھونپڑا چھوس۔ محفل پر خاموشی چھا گئی۔ واقعہ یہ تھا کہ ان کے پاس مختصر آراضی تھی۔ آج اردو زبان بہت سی اصطلاحوں سے اجنبی ہو چکی ہے۔ پرانے لوگ رخصت ہوئے، ان کے ساتھ بہت سے مروجہ الفاظ بھی گئے اور وہ انداز گفتگو بھی گیا۔ زمیندار اپنی گڑھی کو اور اپنے قلعوں کے اندر بنے ہوئے شاندار محلات کو ہمیشہ "فقیر کا جھونپڑا" کہتے تھے، عام شرفا میں غریب خانہ کہنے کا رواج تھا۔ مستقبل میں ہماری زبان جیسے صنعتی اور کاروباری ہوتی جائے گی، بعض قدیم اصطلاحیں لغت میں بھی نہ ملیں گی۔

•

دانش مندوں کا قول ہے کہ قلمی تعارف لکھتے وقت مبالغہ اور محبت، دونوں کو دور رکھنا چاہیے، ورنہ تصویر صاف نہ بنے گی اور مرقع نگاری پر حرف آنے کا اندیشہ ہے۔ انتظام علی نام کے ایک بزرگ کا خیال ذہن میں آیا تو یہ تاکید یاد آ گئی۔ انتظام علی

رعب دار وجود اور بھاری جسامت کے آدمی تھے۔ ڈاڑھی اور سر پر مہندی کا خضاب اس قدر زیادہ لگاتے تھے کہ مرکزی ایشیا میں رہنے والی سرخ پوست قوم کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ غدر کے بعد انتظام علی کے خاندان کی ملکیت میں کسی طرح بٹیہ نام کا ایک گاؤں شاہدرہ دہلی کے پاس بچ رہا تھا۔ خاندان والے مل کر اس جائیداد کو وقتاً فوقتاً کھسکاتے رہے۔ انتظام علی کو بالکل احساس نہ تھا اور نہ کسی کو دریافت کرنے کی ہمت ہوتی تھی کہ ان کی طبیعت میں عیش اور بیفکری کی عادت کون سے دروازے سے داخل ہوئی ہے۔

•

# منشی محمد رفیع، قمر الزماں سبزواری

منشی محمد رفیع فاضل آدمی تھے، موسیقی کا ذوق تھا، سوزخوانی کے فن اور اس کے دقائق پر کامل دسترس حاصل تھی۔

محمد رفیع پیدا ہوئے اور ہوش سنبھالا تو جارچہ چھولس کے سیدوں میں علمی روایت زندہ تھی، اور سادات کی بابت عام تصوّر تھا کہ علم کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ محمد رفیع کے بزرگوں میں، جیسا کہ ان کا شجرہ واضح کرتا ہے، کئی پشت سے علم کا چرچا اور چلن تھا۔ ایسے گھر میں آنکھ کھولنے والے بچے کے لیے علمی شغف میں لگ جانا فطری بات تھی۔ مغلوں کے آخری دور میں سیاسی زوال ہوا لیکن تہذیبی سرگرمیاں برقرار رہیں۔ علمی مشاغل اور کتابوں سے دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ غدر کے کچھ دنوں بعد تک شرفا کے ایسے خاندانوں میں جو مکمل تباہی سے بچے رہے، کم و بیش یہی صورت حال نظر آتی ہے۔

جارچہ چھولس کا دہلی سے نزدیک ہونا بہتری سے خالی نہ تھا۔ وہ شہر دارالسلطنت ہونے کے علاوہ اہل علم کا قدیم مسکن تھا۔ وہاں ہر میدان کے ماہر اور ہر شعبے کے دانشمند مل جاتے تھے۔

دلی اجڑی، اور لکھنؤ نے رونق پکڑی تو ہمارے وطن کے حوصلہ مند نونہال" صریحی ثبوت کے مطابق، آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ تک پڑھنے گئے۔ غرضکہ علم کی طلب اور سینے کو روشن رکھنے کا شوق سادات کی امتیازی علامت تھی۔ جارچہ چھولس کے اکثر سیدزادے افتاں خیزاں اس روایت پر چلتے تھے اور راہ گم نہ ہوئی تھی۔ محمد رفیع اسی ردیف میں آتے ہیں۔

ہندوستان کے مدرسوں میں معقولات کا نصاب اس نوعیت کا تھا کہ شیعہ اور سُنّی ایک ساتھ پڑھ سکتے تھے۔ علوم عقلی کی معیاری کتابیں، یعنی جو کہ فلسفہ، منطق، کلام، الٰہیات، اخلاقیات سے متعلق تھیں دونوں کے لیے یکساں تھیں اور انکے مصنفین میں بھی کوئی شیعہ تھا کوئی سُنّی تھا۔ منقولات میں پہنچ کر خاص طور سے علم اسماءُ الرّجال، تفسیر، فقہ، اور عقائد ایسے موضوعات تھے کہ جہاں راہیں بدل جاتی تھیں۔ یہ اعلیٰ درسیات اور منتہیانہ مدارج کا معاملہ تھا۔ ہندوستانی مدرسوں پر اضافی ذمہ داری یہ آپڑی تھی کہ ان کو حکومت کا پہیّہ گھمانے کے لیے چھوٹے بڑے عہدیدار تیار کرنے پڑتے تھے۔ جب تک مسلمانوں کے پاس حکومت رہی بلکہ اس سے ساٹھ ستر برس بعد، گویا کہ کل پرسوں تک مدرسے یہ ذمہ داری انجام دیتے رہے۔ عملی مجبوری اور تقاضے کے پیش نظر اساتذہ یہ ترکیب کرتے تھے کہ شاگردوں کو عربی کی ذراسی مبادیات سے آشنا کرایا اور پھر علوم کے اعلیٰ مراحل سے بچاکر بشیتر کو فارسی کی طرف لے آتے تھے۔ ہندوستانی مسلمان کی مادری زبان تو فارسی رہ نہیں گئی تھی، اکتسابی زبان تھی۔ مدرسوں کے اساتذہ کی کوشش تھی کہ وہ چیز بتائی سکھائی چاہیے جس کی بدولت شاگرد قلم کا پکّا ہو جائے۔ لہٰذا نصاب میں علم انشا سب سے اہم مضمون تھا اور انشا کی نصابی کتابوں کو اساتذہ محنت سے پڑھاتے تھے۔ وہ نسل ابھی زندہ ہے اگرچہ لب بام ہے، جس نے اپنے بزرگوں کی زبان سے انشائے خلیفہ، انشائے مادھورام، اور مفید الانشا قسم کی کتابوں کے نام ضرور سنے ہوں گے۔ مغل حکومت کی سرکاری دستاویزات کے صرف نام ہی شمار کر لیے جائیں تو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ استاد

اپنے شاگردوں کو منشی کے درجے تک لے جانے کے لیے اور پکا منشی بنانے کے لیے کس قدر متفرق چیزیں ان کے مغز میں اتارتے تھے۔ مثلاً بعض دستاویزات کے نام ملاحظہ ہوں: فرمان، حسب الحکم، پروانہ، مچلکہ، دستک، تمسک، نشان، یادداشت مظہر، طومار، سند، روزنامچہ، شقہ، رقعہ، سیاہہ، روبکاری، پٹہ قبولیت، پٹہ تشخیص دیہات، یادداشت جاگیرداران، یادداشت پیش کش وغیرہ۔ یہ دستاویزیں لکھنا تو درکنار، ان کی پوشیدہ نزاکتوں کو سمجھنا بھی عام اور معمولی پڑھے لکھے آدمی کے بس کی بات نہ تھی یہ "منشیانِ عظام" کا امتیاز خاص تھا۔ اجارہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ سیاق نامے اور دستور العمل کے رسالے بھی منشیوں کی دسترس سے باہر نہ رہتے تھے۔ مورخین اکثر شیخ ابوالفضل کو "منشی زبردست" کہہ کر یاد کرتے ہیں اور یہی لقب بعض اوقات سعد اللہ سیال کوٹی کے لیے استعمال ہوا ہے جو شاہجہاں کا وزیر اعظم رہا تھا۔ انشا کی کتابوں میں زمانۂ گزشتہ کی معروف ہستیوں کے خطوط اور تحریروں کو بھی نمونے کے طور پر محفوظ رکھا جاتا تھا تاکہ ان کی مدد سے اسالیب سیکھنے میں آسانی ہو۔ محمد رفیع طالب علم کی حیثیت سے مدرسے میں پڑھنے پہنچے تو وہاں کا یہ ماحول برقرار تھا اور اس میں کوئی تغیّر واقع نہ ہوا تھا۔ وہ فارغ التحصیل ہوکر نکلے تو منشی بن چکے تھے۔

محمد رفیع کے پاس تھوڑی سی زمینداری تھی جو ان کی کفالت کے لیے کافی تھی دوسرے، غدر کے انقلاب اور حکومت کی تبدیلی نے پرانی تربیت کے منشیوں کو از کار رفتہ بنا دیا تھا اور سرکاری دستگاہ میں ترقی کے وہ موقعے نہ چھوڑے تھے جو پہلے ہوا کرتے تھے۔ محمد رفیع روزگار کے مقصد سے بہت کم باہر نکلے ہوں گے۔ انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ چھپولس میں گذارا۔ وہ اس نکتے کو ضرور سمجھتے تھے کہ علم ابلاغ چاہتا ہے اور مداولت سے تازہ رہتا ہے۔ جب نئی سرکار نے ابتدائی مدرسوں کا جال پھیلایا اور ان سے کہا گیا تو وہ چھپولس کے مدرسے میں پڑھانے لگے۔ قدیم رواج کے مطابق وہ بغیر کوئی مشاہرہ طلب کیے گھر پر بھی درس دیتے تھے۔ کوئی علم کا شائق فرصت کے اوقات حتیٰ کہ رات کو بھی آ گیا تو عذر اور تکلف نہ تھا، ورنہ مزے سے بیٹھے

حقہ پیتے تھے۔

محمد رفیع ذاتی تجربے اور تشخیص سے جانتے تھے کہ موسیقی کو سحر حلال کہیئے یا روحانی غذا بتایئے، دونوں دعوے درست ہیں۔ اتفاقاً وہ خوش گلو واقع ہوئے تھے۔ الف لیلیٰ کی مشہور کہانی ہے کہ ایک درویش کی کمر سے کمبل چپک گیا اور کبھی نہ چھوٹا۔ آدمی خوش آواز ہے تو یہی مسئلہ راگ راگنی کا ہوتا ہے اس کے بس کی بات نہیں رہ جاتی کہ سرگم کی دل کشی سے طبیعت کو بچا کر رکھ سکے۔ مسلمان ہمیشہ موسیقی کے معاملہ میں عجیب طرح کی دشواری سے روبرو رہے اور سراسر مخمصے میں پھنسے رہے۔ فقہ نے غنا کو ممنوعات کے خانے میں رکھ دیا۔ اس کی غایت لعب لہٰذا حرام۔ مگر ان کا تہذیبی مذاق ایسے لطیف فن کو بالکل چھوڑنے کے لیئے کبھی آمادہ نہ ہوا۔ فارابی اور ابن سینا موسیقی کو تعلیمی نصاب کا لازمی جز قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل ہے کہ نغمے سے انسانی شخصیت میں فروغ اور بالیدگی آتی ہے۔ امام غزالی کیمیائے سعادت میں موسیقی پر علیٰحدہ باب قائم کرتے ہیں۔ بحث کا انداز ایسا ہے کہ پہلی دفعہ پڑھنے سے سمجھ میں نہ آئے گا اور دوسری دفعہ پڑھنے کو جی نہ چاہے گا۔ فلسفے کی دنیا میں یہ تعجب کی بات نہیں جرمن فلسفی کانٹ کا بھی یہی حال ہے۔ صوفیائے کرام نے زمزمے اور سرود کو اپنے معمولات سے خارج نہ ہونے دیا۔ وہاں سماع کے عنوان سے سلسلہ برابر جاری رہا۔ ہندوستانی برصغیر میں مسلمانوں کو صدیوں تک عیش اور دولت کی فراوانی میسر آئی۔ وہ نغمہ و سرود کے زبردست شیدائی اور مربی بن گئے۔ دوسرے، ہندوستان کے کلاسیکی سنگیت کی تاثیر ایسے طلساتی سمندر کی سی ہے، ایک بحر ناپیدا کنار، جو کودنے اور ڈوب جانے کے لیے پکارتا ہے۔ جس نے آواز سن لی وہ واقعی کود پڑتا ہے اور ڈوب جاتا ہے۔ ہندوستانی موسیقی کے بنیادی عناصر ترکیبی، تین کرم، سات سُر، چار مورچھا، چھ راگ، چھتیس راگنی، ترلیشٹھ النکار، اور ایک سو آٹھ آٹھ تال پر مشتمل ہیں (لعل محمد برنی: موج موسیقی) یہاں سے تقسیم در تقسیم اور شاخ در شاخ کا سلسلہ لاانتہا ہی چلتا ہے جو آخر کار تین لاکھ سترہ ہزار نو سو تیس ۳،۱۷،۹۳۰ تال پر جا کر ختم ہوتا ہے یہی حال رقص کا ہے، بانوے قسم کے رقص ہیں۔ ان بے شمار راگ راگنیوں میں بعض اس قدر

مشکل ہیں کہ ان کا گانے والا صدیوں میں اتفاق سے ایک پیدا ہوتا ہے۔ یہ میاں تان سین کے سلسلے میں شیخ ابوالفضل کا قول ہے۔ شیخ کہتا ہے کہ ایسا نابغہ روزگار سینکڑوں برس سے پیدا نہ ہوا تھا۔ مثال کے طور پر دیپک راگ کو لیجیے۔ خدا جانے کہاں تک سچ، سخن عام ہی سہی، کہا یہ جاتا ہے کہ دیپک گانے والا راگ کے اختتام تک اپنی ہستی کو شعلہ بنا کر پھونک چکا ہوتا ہے۔ روایت چلی آتی ہے کہ جنگل میں ایک پرندہ ہے، قدرت کی طرف سے دیپک کا علم بس اسی کو عطا ہوا ہے۔ وہ گانے سے قبل تنکے جمع کر کے ان پر بیٹھتا ہے۔ راگ کے شعلے اٹھتے ہیں اور وہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ میاں تان سین کی بابت کہتے ہیں کہ لوگوں نے ان سے دیپک گانے کا اصرار کیا۔ رفتہ رفتہ یہ بات اکبر کے کان تک پہونچی، بادشاہ کو بھی شوق پیدا ہوا۔ میاں تان سین آدھی رات گئے جمنا میں اترے اور راگ چھیڑ دیا۔ جیسے ہی تانیں بلند ہوئیں گلے سے شعلے لپکنے لگے۔ خدائی نے تماشا دیکھا کہ لہروں کے اوپر چراغ ناچ رہے ہیں۔ اور ملاحوں نے دور سے غل مچایا کہ جمنا جی میں آگ لگ گئی۔ اندھیرے میں کھڑے ہوئے کوہ پیکر ہاتھی کی ہودج سے ایک بھاری آواز گونجی کہ میاں تان سین مرحبا، ہم نے دیپک سن لیا۔

مسلمانوں کے فنِ موسیقی میں بارہ[۱۲] مقام، چوبیس[۲۴] شعبہ، چھ آوازہ اور ایک سو چوالیس پردوں کو بنیادی عناصر ترکیبی مانا گیا ہے۔ مقامات کے نام ہیں: راست[۱]، اصفہان[۲]، عراق[۳]، کوچک[۴]، بزرگ[۵]، حجاز[۶]، بوسلیک[۷]، عشاق[۸]، نوا[۹]، حسینی[۱۰]، زنگولہ[۱۱] اور رہاوی[۱۲]، علم الحان کے استادوں نے مختلف جانوروں اور پرندوں کی آوازیں سن کر مقامات تشکیل دیے ہیں۔ مثلاً راست کا آہنگ ہاتھی، حجاز بارہ سنگھا، اصفہان کھیٹر، عراق گائے، نوا بلبل، زنگولہ اونٹ، بوسلیک شیر کی آواز سے مستعار ہے، واللہ اعلم۔ موسیقی کے مندرجہ بالا تمام مقامات کا رشتہ بارہ بروج فلکی سے جوڑ کھاتا ہے جن کے اندر کواکب: شمس، قمر، مریخ، زحل وغیرہ مسلسل گردش کرتے رہتے ہیں۔ دن اور رات میں ہر مقام کے گانے کا جداگانہ وقت مقرر ہے، صبح حسینی، چاشتگاہ، بوسلیک، وقت پیشین عشاق، میانِ ہر دو نماز حجاز، نیم شب کوچک، آخر شب نوا

وغیرہ، یہی تعلق مقامات کا سال کے موسموں کے ساتھ ہے۔ بہار گرما خزاں سرما، چاروں فصلوں کے مقامات علیحدہ ہیں۔ وہ مقام جو بہار میں دل کو اچھا لگتا ہے۔ خزاں میں نہیں گایا جاتا۔ انسانی طبیعت سے قریبی مناسبت کی بنا پر مزاج میں اعتدال برقرار رکھنے کے لیے حتیٰ کہ بیماریوں کے علاج میں بھی مقامات کی مدد تیر بہدف ثابت ہوتی ہے۔ بخار کے مریض کو یہ مقام گا کر سنائیے، کھانسی کی شکایت ہوگئی تو وہ مقام گائیے۔ سو فی صدی صحت بخشے گا۔ عورت دردِ زہ میں مبتلا ہے تو فلاں مقام کا آہنگ سنتے ہی وضع حمل میں آسانی ہو جائے گی وغیرہ۔ افراد مزاج کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے، لازمی طور سے زید کو ایک مقام سے جو کیف حاصل ہوگا وہ بکر کو حاصل نہ ہوگا۔ تجربے کی رو سے سرخ مو و ازرق چشم راست و عراق پسند کرتے ہیں گندم گوں آدمی رہاوی کے آہنگ سے مست ہو جاتا ہے۔ لاغر کے لیے حسینی کا نشاط جواب نہیں رکھتا وغیرہ۔ اوقات اور فصلوں کا تصور ہندی راگوں میں بھی تاکید کے ساتھ پایا جاتا ہے: للت صبح، سارنگ دوپہر، ملتان سہ پہر، پوروی سرشام، اور بہاگ خاص طور سے شب کے راگ شمار ہوتے ہیں۔ دنیا کی تہذیبوں میں انتقال و اکتساب کی مثالیں عام اور متعدد مل جائیں گی۔ یہ بھی ایک دلچسپ مثال ہے، مسلمانوں کو موسیقی کا اس لیے بھی قائل ہونا پڑا کہ ان کی ایک قدیم روایت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے سارے انبیائے اولوالعزم کا دستور تھا کہ خدا سے مناجات کرتے وقت کوئی مناسب سرود گاتے تھے۔ اس طرح راست، اصفہان، عراق، عشاق، نوا، حسینی وغیرہ ہر مقام کسی پیغمبر کے نام کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت مقصد سے خالی نہیں۔ اس روایت نے فقہا کا رویہ ڈھیلا اور نرم نہ کیا ہو۔ عامۃ المسلمین کو ضرور متاثر کیا۔ ایسی ہی ایک روایت اور ہے جس کا اثر پڑنا لازم اور ناگزیر تھا۔ خدائے رحیم و کریم نے روحیں پیدا کیں اور ہر روح کو اس کا قالب دکھایا۔ مگر روحوں نے بالاتفاق اپنے قالبوں میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ قالب میں داخل ہونے کا مطلب دنیا میں جانے کی رضامندی۔ روحوں کا اعتراض تھا کہ ہزاروں

پریشانیوں میں پھنسنے کے لیے ہم نہ جائیں گے۔ خدائے رحیم وکریم کی رحمت جوش میں آگئی۔ چپکے سے کچھ فرشتوں کو بلا کر حکم دیا، کوئی نغمہ گاؤ جو بہت ہی شیریں اور دلنواز ہو، فرشتے گانے لگے۔ روحوں پر ایسا وجد و سرور طاری ہوا کہ سب جلدی سے اُڑ کر اپنے قالبوں میں داخل ہوگئیں۔ شیخ علی ابن عثمان ہجویری کشف المحجوب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ جنت میں ہوا چلے گی اور طوبیٰ کے پتے کھڑکھڑائیں گے تو ان سے نہایت وجد آفریں نغمہ برآمد ہوگا جسے سن کر اہل جنت دائمی انبساط میں ڈوب جائیں گے۔ اس قسم کی متفرق روایتوں سے ایک شہادت ضرور واضح ہو جاتی ہے۔ مسلمان فارابی اور ابن سینا کی تعلیم کو نہ بھولے اور موسیقی سے ان کا ارتباط برابر قائم رہا۔ ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ علماء کے طبقے میں موسیقی کا فن اجنبی چیز نہ تھا اور وہ اس کی باریکیوں سے واقف تھے۔ یحییٰ کابلی، لہجات سکندر شاہی کا مولف، سلطان سکندر لودی کے دربار میں علماء و فضلاء کے حلقے میں بیٹھتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی عہد اکبری کا مورخ جس کے تعصب اور تنگ نظری پر ہنسی آتی ہے۔ بادشاہ کے ائمہ سبعہ میں ملازم تھا اور ہفتے میں ایک دن کی، غالباً بدھ کی، نماز باجماعت پڑھانا اس کے ذمے تھی۔ شیخ فیضی کی سفارش سے نوکری ملی تھی، فیضی نے سفارشی خط میں جہاں بدایونی کے علم و فضل کی تعریفیں کیں، وہاں یہ بھی لکھا کہ جہاں پناہ، یہ ملا بین بہت اچھی بجاتا ہے۔ جہانگیر کے دور میں ملا عبدالسلام لاہوری معروف عالم تھے اور فن موسیقی کے ماہر بھی سمجھے جاتے تھے۔ یہ روایت تسلسل کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ مغلوں کے آخری دور میں نغمے کا فن ارباب نشاط کے پاس چلا جاتا ہے، پھر بھی اس کے علمی وقار میں فرق نہیں آتا۔ شاہ سعداللہ گلشن، محمد شاہ کے معاصر، دہلی کے آخری بڑے صوفی ہیں۔ وہ عالم بھی ہیں اور عارف بھی ہیں اور موسیقی کے کمال کا یہ عالم کہ امیر خسرو ثانی کہلاتے ہیں۔ شیعہ علماء کا تذکرہ "دُرِّ بے بہا" ایسے اشاروں سے خالی نہیں ہے، کہ لکھنؤ کے مجتہدین موسیقی کے اصولوں سے ناآشنا نہ تھے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں حیدر جان طوائف مایۂ ناز گانے والی تھی، غدر کے بعد لکھنؤ چھوڑ کر ٹینہ چلی گئی اس نے موسیقی کی تعلیم ایک ثقہ عالم سے حاصل کی تھی جو تقویٰ سے آراستہ اور پرہیزگار

انسان تھے۔ مغل عہد میں اس فن پر مسلسل کتابیں لکھی گئیں اور سنسکرت ماخذوں سے ترجے کا سلسلہ الگ جاری رہا۔ یہ بھی فن کے ساتھ سنجیدہ طبقے کی وابستگی اور دلچسپی کا محکم ثبوت ہے۔ محمد رفیع خوش نصیب تھے کہ انھوں نے پرانے باکمالوں سے استفادہ کیا اور وہ زمانہ دیکھا جب ایک مکمل تعلیم یافتہ آدمی کے لیے نغمہ وسرود تک رسائی لازمی سمجھی جاتی تھی۔

سوز خوانی محمد رفیع کا اصلی میدان تھا۔ وہ ایک معروف اور ماہر سوز خواں تھے۔ ہندوستانی شیعوں نے یہاں کے معاشرے میں مروّج نغمہ اور شاعری کی روایات سے خوب فائدہ اٹھایا اور خاص طور سے اعتنا کی۔ تحت اللفظ مرثیہ خوانی اور سوز خوانی دونوں تعمیری اور تخلیقی نوعیت کے عمل ہیں جن کا وجود برّصغیر کی شیعہ جماعت کا ممنون ہے۔ کہیں باہر ایران میں یا دوسری جگہ ان کا سراغ نہیں ملتا۔ ان فنون کے ذریعہ عزاداریِ سید الشہدا نے وسعت پائی، اس کا وقار بڑھا اور اس کی رونق میں اضافہ ہوا۔ سوز خوانی کو موسیقی کا ایک شعبہ کہہ سکتے ہیں، مگر ایک تو مقصد کا فرق ہے، یعنی درد اور گداز مقصود ہے، نشاط اور سرور مقصود نہیں۔ دوسرے، سوز میں ساز کو دور رکھا جاتا ہے جبکہ موسیقی کے ساتھ ساز لازمی ہے۔ فی الحال قدیم زمانے کے سازوں سے قطع نظر کرکے ہم سارنگی اور ڈھولک کو بنیادی ساز مانے لیتے ہیں۔ طبلہ اور آج کل کا ہارمونیم ان کے جانشین ہیں۔ گانے والا سازوں کی مدد سے آہنگ اٹھاتا ہے، دھن سنبھالتا ہے، ان ہی کے ذریعہ گٹکری لگاتا ہے اور اُتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے آواز کی لہر اور لہر کا طول، دونوں کا دھیان رکھنا ساز کی بدولت آسان ہو جاتا ہے۔ سوز خواں نے ساز کے بدل کی یہ ترکیب نکالی کہ دائیں بائیں کم از کم دو بازو بٹھائے جائیں گے۔ ایک طرف کا بازو سرگم کا پہلا سُر، سا الاپتا رہے گا اور دوسرا مسلسل نی کا الاپ دے گا جو کہ سرگم کا آخری اور ساتواں سُر ہے۔ البتہ موقع مناسب دیکھ کر یا سوز خواں کا اشارہ پاکر ایک بازو سا سے آگے رے گا ما کی طرف اور دوسری طرف کا بازو نی سے پیچھے دھا پا ما گا کی سمت حرکت کر سکتا ہے۔ مگر دونوں یہ ہرگز نہ

نہ بھولیں گے کہ بہت جلدی اصلی نقطے پر یعنی ا ایک کو سا آور دوسرے کو نی پر رجوع کر جانا ہے۔ سوز چھ مصرعوں کا قطعہ ہوتا ہے۔ سوز خواں نے جس راگ کا سُر بھی لگایا عموماً دس پندرہ منٹ کے حدود میں پورا سوز ختم کر دیتا ہے۔ آج کل کا سوز خواں پانچ منٹ بھی نہیں لگاتا۔ منجھو صاحب قدیم لکھنؤ کی آخری یادگار اور بہت بڑے سوز خواں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک سوز کو کہتے ہیں کہ کافی دیر تک، بعض اوقات نصف یا پون گھنٹے تک جاری رکھ سکتے تھے۔ یہ سوز خواں کی قوت، طبیعت کی کیفیت اور ریاض پر منحصر ہے۔ گانے والے کے سانس میں دم ہو تو چھ مصرعوں کی گنجائش درکنار رہی فقط ایک بول، پیا نہیں آئے، گھنٹہ بھر الاپ سکتا ہے۔ بنیادی معنوں میں راگ آواز کے دورا ور چکر کا نام ہے۔ سوز پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلا مصرعہ سہولت کے ساتھ شروع کرتے ہیں، نہ سُر اونچا اور نہ بالکل نیچا۔ دوسرا بھی ویسے ہی سر میں جاری رہے گا تیسرے مصرعہ میں سُر ذرا سا اونچا ہو جائے گا۔ چوتھے میں پہلے کی برابر آجائے گا۔ پانچویں مصرعے میں، جو بیت یا ٹیپ کا مصرعہ ہے، انترا لگے گا اور بہت بلند سُر میں ادا ہو گا۔ وہی آہنگ چھٹے مصرعے تک چاہیے۔ یہ استادوں کا مسلمہ طرز ہے۔ منجھو صاحب کی بابت سنا کہ ایک سوز پر ان کو خاص مہارت تھی۔ بلا کے بن میں جو صغرا کا نامہ بر آیا۔ پہلا مصرعہ کبھی کامل اور کبھی ابتدا کے تین چار لفظ چھوڑ کر بار بار دیر تک پڑھتے رہتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا فضا بنا رہے ہیں۔ چوتھے مصرعے تک پہنچتے پہنچتے درد و گداز کا ماحول طاری ہو جاتا تھا۔ بیت کا مصرعہ: کہا مسافر کرب و بلا سلام علیک، اس کمال کے ساتھ ادا کرنا جانتے تھے۔ کہ در و دیوار سے رونے کی آواز آنے لگتی تھی۔ سوز خوانی کا فن کلاسیکی سنگیت سے کس حد تک متاثر ہوا اور دونوں کہاں تک ایک دوسرے سے قریب ہو گئے یہ حساب لگانا مشکل نہیں ہے۔ آج بھی تمیز دار سامعین گواہی میں مل جائیں گے جو بتائیں گے کہ ایسے راگ اور راگنیاں بہت ہیں جن پر سوز خواں مکمل عبور اور قابو کا ثبوت دیتے آئے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں پیلو[1]، بھیرویں[2]، مالکونس[3]، بھیم پلاسی[4]، کھماج[5]، بیہاگ[6]، درباری[7]، کامود[8]، ملہار[9]،

چھایانٹ[10]، ملہاری[11]، میاں کی ملہار[12]، شنکرا[13]، باگیسری[14]، درگا[15]، دیس[16]، کیدارا[17]، جے جے ونتی[18]، ساگر[19]، بلاول[20]، جھنجھوٹی[21] وغیرہ۔

عروضی قاعدوں کا ہندی سنگیت سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ البتہ اتنی سی بات قدرتی ہے کہ کسی شعر کا وزن مخصوص راگ یا راگنی کے سُر سے قریب ہے تو وہ سُر ایسے شعر پر آسانی سے لگ جائے گا۔ عروض کی ۱۹ بحریں اور ان کے زحافات، مل کر ہماری شاعری کے اوزان مقرر کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ مگر سوز کے قطعات ہموزن ہونے کے باوجود راگوں کے معاملہ میں آزاد نظر آئیں گے۔ ذیل میں نو عدد سوز ہیں جن کا شعری وزن یکساں ہے۔ سب رمل مثمن مخبون، محذوف کی بحر میں آتے ہیں: فاعِلاتُن فعِلاتُن فعِلاتُن فعِلُن۔ پھر بھی سوز خوانوں نے ہر ایک پر علیحدہ سُر لگائے ہیں اور سب مختلف راگوں میں ادا کیے جاتے ہیں: جب کہ[1] شبیرؑ مدینے سے لگا کرنے سفر (باگیسری) یا علیؑ[2] مظہرِ آیات تجھے جان گئے (جے جے ونتی) مجرئی روتا نہ عابد تو بھلا کیا کرتا (دیس)، آ کے اعدا سے حبیب ابن مظاہر نے کہا (کامود) کام آئے رفقا شاہ کے جب میدان میں (کھماچ)، جب[6] سنا شمر نے سقائے حرم آتا ہے (درگا) آستانِ شہ والا پہ ہوا جب کہ گذر (چھایانٹ) جب[8] گئے متصل تختِ ستمگر قیدی (مال کوس)، گزرِ[9] منزلِ تسلیم و رضا مشکل ہے (بھیم پلاسی) اس کے برخلاف اگر ہموزن، سوزوں پر یکساں راگ راگنی کی مثال چاہیے تو وہ بھی مل جائے گی۔ طلب ہوئی جو اسیروں کی قید خانے سے (بھیرویں)۔ بحر مجتث مثمن مخبون محذوف، مَفاعِلُن فعِلاتُن مفاعِلُن فعِلُن۔ سحر کو آلِ عبا جب میانِ شام آئے (بھیرویں)۔ البتہ ایک دوسری بحر پر بھی، ہزج مثمن سالم: سکینہ قید ہو کر شام کے زنداں میں جب آئی، بھیرویں کا سُر لگایا جاتا ہے مندرجہ بالا نو عدد سوزوں میں سب سے پہلی مثال باگیسری کی گذری، ایک مشہور سوز کی بحر دوسری ہے، مگر باگیسری راگ میں ادا کرتے ہیں: اس کو مجرائی جو نادان گلے پر کھا گیا۔

سوز خواں مرثیے اور سلام میں راگ کا سُر لگاتے بھی ہیں۔ اور نہیں بھی

لگاتے، بلکہ بعض اوقات اپنی مخصوص دھن بناکر اور تازہ آہنگ ترتیب دے کر سلام پڑھتے ہیں۔ یہی صورت مرثیہ پڑھنے میں درپیش آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آہنگ ترتیب دینا زبردست ریاض اور مشق چاہتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سوزخوان آواز اور لحن کی ایجاد میں اپنا کمال داؤ پر لگادیتا ہے۔ جانسٹھ (سادات بارہہ) کے عیوض علی کا ایک سوز کسی زمانے میں بہت مشہور ہوا۔ ان کا جگہ جگہ گھومنا ہوتا تھا کھاچ یا اس سے کچھ ملتا جلتا سُر لگاتے تھے: کہتی تھی بانو اصغر جانی تم کب گھر میں آؤ گے۔

مسعود میرزا، شرفائے دہلی کے ایک پرانے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ملک کی تقسیم سے کچھ دنوں پہلے کی بات ہے۔ سوزخوانی کے فن میں کمال حاصل تھا اور دنیا ان کو باکمال انسان مانتی تھی، امیرانہ وضع سے رہتے تھے، پیشہ ور سوزخواں بننے کا سوال نہ تھا۔ مگر فن کی کاملیت کا معاملہ مشک کا سا ہے۔ دور تک شہرت تھی حالانکہ نہ کہیں جانا نہ آنا۔ چھولس کی مفلس بستی پر کرم کرتے تھے۔ تیاّن صاحب سے دوستی تھی۔ میرے والد سے بھی دوستانہ مراسم ہوگئے۔ کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔ راگ راگنی پر استادانہ مہارت کے باوجود مانوس راگوں سے بچ کر ایسی بندشیں باندھی تھیں کہ بعض مرثیے، سلام اور سوز ادائیگی کے معاملے میں خاص ان ہی کا حصہ بن کر رہ گئے تھے اور ان کے پڑھنے کا جواب نہ تھا۔ تیاّن کے بیٹے عزیزالسبطین کو اپنا شاگرد بنایا تھا اور اپنے لحن میں پڑھنے کی تعلیم دی تھی۔ شاگرد بھی حسب بساط استاد کا حق ادا کرتا تھا اور ان ہی کے آہنگ میں پڑھتا تھا: ہے سلام اس پہ جو قیدی بھی ہے بیمار بھی ہے

محمد رفیع کا ذکر خیر مقصود تھا اور بات یہاں سے چلی تھی کہ سوزخوانی کا فن جانتے تھے۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ چھولس میں پیدا ہوئے تھے اس لیے خاطر خواہ شہرت سے محروم رہے۔ زمیندار بیس بیگھے کا ہی سہی خاص عادات اور روایات کا پابند ہوتا تھا کسی ایسے ویسے کام کے ذریعے پیسے جیب میں ڈالنا سخت عیب کی بات تھی۔ جارچہ چھولس میں اہل کمال پیدا ضرور ہوئے، بیشتر کی جولانگاہ وہی حقیر وطن، تمام شد۔ محمد رفیع معمولی بساط کے آدمی، اور چھولس علمی وسائل سے سراسر محروم بستی۔ جس طرح

انھوں نے کسب ہنر کیا اور ان کا جوہر چمکا، ایک نادر اتفاق کی بات ہے، مگر دنیا نادر اتفاقات کی برکت سے کبھی خالی نہیں رہی۔ کلاہِ جم بہ گدائے برہنہ پا بخشند

•

منور بیگم محمد رفیع کی دوسری بیوی تھیں۔ محمد رفیع کی اولاد میں تین بیٹے، سید محمد، امیر محمد، قمرالزماں پہلی بیوی سے اور مزید تین، ظہیر حیدر، نسیم حیدر، تحسین حیدر منور بیگم سے پیدا ہوئے۔ منور بیگم نے شوہر کی وفات کے بعد نامساعد حالات میں اپنے بچوں کو پالا۔ لیل و نہار کی سختیاں ایسی عورتوں کے مزاج میں نظم وضبط، قناعت اور صبر کے علاوہ زبردست استقامت پیدا کر دیتی ہیں۔ منور بیگم کی ذات میں یہ خوبیاں موجود تھیں۔ وہ اصول اور قاعدے کے معاملے میں سخت گیر واقع ہوئی تھیں، خلاف قاعدہ رعایت اور درگذر کا خانہ بالکل نہ تھا۔ نرمی اپنے حق میں، بہو کے حق میں، غرضکہ کسی کے حق میں پسند نہ تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ میری ماں ان کے اصول کی زد میں آگئیں۔ قصہ ایک صندوق کا تھا۔ سید محمد کی بیوی، زاہدہ بیگم نے اپنا ایک صندوق میری ماں کو دے کر احتیاط سے رکھنے کی تاکید کی۔ زاہدہ بیگم اور میری ماں رباب بانو ایک خاندان کی تھیں اور دونوں میں قریبی رشتہ تھا۔ سید محمد خاموش قسم کے سیدھے سادے آدمی، ان کو مطلب نہ تھا کیسا صندوق ہے۔ صندوق کا قفل پرانا اور زنگ آلودہ، بغیر چابی کے کھل جانے میں دشواری نہ تھی۔ میں نے 'یَا فَتَّاحُ' کا عمل یاد کر لیا۔ میوزیم کا ڈائریکٹر جس توجہ سے اپنے نوادرات کی حفاظت کرتا ہے اسی دقت کے ساتھ مجھے صندوق کی چیزیں دیکھنے اور کٹورے، لوٹے، دیگچی، سلفچی وغیرہ کے معائنے کا شوق تھا۔ منور بیگم کی طرف سے تقاضا ہوا کہ سید محمد اور زاہدہ کا گھر موجود ہے، میں یہاں بیٹھی ہوں، صندوق میری نگرانی میں رہنا چاہیے۔ میری ماں نے کہلوایا، زاہدہ کی اجازت کے بغیر نہ دوں گی۔ سید محمد یا زاہدہ کا خط منگوالو، شوق سے اٹھا کر لے جاؤ۔ وہ دونوں میاں بیوی غالباً خط لکھنے کے عادی نہ تھے۔ منور بیگم کو شکایت رہتی تھی اور غصہ آتا تھا کہ کوئی بات ہوئی، صندوق دوسروں کے گھر، یہ بالکل خلاف قاعدہ حرکت

ہے۔ آخر اصول قاعدہ بھی کوئی چیز ہے۔ میری دادی اماں کو منوّر بیگم کی دلیل سے کامل اتفاق تھا اور علانیہ کہتی تھیں کہ صندوق منور بیگم کو حفاظت سے رکھنے کا حق ہے دونوں کے درمیان طالب علی کے سارے خاندان کی بابت، خاص طور سے اس خاندان کی دو عورتوں کے سلسلے میں مفصل تبادلۂ خیال ہوتا تھا، اور یکساں رائے تھی جسے فقہ کی ثقیل اصطلاح میں متفق اللفظ والمعنیٰ کہتے ہیں۔

•

امیر محمد کا حوالہ چھٹے باب میں گزرا۔ ان کا ایک جملہ مکرر "میں اور تمہارے باپ میر کرم علی سے کتابیں پڑھتے تھے"۔ اصل میں پرانے استادوں کا قاعدہ تھا کہ اپنی اولاد کو خود نہ پڑھاتے تھے بلکہ دوسرے معلّموں کے حوالے کر دیتے تھے۔ محمد رفیع نے بھی یہی کیا۔ امیر محمد اپنی بابت مزید اطلاع دیتے ہیں: "میرے ذمّے استاد نے ایک خدمت کر رکھی تھی۔ ان کی چلم کے لیے تمباکو کی چھ عدد ٹکیاں، شامی کبابوں سے مشابہ، مٹی کے ڈبیلے میں خوب دبا کر بنانا اور قطار میں رکھ دینا۔ استاد اوقات پر حقہ پیتے تھے۔ مقررہ وقت آیا اور ایک ٹکیا اٹھ گئی۔ میں یہ کرنے لگا کہ چپکے سے ایک ٹکیا فالتو بنائی اور اپنے صرفِ خاص کے لیے کرتے کی جیب میں ڈال لی۔ یہ روز کا عمل تھا اس طرح میری حقہ پینے کی مشق شروع ہوئی۔ میر کرم علی کی خدمت میں تعلیم سے فارغ ہوا تو لمبے کش اڑانا، ناک سے دھواں نکالنا، دھوئیں کے غبارے چھوڑنا، ماشاءاللہ حقہ نوشی کا ماہر بن چکا تھا۔"

•

**قمر الزماں**: منصبیہ عربی کالج میرٹھ میں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ ان کی طالب علمی کا عرصہ بھی وہیں گزرا تھا۔ ذہین طالب علم تھے اور محنت کی عادت تھی۔ مطالعے کے شوق اور مرتب زندگی کی شہرت نے یہ فائدہ پہنچایا کہ تعلیمی مرحلوں سے فراغت کے بعد کہیں جانا اور روزگار ڈھونڈنا نہ پڑا۔ طب کی اعلیٰ سند ہونے کے باوجود مطب کا بکھیڑا کھول کر کبھی نہ بیٹھے۔

وہیں منصبیہ کالج میرٹھ میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہوگیا. کالج کے منتظمین کی طرف سے یہ ان کی استعداد کا اعتراف تھا. وہ ایک معلّم کے بیٹے ضرور تھے، نسلی رجحانات اور گھر کا پس منظر بیکار نہیں جاتا، مگر اصلی بات یہ تھی کہ انھوں نے ذاتی جدوجہد کے ذریعے صالح سیرت کی تعمیر کا ثبوت دیا تھا. مردم شناسی اور معاملہ فہمی کی صفات کتابیں پڑھنے اور پڑھانے والوں میں ذرا کم ہوتی ہیں. قمرالزماں کی ذات میں زیادہ نہ ہوں تو کمی بالکل نہ تھی، لہٰذا کالج کے بورڈنگ کی نگرانی ان ہی کے سپرد کر دی گئی تھی. مطبخ کے منشی اور باورچیوں کی لگام تھامنا اور ہوسٹل کے وحشی بچھیروں کو غیر وقت اندھیرے اجالے چہاردیواری پھاندنے سے روکنا، دونوں مشکل کام تھے. مگر قمرالزماں نہایت مستعدی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے. نہ کبھی کالج کے اراکین تک سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ ہاؤس کے خلاف شکایت پہنچی اور نہ تبدیل کرنے کا مطالبہ سامنے آیا. قمرالزماں کی ہر طرف تعریف ہوتی تھی. بورڈنگ کے داخلی دروازے کی سمت آخری سرے پر بالائی منزل میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کی رہائش کا انتظام اور نیچے والے کمرے میں دفتر تھا. دفتر میں ضروری رجسٹر، کاغذات اور میز کرسیوں کا کہیں پتہ نہ تھا. میز کرسیاں برآمدے میں باہر اور متعدد چارپائیاں دفتر میں اندر پڑی نظر آتی تھیں. اس کی ایک وجہ تھی. بورڈنگ کی رسمی ذمہ داری کے علاوہ ذراسی فالتو خدمت تھی جو کہ قمرالزماں رضاکارانہ طور سے برضا و رغبت انجام دیتے تھے. جارچہ چھولس کی خلقت یا کسی اور مقام کا دیہاتی، عبداللہ پور، دھولڑی، عیسیٰ پور، کھردا، سادات بارہہ، کسے باشد، یکایک وارد ہو جائے تو وہاں اس کے ٹھہرنے کا انتظام موجود تھا. سب اعتراف کرتے تھے کہ مولوی قمرالزماں صاحب قبلہ کے دم سے یعنی کہ آپس میں ملاقات کا عیشِ اتفاقی خوب میسر آتا ہے اور مولوی صاحب کے حقے کا تو بھلا جواب ہی کیا ہے. قمرالزماں یہ سنتے ہی بورڈنگ کے چپراسی کو اشارہ کرتے تھے اور وہ چلم لے کر دوڑ جاتا تھا.

قمرالزماں کا ہمیشہ فلسفے سے واسطہ رہا اور وہی مضمون کلاس میں شاگردوں

کو پڑھا کر ماہ و سال گزار رہے۔ مگر ان کی طبیعت میں خشک سنجیدگی کے اثرات اعتدال سے زیادہ نظر نہ آتے تھے، خیالات سے بھی نوعِ آدم کی بابت تشکیک اور مایوسی کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ وہ ملاقات میں بہت جلد معمولی اور عام سطح پر آنا جانتے تھے۔ جو ایک فلسفی کے لیے مشکل کام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ فلسفہ آدمی کو عمیق افکار تک پہنچا دے، مگر دلچسپ گفتگو کا فن اس کے پاس سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتا ہے۔ قمر الزماں نے اس فن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ شاعروں کی طرح باغ و بہار تو نہ تھے، لیکن ان سے ملنے والے دیر تک بھی پاس بیٹھے رہیں تو کسی کا جی نہ گھٹتا تھا۔ لوگ ان کی ذہانت، اعتدال پسندی، سلامت روی اور نیکی کا محکم یقین لے کر ان کی صحبت سے اُٹھتے تھے۔ انسانی فطرت کے عرفان نے ان کو ایسی طمانیت اور شگفتگی بخشی تھی کہ کوئی منفی احساس ان دو مشترکہ میلانات پر غالب آنے والا نہ تھا۔ وہ ملاقاتیوں سے خلوص اور مروت کے ساتھ پیش آتے تھے وہاں پہنچنے والے بشتر زمیندار طبقے کے لوگ، اور میرٹھ کسی کا ضلع اور کسی کی کمشنری، واضح بات تھی کہ کیوں آنا ہوا۔ قمر الزماں کی ذات سے کبھی کسی کو یہ شکایت نہ ہوئی کہ عالمانہ تقریر کر کے دماغ میں خشکی دوڑاتے ہیں اور سننے والوں کا دل گھبرا جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ تقریر کا موقع محل اور مقام منبر ہے۔ وہاں دیکھا جائے گا، صالح اعمال کی برکت اور زمیندارانہ حرکتوں کی شامت پر خوب بولوں گا اور سناؤں گا۔ ضمناً کسی نے مجلس پڑھنے کا دعوت نامہ پیش کیا تو قبول کرنے میں زیادہ تکلف نہ ہوتا تھا۔

”رازِ قدرت“ قمر الزماں کی کتاب، تئیس ۲۳ ابواب پر مشتمل، بظاہر ان کی ابتدائی عمر اور نوجوانی کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ کوئی دہریہ انیس ۱۹ سوالات قائم کر کے اسلام اور دیگر مذاہب پر اعتراض کرتا ہے۔ پیشے کا وکیل ہے۔ وکالت نہ چلی تو پریشان خیالی کا شکار ہو گیا۔ مثل مشہور ہے۔ ”پراگندہ روزی پراگندہ دل۔“ وہ اصرار کرتا ہے کہ میرے اعتراضوں کے جواب اب تک جن علمائے نے دیے وہ منقولی تھے، میں فلسفی دلائل سے جواب چاہتا ہوں۔ قمر الزماں نے ہر سوال کا جواب ایک باب میں،

گویا کہ مفصل کتاب لکھ ڈالی. آخر میں باب استفسار، جس میں ہیر پھیر کی نازک باتیں، جبر و قدر، خیر و شر وغیرہ جو کہ برسوں علم کلام کا موضوع رہی ہیں. آخری سوال زبردست معرکہ کا پوچھا گیا ہے "تارک الصلوۃ مسلمانوں کا کیا علاج کریں. یوم الجمعہ ہر ہفتے گدھے پر چڑھا کر جلوس نکالیں۔ یا پکڑ کر روٹی پانی بند کریں. معاملہ مولویوں کے قابو سے باہر ہو چکا ہے. فلسفیانہ حل ڈھونڈ کر بتلایئے۔ قمرالزماں کے سامنے پختہ عمر میں یہ سوالات آتے تو قصہ ختم کرنے میں دیر نہ لگتی، دو لفظ کافی تھے۔ وہ سوالات کے لفافہ پر " مہمل اور واہیات" لکھ کر وکیل صاحب کو واپس لوٹا سکتے تھے، یہی صحیح جواب تھا. کتاب لکھنے کی زحمت نہ کرنی پڑتی. مگر بیسویں صدی عیسوی کی ابتدائی دو تین دہائیوں میں مناظروں کا رواج بہت بڑھ گیا تھا. دہریے، خداپرست، عیسائی، مسلمان، آریہ سماجی، اور پھر سنی شیعہ وغیرہ، آپس میں مناظرے بہت کرنے لگے تھے. قادیانی اوپر سے اور کود پڑے، مناظرہ باز لوگ " رازِ قدرت" قسم کی کتابوں کو شوق سے پڑھتے تھے اور ان کو اس قبیل کے لٹریچر کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ قمرالزماں کی کوشش بیکار نہ تھی بلکہ وقت کا تقاضا پورا کر رہی تھی۔ ویسے حقیقت یہ کہ مذہب کے معاملے میں فلسفیانہ سوچ بچار کو اچھی علامت نہیں سمجھا جاتا. اس میں وہی خطرہ چھپا ہوتا ہے جو کسی معالج کو متعدی اور وبائی امراض کے ماحول میں پہنچ کر بھگتنا پڑتا ہے۔ مذہبی عقیدہ ایک گہرے روحانی تجربے کا نام ہے یہ تجربہ ماورائے عقل اور کاملاً شخصی ہے۔ اس کا عقلی استدلال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

امام فخرالدین رازی کی بابت مشہور ہے کہ بستر مرگ پر تقریباً نزع کے عالم میں تھے. ایک شخص عبا و دستار سے آراستہ، پرہیزگاروں کا ساحلیہ، آکر کہنے لگا، دنیا سے جا رہے ہو خدا کو مانا بھی ہے. امام رازی نے کہا مانتا ہوں. پوچھا کیا دلیل. انھوں نے ننانوے دلیلیں دیں وہ ہر دلیل کو رد کرتا رہا، آخر رازی پر القا ہوا، کہ یہ شیطان ہے، اس کے سامنے ہار جاؤ گے، کہدو بغیر دلیل کے مانتا ہوں۔ یہ جو کہا تو وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا، بال بال بچ گئے، ایمان لوٹ ہی لیتا. یہ ایک قصہ ہے. اتنے بڑے آدمی کے سلسلے میں ہے تو صحیح ہو گا۔ اس قدر دلچسپ اور عبرتناک تو نہیں، اس سے ذرا کم ایک

واقعہ اور ہے۔ شاہ عباس صفوی کے دربار میں ایک شخص بلا کا حاضر جواب اور علم مناظرہ کا ماہر تھا۔ ایران میں یورپ کے عیسائی مبلغین کا تانتا بندھا رہتا تھا جیسا کہ مغلوں کے عہد میں یہاں حال تھا۔ وہ عیسائیوں کو دنداں شکن جواب دے کر شاہ کا دل خوش کر دیتا تھا۔ آخر درباریوں نے مشورہ دیا کہ اس کو فرنگستان بھیجنا چاہیے۔ وہاں کی زبان سیکھ لے تو اور زیادہ غضب کا ہو جائے گا۔ شاہ کو یہ تجویز پسند آئی اور اس کو سرکاری خرچ پر روم روانہ کر دیا گیا۔ وہاں جاکر وہ عیسائی ہو گیا۔ نام بھی بدل کر پاؤلو زمان رکھ لیا۔ شاہ عباس کو یہ خبر ہوئی تو دانت پیس کر رہ گیا اور تمام درباریوں نے لعنت بھیجی۔ عرصہ گزرنے کے بعد واپس آنے کو جی چاہا۔ شاہ عباس صفوی ان ہی دنوں اپنے سفیر کو جو پاپائے روم کے دربار میں تعینات ہوا تھا۔ کسی گھٹیا حرکت پر پھانسی دے چکا تھا۔ ایرانیوں کا مزاج تھیٹر کی اداکاری کے لیے بے حد موزوں واقع ہوا ہے اور ڈرامہ دکھانے میں جواب نہیں رکھتے۔ غرضکہ پاؤلو زمان نے بحری راستہ پکڑا، اور ایران سے بچتا بچاتا ہندوستان آ گیا۔ مغلوں کے ہندوستان میں مذہبی افکار کی آزادی تھی اور اکبر کی وضع کی ہوئی پالیسی "صلح کل" کو دستور کا درجہ حاصل تھا۔ شاہجہاں کی طرف سے اس کو فرنگی خان کا خطاب عطا ہوا اور جان کی امان پائی۔ فرنگی خان شاہجہاں کی دہلی میں ٹھاٹ سے گھومتا تھا۔

قمر الزماں ملک کی تقسیم کے وقت پاکستان مہاجرت کر گئے اور دیال سنگھ کالج لاہور میں اپنے پرانے مضمون، فلسفے کے درس و تدریس کی پوزیشن مل گئی۔ جب تک تک زندہ رہے (سنہ ۱۹۶۰ء) وہیں پڑھاتے رہے۔ قمر الزماں شاعر بھی تھے۔ تبرکاً ایک شعر:

عہد و پیماں یہ ہوئے بلبل و گل میں باہم  اب نہ بچھڑیں گے کبھی دل کی قسم جاں کی قسم

# رسالدار ظہور علی، مرتضیٰ حسین، سلطان احمد

میر ظہور علی ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں رسالدار تھے۔ یہ غدر سنہ ستاون سے

پہلے کی بات ہے۔ انگریز تاجروں نے مغل حکومت کا زوال یقینی اور ناگزیر دیکھ کر جلدی سے کمپنی کی فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کی پالیسی بنائی۔ مغل شہنشاہ، شاہ عالم ثانی (وفات ۱۸۰۶ء) بنگال میں کمپنی کا اقتدار تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور صوبۂ بنگال کی مال گزاری وصول کرنے کے اختیارات کمپنی کو دے ڈالے تو وہ کمپنی بہادر کہلانے لگی۔ ڈھنڈورہ پیٹنے والے کا یہ نعرہ ایسا عام ہوا کہ اس کی گونج رفتہ رفتہ دہلی کے گلی کوچوں تک پہنچ گئی: خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔ انگریزوں کو ایسے دیسی سپاہی آسانی سے فراہم ہو گئے جو عسکری روایات رکھنے والی قوموں سے تعلق رکھتے تھے۔ دیسی سپاہیوں کو انگریزوں کے ماتحت کام کرنے میں اعلیٰ کارکردگی کا موقعہ اور روشن مستقبل کا امکان نظر آیا۔ وہ کمپنی کی فوج میں نوکری کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ انگریز ماہرین نے ان کو مغربی طریقۂ جنگ کی تربیت دی اور بہتر قسم کے ہتھیاروں سے مسلح کیا۔ انھوں نے توقع کے مطابق اطمینان بخش صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ قیادت کا موقع ملا تو ان کی قابلیت اور نمایاں ہو کر سامنے آئی۔ قدیم فوجی درجہ بندی کے حساب سے رسالدار کا عہدہ خاصا بڑا شمار کیا جاتا تھا۔ ایک پورا رسالہ اس کی ماتحتی میں رہتا تھا۔ محاذ جنگ پر اس کو نازک ذمہ داریاں سنبھالنا پڑتی تھیں۔ میدان میں عین رستخیز کے وقت اپنے رسالہ کو مناسب مقام کی طرف بڑھانے کا فیصلہ وہ خود کرتا تھا۔ میر ظہور علی نے قابل افسر کی حیثیت سے نام پیدا کیا اور فوجی خدمت نہایت ہوشیاری سے انجام دی۔

عسکری اقوام کے لوگ، وہ بھی مسلمان، انگریز کمپنی کی نوکری نہ کرتے تو کیا کرتے۔ معاملہ بیچاروں کی روزی روٹی کا تھا۔ مغل شہنشاہ کے پاس نادر کے حملے کے بعد (سنہ ۱۷۳۹ء) فوج نام کی کوئی چیز نہ رہ گئی تھی۔ حسب ضرورت جو تھوڑے سے سپاہی ملازم ہوتے تھے ان کو شاہی خزانہ تنخواہ نہ دے پاتا تھا، وہ ان کے گھوڑے اور بال بچے بھوکے مرنے لگتے تھے۔ تو غصے میں لوٹ مچانے پر اتر آتے تھے۔ اکثر امیروں اور وزیروں کے گھروں کا محاصرہ کر کے ان کی بے عزتی کرتے تھے۔ مجبور شہنشاہ عبرت و حیرت کی تصویر بنا لال قلعے کے جھروکوں سے دیکھتا تھا اور کچھ نہ کر پاتا تھا۔ صوبائی ناظم

جو مطلقاً آزاد ہو گئے تھے اپنی ضرورت اور بساط کے مطابق فوج ضرور رکھتے تھے اور فوج کو مغربی قواعد سکھانے کے لیے یورپ کے آوارہ گرد ماجرا پسندوں کو ملازم بھی رکھ لیتے تھے، مگر اصل اور نقل میں جو فرق ہوتا ہے وہی فرق ان کی اور کمپنی کی فوجوں میں تھا۔ دوسری بات یہ کہ ان کے وسائل محدود تھے۔ بڑی رقم طرح طرح کی فضول خرچی، بخشش و انعام، اور عیاشی کی حرکتوں میں ضائع ہو جاتی تھی۔ ان کی فوج میں ملازم سپاہیوں کو اپنی تنخواہ کی طرف سے کھٹکا لگا رہتا تھا۔ دبلا گھوڑا اور پھٹی وردی یہ ہمارے سپاہیوں کی علامتیں تھیں۔ جبکہ کمپنی کا سپاہی ٹھکانے کی وردی پہنتا تھا، ٹھاٹ سے کھاتا پیتا تھا۔ اور پابندی سے ہر مہینے تنخواہ جیب میں ڈالتا تھا۔ انگریز بذاتِ خود ہوشیار سپاہی تھے اور اچھے سپاہی کی قدر کرتے تھے۔ یہ کیفیت غدر سے پہلے تھی، غدر کے بعد انگریزوں کو مسلمانوں سے ایسی وحشت ہوئی کہ کبھی نہ گئی۔

میر ظہور علی کی ملازمت کا پورا عرصہ کہنا چاہیے کہ خوب کامیابی سے گذرا۔ وہ ایک مشہور افسر تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کا وقت آیا تو نیک نامی کے ساتھ گھر واپس آئے۔ جب تک زندہ رہے اپنے اثرات کو وطن اور برادری کے لوگوں کی خدمت کے لیے استعمال کیا۔

وہ جو ملازمت سے واپس آنے والوں کا ایک مزاج ہوتا ہے، میر ظہور علی نے اپنے آبائی گھر کی توڑا پھوڑی کر کے ایک شاندار مکان تعمیر کیا جس کی بیرونی دیواریں عرض میں قلعے کے نمونے کی ہیں اور آج تک سالم و استوار کھڑی ہیں۔ ان کی دوسری یادگار ایک کشادہ نشست گاہ تھی۔ دیہاتی اصطلاح میں اس کو چوپال یا محض بیٹھک کے لفظ سے یاد کرنا میر ظہور علی کی حیثیت کے شایانِ شان نہ تھا۔ غالباً میر ظہور علی کے ذہن میں ابتدا سے یہ خیال تھا کہ محرّم آئے گا تو عزاداری بھی ہوا کرے گی۔ ایسی عمارت کو چوپال نہ کہا جاتا تو بہتر ہی تھا۔ البتہ سال میں صرف دس دن عزاداری اور باقی روزانہ صبح سے شام تک زمینداری، لہٰذا احتیاط اجازت نہ دیتی تھی کہ امام باڑہ کہنے لگیں۔ میر ظہور علی نے بذاتِ خود سوچ کر اس عمارت کے لیے نام ڈھونڈا یا کسی دوست نے تجویز کیا، دیوان خانہ نہایت ہی مناسب لفظ تھا۔ مسلمانوں میں اس لفظ

کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ایران کی فتح کے بعد خلیفۂ دوم کے حضور میں اکاسرۂ عجم کے خزانے کی نمائش کی گئی تو ان کو تشویش ہوئی کہ میں اتنی زبردست دولت کا حساب کتاب کیسے رکھ پاؤں گا۔ اب تک تو یہ تھا کہ مال غنیمت آیا، فوراً اصحاب اور غازیوں میں تقسیم ہو گیا۔ جنگی قیدیوں کے مجمع سے ایک ایرانی اٹھا اور بتلانے لگا کہ ہمارے ملک میں مالیات کا بڑا محکمہ ہوتا ہے جسے دیوان کہتے ہیں۔ خلیفہ دوم نے کہا، تو کلمہ پڑھ، میں نے تجھ ہی کو اس محکمے کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ صدیوں تک امور مالی کا محکمہ بلکہ وزیر اعظم کا پورا دفتر دیوان کہلاتا رہا۔ اسی مناسبت سے بعض حکومتوں کے زمانے میں وزیر اعظم کو صاحب دیوان کہتے تھے۔ ہندوستان میں ایسا ہوا کہ مغلوں کے دور میں محکمہ مالیات کا نگراں خود ہی دیوان کہلانے لگا۔ یہ اس کے عہدے کا عنوان تھا۔ صفت کہنا اور موصوف مراد لینا، زبان کی قواعد اجازت دیتی ہے۔ مغل سلطنت کے صوبائی ڈھانچے میں ناظم کے بعد سب سے بڑا حاکم دیوان ہوتا تھا۔ صوبے کی مال گزاری وصول کر کے مرکزی خزانے میں بھیجنا اس کی ذمہ داری تھی۔ جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کے بیشتار قضیے بھی اسی کے ماتحت آتے تھے جن کو امور دیوانی کہا جاتا تھا۔ ویسے تو معنی کے اعتبار سے دیوان یعنی ایسی عمارت جس میں دفتر ہے۔ مغلوں کے دور میں معنی بدل جاتے ہیں۔ تو پھر وہاں دیوان کے دفتر کی نشان دہی کے لیے اس کے عنوان میں "خانہ" اضافہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ لفظ "دیوان خانہ" کی اصلیت ہوئی بلکہ شان نزول کہنا چاہیے۔ میر ظہور علی نے بہت ہی ثواب کا کام کیا۔ وہ چھولس کے فاقہ مست اور مفلس سیدوں کے لیے ایک دیوان خانہ بنا کر چھوڑ گئے۔ اولاد کو جو ہدایت کر گئے وہ بھی یادگار ہے۔ وہاں بیٹھ کر رعایا کے جھگڑوں کا انصاف کریں گے، برادری کی چلم بھریں گے، کوئی ابن السبیل آ گیا، یعنی باہر کا مسافر، تو اس کے ساتھ تواضع سے پیش آئیں گے۔

# مرتضیٰ حسین

مرتضیٰ حسین، رسالدار ظہور علی کے بیٹے تھے۔ باپ کے اثرات سے بیٹے کا مستقبل محفوظ ہو جانا قدرتی بات تھی۔

انھوں نے اپنی زندگی فوج کی ملازمت سے شروع کی۔ اتفاقاً تربیتی مشقوں کے دوران گھوڑے سے گر گئے اور ٹانگ میں شدید ضرب آئی اس حادثے نے فوجی زندگی کا مستقبل مشکوک بنا دیا اور وہ استعفیٰ دے کر گھر چلے آئے۔

بلند شہر گزیٹیر (سنہ ۱۹۰۳ء) کی اطلاع کے مطابق چھولس میں چار عدد نیل کی فیکٹریاں قائم تھیں۔ ایک فیکٹری کے مالک مرتضیٰ حسین تھے۔ نیل کی تجارت سے ہمیشہ معقول آمدنی ان کی جیب میں آتی رہی اور انھوں نے امیرانہ ٹھاٹ سے زندگی گزاری۔ دیہاتی زمیندار کے لیل و نہار میں عجیب دلچسپیاں شامل رہتی تھیں۔ اس کو ایک خاص طرح کا مزاج بنانا پڑتا تھا۔ یعنی بے حد کام، اپنے کم اور دوسروں کے زیادہ، پھر بھی نہ جی گھٹتا تھا اور نہ کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ لوگ خواہ مخواہ وقت خراب کر رہے ہیں۔ اوقات عزیز کی بے فکری امید تخیتہ کیے رہتی تھی کہ آج کا دن کل کے لیے اور زیادہ شادمانی و کامرانی کا وعدہ کر کے جائے گا۔ صبح ہوتے ہی ماحول بیساختہ تقاضا کرتا تھا کہ کوئی ایسا اچھا کام کرنا چاہیے جو پچھلے کئی دنوں سے نہ ہو پایا تھا، بلکہ کھلبلی مچانے والا کام ہو تو بہتر رہے گا۔ طبیعت اس کیفیت میں ڈھلی اور یہ رنگ چڑھا، پھر تو ایسی لگی رہتی تھی کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کب شام ہو گئی۔ دن بھر رطب و یابس قسم کے معاملات کانوں میں آتے رہے ان پر تبصرہ اور غور ہوتا رہا، کل بھی ایسے ہی الجھاوے طے کرنے کو ملیں گے۔ خوب مزا آئے گا۔ حقے کی چلم ٹھنڈی کرنا بدشگونی کی بات تھی۔ مصاحب بے شمار، ایک گیا دوسرا آیا، مشورے میں ہر ایک کا ذہن حاضر، سب متفقہ طور سے مخلص ہونے کے دعویدار، پڑھے لکھے واجبی، باتوں کا فن یاد، مقصد کسی کی چغلی نہیں، اس کا محل الگ ہوتا تھا عموماً آپس میں دل خوش رکھنا، قصے سارے جھوٹ، وہ ثابت کرنے میں کامیاب تھے کہ جھوٹ کو بھی فن بنایا جا سکتا ہے۔ فنون لطیفہ کی فرحت انگیزی، تسلیم ان کی باتیں بھی فرحت سے خالی نہ ہوں گی اور خالص بے ضرر ہونے کی شرط تو ضرور ہی پوری کریں گی حسن کو آرٹ کی سب سے ادنیٰ خوبی اور پہلی شرط کہا جاتا ہے۔ بشیتر ان کے لطیفوں میں وہی جادو ہو گا جو فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ باتوں میں ویسی ہی دلکشی نہ آپائی تو کمال ہی

کیا ہوا۔ افلاطون اور ارسطو ایک دفعہ سن لیں تو ساری سنجیدگی بھول کر دن بھر بیٹھے قہقہے لگائیں گے۔ یہ دیہاتی زمیندار کی نشست کا ماحول سمجھیئے۔ وہ اچھی طرح مہذب انسان ہوتا تھا۔ تہذیب کی تمام قدریں اس کو عزیز تھیں اور پورے رکھ رکھاؤ سے کام لیتا تھا، رہ گیا رعایا اور نوکروں کو بے تحاشہ گالیاں دینا، اس کو بگڑی ہوئی عادت کا نتیجہ تصور کرنا صحیح نہ ہوگا۔ وہ ایک مصلحت کی بات تھی، گالیوں کے ذریعہ نوکروں اور نابعداروں کی وفاداری کا اندازہ لگانا مقصود ہوتا تھا۔ کتنے وفادار ہیں کیسے پتہ چلے، یہی واحد پیمانہ تھا۔ انگریزی زبان میں بعض گالیاں تکیۂ کلام ہیں۔ یہ ان اشراف و عمائد کا تحفہ ہیں جو اپنے عالیشان قلعوں میں ملازموں کی فوج کے ساتھ دور دراز علاقائی مرکزوں پر رہتے تھے، گالیاں نوکروں کی شان میں، آداب برابر والوں کے ساتھ، دنیا بھر کے زمینداروں کا یکساں قاعدہ تھا۔

مرتضیٰ حسین کی ایک بیٹی آمنہ بیگم کا گھر ہمارے پڑوس میں تھا۔ میری ماں، رباب بانو کے پاس ان کا بیٹھنا اٹھنا تھا جیسا کہ پڑوس کی عورتوں کا دستور ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے والد کے نماز روزے کا ذکر نکال کر بہت زیادہ تعریف کرتی تھیں۔ واقعی مرتضیٰ حسین واجبات کی ادائیگی میں پابند رہے ہوں گے۔ مگر عقل آنے پر آمنہ بیگم کی بات ایک دفعہ یاد آئی اور مطلب سمجھ میں آیا تو طبیعت بے حد خوش ہوئی۔ اصل میں ہر بیٹی اپنے باپ کو اللہ کا خاص پاکیزہ بندہ تصور کرتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا اس کے اباجان کو ولی اللہ سمجھنے لگے۔ آمنہ بیگم بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھیں۔

مرتضیٰ حسین کی زندگی غدر کے بعد تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے میں گزری جس کو عبوری دور کہتے ہیں۔ وہ کثیرالاولاد آدمی تھے یعنی سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں۔ ان کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی خاص قباحت کی بات نہ تھی۔ نازک سوال دوسرا تھا۔ ذاتی ٹھاٹ اور اولاد کی تعلیم، وہ بھی جدید تعلیم جس کا شور علی گڑھ والے مچا رہے تھے، کونسی مد پر کتنا خرچ کریں اور ترجیحات اول و دوم کے خانوں میں کس ضرورت

کو کہاں رکھیں، جو زمیندار یہ حساب ٹھیک سے نہ سمجھا سکے ان کی نسلوں نے نقصان اٹھایا۔

# سُلطان احمد

سلطان احمد، مرتضیٰ حسین کے پوتے تھے، ملازمت کا عرصہ باہر گزار کر گھر آئے اور اپنا دیوان خانہ آباد کر کے بیٹھ گئے. مزاج میں تواضع تھی، حقّہ غالباً خود نہ پیتے تھے مگر تیار رکھتے تھے. جس کو راستے میں گزرتے دیکھا ہاتھ کا اشارہ کر دیا. کسی نے نظروں کی زد سے بچ کر نکلنا چاہا تو آواز دے کر بلا لیا. اصرار کر کے حُقّہ پلاتے تھے، بھاری بھر کم جسم تھا۔ عموماً پلنگ پر نشست رہتی تھی. آنے والے کو بڑی سی فولادی کرسی پر بٹھاتے تھے جس سے خاص محبت کا اظہار ہوا اس کو پاس پلنگ پر جگہ ملتی تھی۔ ان کا تکیہ کلام تھا، کوئی تازہ خبر، اصل میں وہ حقے کی تاثیر سے واقف تھے. کہ کس طرح پہلا ہی کش آدمی کے ذہن میں نئی پرانی ساری باتوں کو ترتیب سے ابھار دیتا ہے اور سوچنا نہیں پڑتا، سلطان احمد کی نیکی اور شرافت کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب کوئی باہر کا آدمی آ گیا۔ ان کا دیوان خانہ ہر صادر و وارد کے لیے کھلا تھا۔ مولوی صاحب تشریف لائے ہیں تو پہلی مفصل اور معیاری دعوت وہ خود کریں گے. پھر دوسروں سے فرمائش ہوگی۔ اگر چندہ مانگنے والا ہوا تو بھی یہی قاعدہ تھا کہ پہلے خود چپکے سے کچھ دیا اور اس کے بعد ہر ایک سے تاکید کرتے تھے۔ سلطان احمد تحت اللفظ کے ذاکر تھے، لیکن مرثیہ پڑھنے کا طریقہ عجیب تھا۔ منبر پر کئی مرثیے لے کر بیٹھتے تھے ابتدائی بند رخصت تک ایک مرثیے سے پڑھ گئے۔ رجز اور جنگ پر پہنچ کر دوسرا مرثیہ شروع کر دیا. آگے شہادت کا بیان آ گیا۔ سامعین سر جھکا کر رونے کے لیے تیار ہوئے. انھوں نے پھر مرثیہ بدل دیا. مرثیوں کی بحریں اور وزن الگ، ظاہر ہے کہ بحر کی تبدیلی مجلس کا پورا ماحول بگاڑ کر رکھ دیتی تھی۔ سامعین آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگتے تھے. ریل کا انجن پٹری بدلتے وقت جو کھڑکھڑاہٹ کرتا ہے

ویسا ہی ناگوار جھٹکا سامعین کے ذہن کو لگتا تھا۔ مجلس ختم ہونے کے بعد کسی نے آہستہ سے توجہ دلائی تو سلطان احمد سخت ناراض ہوتے تھے۔ ان کی دلیل تھی کہ شاعری کے لیے مرثیہ نہیں پڑھا جاتا۔ شہدائے کربلا کا ذکر احترام سے سننا چاہیے۔ دنیا نے مجلس عزا کو مشاعرہ سمجھ لیا ہے۔ یہ خوب کہا بحر بدل گئی۔

●

**محمد ہاشم علی** کو ان کی خالہ ہاجرہ بیگم نے پالا تھا وہ بچپن میں ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ ہاجرہ بیگم سلطان احمد کی ماں تھیں۔ خدا نے ان کو عجیب حوصلہ دیا تھا۔ مصطفیٰ حسین ان کے شوہر جوانی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کوئی خاص اثاثہ بھی نہیں چھوڑا۔ تھوڑی سی زمین تھی جو وراثت کے طور پر بٹ کر حصے میں آئی تھی۔ ہاجرہ بیگم سے جیسے بھی ہو سکا، انھوں نے غیرت اور سلیقے کے ساتھ دونوں بچوں کی پرورش کا بوجھ اٹھایا۔ اسی لیے محمد ہاشم اور سلطان احمد عمر بھر سگے بھائیوں کی طرح رہے۔ محمد ہاشم نے ذرا سی عمر میں غربت دیکھی تھی اور چکھی بھی تھی۔ ایسے آدمیوں کا زندگی بھر کے لیے ایک خاص مزاج ہو جاتا ہے کوئی اپنی مصیبت کا قصہ محض فرضی اور جھوٹ بنا کر سنا دے تب بھی آنسو نکل پڑیں گے اور مٹھی روک نہ پائیں گے۔ محمد ہاشم میرٹھ کے متعدد تھانوں میں افسر انچارج رہے تھے۔ اور کامیاب تھانے داروں میں شمار ہوتا تھا۔ خدا جانے کیسے کام چلایا۔ طبیعتاً حد سے زیادہ رقیق القلب انسان تھے۔ دوسری عادت خاطر تواضع کی تھی۔ جار چھ پولس کا کوئی آدمی پہنچ گیا تو نہایت تکلف سے کام لیتے تھے۔ اور ایسی شاندار ضیافت ہوتی تھی جیسے کسی بہت بڑی شخصیت کا استقبال ہو رہا ہے۔ جب تک نوکری کرتے رہے خاندان والوں کے عیش ہی عیش تھے۔

سلطان احمد اور محمد ہاشم، دونوں کا سال وفات ۱۹۷۶ عیسوی ہے۔

●

# ندیم برنی

ندیم برنی میرے باپ سے ہمیشہ آزردہ خاطر اور ناراض رہتے تھے۔ حقیقت پوچھیے تو ناراضگی کا سبب بیجا نہ تھا۔ وہ کہیں باہر تھے جیسا کہ ان کا قیام اکثر باہر ہی رہتا تھا۔ جھوسں میں زمین جائیداد بالکل نہ تھی، یا رہی ہوگی تو ندیم برنی جیسا متعلق آدمی دیہاتیوں کی دلچسپی کے سامان میں کیوں پھنسنے لگا تھا۔ دوسرے عزیزوں کو بخشندی ہوگی۔ واقعہ میرے ہوش سے پہلے کا ہے۔ میرے والد اکثر برسبیل تفریح لوگوں کو سناتے تھے۔ ندیم برنی جہاں بھی تھے بہر حال شاعر تو تھے ہی۔ وہاں کسی آفتِ جانِ ایمان پر عاشق ہو گئے اور لطف یہ کہ وہ بھی ان کو دل سے چاہنے لگی۔ شاید اس کی عمر یہ سمجھنے کے قابل نہ ہوئی تھی کہ شاعر خواب دیکھتا ہے اور جو شوخ ادا سامنے پڑ جائے پہلی فرصت میں اسی کے قدموں پر اپنے خوابوں کو نثار کر ڈالتا ہے۔ وہ اعلیٰ خاندان کی شریف زادی تھی۔ پرانے زمانے میں شرفا کی عورتیں حیادار ہوتی تھیں، پھر بھی شاذ و نادر ہی سہی، مستثنیات کا قانون کہاں کام نہیں کرتا اور بقول غالب، نازنین بتانِ خود آرا کہ واہ واہ، کہاں نہیں مل جاتے، لڑکی کے باپ ندیم برنی کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر شرط یہ رکھی کہ پہلے حسب نسب کی تصدیق کریں گے۔ آج کل کا زمانہ اور ہے کہ جس کو دیکھیے بے دھڑک سیّد بنا جا رہا ہے۔ ماضی میں دستور یہ تھا کہ کوئی اپنے وطن سے باہر سیادت کا دعویٰ کر بیٹھے تو باریک چھان بین ہوتی تھی۔ ندیم برنی نے نزاکت پر دور تک غور کیے بغیر جھوسں کا پتہ بتلا دیا اور ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ وہاں فلاں شخص ہماری برادری کا معتبر زمیندار ہے۔ اس سے خط و کتابت کر لیجیے یہ کون سی مشکل بات ہوئی۔ کچھ دنوں بعد میرے والد کے پاس ایک خط آیا جس میں تفصیل تو نہ تھی البتہ ایسا رازدارانہ استفسار تھا کہ اس سے فارسی

کے مشہور مقولے کی طرف لپکا یک دھیان جاتا تھا، عقلمند را اشارہ کافی است۔ میرے والد نے مروّت سے کام نہ لیا اور صاف پول کھول دی کہ یہ شخص شادی شدہ ہے اور بیوی وطن میں بیٹھی ہے۔ ندیم برنی کے سارے خوابوں کے محل اور سارے ارمان ڈھیر ہو گئے، خط بجلی بن کر گرا، اور ایسا کام خراب ہوا کہ جس پر عشق کی واردات گزری ہو وہی سمجھ سکتا ہے۔ انھوں نے لڑکی کے ابّاجان سے مل کر صفائی پیش کرنے اور اپنی مظلومیت جتانے کی بہت کوشش کی، مگر ملاقات کی اجازت تو درکنار وہ بزرگ صورت دیکھنے کے روادار نہ ہوئے۔ ندیم برنی نے میرے باپ کو زندگی بھر معاف نہ کیا، چوٹ ایسی لگی کہ جیک جانے والی نہ تھی۔ بظاہر بات آئی گئی ہو گئی اور برسوں گزر گئے۔ وہ ایک دفعہ چھولس آئے ہوئے تھے۔ میرے والد نے نوکر سے کہا کہ ذرا ندیم صاحب کو بلا کر لاؤ، یہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا، علی گڑھ میں تعطیلات تھیں اور میں گھر پر تھا۔ عموماً زمینداروں کے نوکر چمار ہوتے تھے اور اب بھی بیشتر وہی ہوتے ہیں۔ نوکر نے جا کر چیخنا شروع کیا، 'اجی میاں بنّی، اجی بنّی، تمھیں میاں بلا رہے ہیں۔ ندیم صاحب نے اندر سے کڑک کر پوچھا، کون میاں، نوکر نے ذرا عاجزی سے پھر وہی بات دہرائی، میرے باپ کو سب میاں ہی کہتے تھے۔ ندیم برنی سمجھ گئے اور تلخی سے جواب دیا، جو شخص صبح سے شام تک گھوڑے کی لید سونگھتا ہے اور بیل بھینس کی دُم میں ناک گھسائے رہتا ہے وہ تو میاں ہو گیا، اور ہماری اوقات یہ آ گئی کہ گنوار دروازے پر آوازیں لگا رہے ہیں۔ بھاگ جا یہاں سے، کہدے میں نہیں آتا، دیکھتا ہوں میرا کیا بگاڑ لے گا۔ نوکر نے وہی مکالمہ آ کر بیان کر دیا۔ میرے باپ خاموش ہو گئے۔ ان کو سیّدوں کی جا بیجا کھٹکار سننے کی عادت تھی۔ تین چار دن گزرے ہوں گے کہ ایک ذرا سا رقعہ میرے نام آیا۔ لکھا تھا کہ عزیزم، تم سے ملے کئی دن ہو گئے، ملاقات کو آنا چاہتا ہوں، ایسا وقت ہونا چاہیے کہ تمہارے باپ بیٹھک میں موجود نہ ہوں، صاف بات ہے ان سے مل کر میری طبیعت خوش نہیں ہوتی۔ رسماً آنا جانا ایک مجبوری ہے۔ میں نے وہ کاغذ کا پرزہ اپنے والد کی

کی طرف بھجوادیا جو اندر کے دالان میں دو رنے بیٹھے تھے، اور دل میں ڈر تا رہا کہ ندیم برنی پر صلواتیں پڑیں گی۔ میری توقع کے خلاف انھوں نے آواز دی اور کہا، میں شام کو باغ میں ٹہلنے جاتا ہوں تم اس وقت شوق سے ندیم صاحب کو بلا سکتے ہو۔ یہ جواب میں نے ان کی خدمت میں لکھ کر بھجوا دیا۔ وقت مقررہ پر روزانہ ایک لڑکا دوڑتا تھا۔ حالانکہ ان کا گھر ہماری چوپال سے بہت دور نہ تھا وہ آتے تھے اور لمبی نشست ہوتی تھی۔ دوسرے لوگ شریک ہوگئے تو وہ بھی دم بخود بیٹھے رہتے تھے۔ میری پوری زندگی یونیورسٹی کے ماحول میں گزری ہے، مگر کہہ سکتا ہوں کہ ایسی دلچسپ اور عالمانہ گفتگو دانش گاہی حلقوں میں بھی کم لوگ کرنا جانتے ہیں جیسی کہ ندیم صاحب کی زبان سے سننے کا اتفاق ہوا۔

ذاکر حسین نام تھا، شاعری شروع کی تو ندیم تخلص اختیار کرلیا۔ چھپولس چونکہ ضلع بلند شہر میں واقع تھا اور بلند شہر کا قدیم نام برن ہے اسی مناسبت سے برنی اور جوڑ لیا۔ قریبی عزیز ذاکر حسین کہتے ہوں گے، باقی ساری دنیا ندیم برنی کہتی تھی۔ شربتی رنگ کی خشخشی ڈاڑھی، لمبا قد، سر پر سیاہ ٹوپی جو غالب کی کلاہ چغتائی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ شیروانی جو صبح سے دوپہر تک پہن لی، وہ دوپہر بعد نہ پہنتے تھے۔ دن میں جتنی دفعہ گھر سے برآمد ہوئے پاؤں میں نئی وضع کی سلیم شاہی جوتیاں اور ہاتھ میں چھڑی بھی دوسری۔ اس قرینے میں کبھی فرق واقع نہ ہوا، بس ایک ٹوپی تھی جو چوتھائی صدی یا اس سے بھی زیادہ عرصے سے تبدیل نہ ہوئی تھی، ہمیشہ وہی نظر آتی تھی، شاید کسی استاد کی تبرکاً عطا کی ہوئی نشانی تھی جس نے وصیت کر رکھی تھی کہ جب تک سر پر رکھو گے ذہن روشن رہے گا۔ ایک صاحب کو شرط لگانے کی عادت تھی وہ اکثر کہتے تھے کہ جس نے ندیم برنی کو ٹوپی چھڑی اور اچکن کے بغیر دیکھا ہو اسے دس روپیہ دوں گا، کوئی طلب نہ کرتا تھا اور وہ اپنا نوٹ سب کو دکھا کر جیب میں رکھ لیتے تھے۔

شاعر کی حیثیت سے ندیم برنی کو غزل اور نعتیہ کلام دونوں پر عبور حاصل تھا۔

خطیب اور مقرر تھے، متفرق جلسوں میں جیسا موقعہ محل دیکھا ویسی ہی تقریر شروع، اور رنگ جما دیا. طبیب تھے، دہلی میں مدتوں مطب کیا اور خوب چلا. صوفیوں سے ف رتی لگاؤ رکھتے تھے. اجمیر میں ایک رسالے کی ادارت سنبھالی ۔ قلم برداشتہ نثر لکھنا جانتے تھے. رسالے میں نئی جان پڑ گئی اور اس کے پڑھنے والوں کی تعداد کہیں سے کہیں جا پہنچی. وہاں خواجہ کی زیارت کو آنے والوں پر ایسا اثر بٹھایا کہ بڑی تعداد ان کو اپنا پیر و مرشد کہنے لگی. مختصر یہ کہ ندیم برنی کیا نہیں تھے. ان پر خواجہ حافظ شیرازی کا یہ مصرعہ بالکل صادق آتا تھا. آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری. چھولس والوں سے تو کیا پوری خلق خدا کے ہجوم سے، جس کی بدولت دنیا میں رونق ہے، ندیم برنی کا مزاج کم ہی میل کھاتا تھا. البتہ ایک عادت کھلی غمازی کرتی تھی کہ یقیناً چھولس کے سیّد ہیں. وہ مسلسل ایک مشغلہ زیادہ عرصہ تک دل لگا کر نہیں کر سکتے تھے، کام ذرا سا چکا اور ان کی دلچسپی ختم ہوئی ۔ پھر وہ اس کام کو غیر ضروری خیال کر کے کسی اور کاروبارِ شوق کی طرف دیکھنے لگتے تھے، دوسری خوبی چھولس سے محبت، جہاں باہر رہ کر تھوڑے سے پیسے کمائے فوراً گھر یاد آنے لگا، پردیس میں قدم جما کر صبر سے رہنا، باقاعدہ ایک ہی روزگار سے وابستگی رکھنا، اور آمدنی کی سطح کو بڑھانے کی کوشش کرنا، ندیم برنی کے بس کی بات نہ تھی، اگر حساب لگا کر اطمینان ہو گیا کہ فی الحال دو مہینے بے فکری سے گزارنے کی رقم جیب میں آ چکی ہے تو آگے پیچھے نہ دیکھتے تھے. دل اندر سے اصرار کرتا تھا کہ اندیشہ ہائے دور و دراز کو ملتوی کرو چھولس چل کر سوچیں گے. یہ چھولس کے تمام پڑھے لکھے بزرگوں کی مشترکہ خوبی رہی ہے.

وطن کے کچھ لوگ ایک دفعہ ندیم برنی سے ملنے پہنچے. یہ اس زمانے کی بات ہے جب دہلی میں ان کا مطب تھا. وہ کسی مریض کو دیکھنے گئے تھے. ظاہر ہے شیروانی پہن رکھی ہو گی. دوسری شیروانی کرسی کے پیچھے لٹکی تھی. ایک بزرگ شوخ حرکتوں کے لیے بدنام تھے، ان کی نظر پڑی لپک کر پہن لی، کسی نے اعتراض کیا، وہ جلدی سے یہ کہتے ہوئے باہر چل دیے، تم کیا جانو، ذاکر میرا بھیّا ہی تو ہے، اور وہاں سے رفو چکر ہو گئے. ذرا سی

دیر میں ندیم برنی آ گئے۔ لوگوں نے تازہ واردات بتائی مگر شاید لمحہ بھر کے لیے ان کی سماعت زائل ہو گئی تھی۔ انھوں نے کچھ نہ سنا، بس یہی کہتے رہے۔ میں ان کو کچھ پیسے دینا چاہتا تھا، تھوڑے دن بعد چھولس آئے اور ملاقات کے لیے نکلے جس بیٹھک میں وہ بزرگ بیشتر اوقات رہتے تھے وہاں گزر ہوا توان کو تیزی سے اندر کی طرف جاتا دیکھ کر سب کو ہنسی آ گئی۔ ایک زندہ دل سے نہ رہا گیا اور کہدیا، دہلی سے اچکن پہن کر بھاگے تھے، شرمسار ہے ہیں۔ ندیم برنی بالکل سنجیدہ بیٹھے رہے۔ جس انداز سے پہلے سماعت نے ساتھ چھوڑا تھا اس موقعہ پر حافظہ رخصت ہو گیا۔ ان کو ذرا بھی یاد نہ تھا کہ کبھی کوئی قیمتی شیروانی اپنے لیے بنوائی تھی۔

ایک زمانہ ایسا آیا کہ چھولس میں دادا کا عرس بڑی دھوم سے ہونے لگا۔ دادا کے مزار پر بازار لگتا تھا، مجالس عزا کا سلسلہ رہتا تھا، علمائے کرام اور نامی گرامی ذاکر پڑھنے آتے تھے۔ مشاعرہ، قوالی، ذنگل، غرض کہ تین دن بڑی زبردست رونق رہتی تھی۔ ندیم برنی کو بھی مدعو کیا گیا، غالباً وہ اجمیر یا کہیں دور جگہ پر مقیم تھے۔ انھوں نے حسب قاعدہ آمدورفت کا کرایہ کاغذ پر لکھ کر بھیجدیا۔ اضافی مد کے طور پر "یکے" کا کرایہ بھی تھا جسے بعض مقامات پر کھڑکھڑا کہتے ہیں۔ اس میں بڑے پہیے ہوتے ہیں، بیٹھنے والا اونچا اور نمایاں ہو جاتا ہے اور چلتے میں دائیں بائیں ایسے ہلتا ہے گویا وجد کے عالم میں جھوم رہا ہے۔ علی گڑھ میں بھی آزادی سے قبل یہی کھڑکھڑے عام تھے جو لڑکوں کو اسٹیشن سے یونیورسٹی لاتے تھے اور یونیورسٹی سے شہر لے جاتے تھے۔ عرس کا انتظام میرے باپ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پرچہ دیکھ کر بولے، کرایہ تو صحیح، لیکن کھڑکھڑے کے دام نہ ملیں گے۔ کیا ندیم برنی اپنے گھر نہیں آئے ہیں۔ ہماری سواریاں مہمانوں کو لینے کے لیے موجود تھیں ان میں کیوں نہ بیٹھے۔ اس نخرے کی کیا ضرورت تھی، اور آخری بات یہ کہ عرس کا چندہ بھیجا نہیں، چلیے آئے دونوں طرف سے مخبر اور قاصد حرکت میں آ گئے۔ ندیم برنی سن کر بہت چراغ پا ہوئے میرے والد کے ایک معاملہ فہم دوست نے چپکے سے کان میں کہا، ندیم برنی کی تقریر کا پروگرام کل ہے، خدا جانے کیا راگنی الاپنے لگیں۔ انھوں نے تحویل دار کو آواز دی۔ ندیم برنی کا پورا

مطالبہ فوراً جا کر ادا کر دو۔ کوئی کٹوتی نہ ہوگی۔

عیدین کی نمازوں کا قاعدہ آزادی سے قبل یہ تھا کہ چھولس کے کچھ مولوی حضرات باہر رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی صاحب حبّ الوطن کہہ لیجیے یا برادری کے حال پر رحم کھا کر بغیر کسی کے بلائے اپنی جیب سے کرایہ لگا کر چلے آتے تھے۔ ورنہ خلقت کو جار چے لیک جانے کی پرانی عادت تھی۔ فی الحال چند برسوں سے ایک جیّد عالم کا قیام رہنے لگا ہے۔ یہ سہولت اور برکت پہلے میسر نہ تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کوئی عالم نہ آیا، البتہ ندیم برنی تشریف رکھتے تھے۔ مرتضیٰ حسین مکھیا اور نمبردار برادری میں سب سے ثقہ بزرگ تھے۔ وہی عیدگاہ میں نماز سے پہلے امام کے سر پر پگڑی باندھتے تھے۔ ان کی نظر ندیم برنی پر گئی اور نماز کا اعلان ہو گیا۔ عموماً چاندرات کو ایک قسم کی کھلبلی تو مچی ہی رہتی ہے۔ کچھ لوگوں نے مرتضیٰ حسین نمبردار کی بیٹھک پر پہونچ کر ندیم برنی کے پیچھے نماز پڑھنے سے تکلف ظاہر کیا اور دریافت کرنے پر وجوہات گنا ڈالیں۔ وہ اجمیر میں اپنے کو سُنّی مشہور کیے ہیں اور پیری مریدی کا دھندا پھیلائے ہیں۔ یہاں بھی رہتے ہیں تو مریدوں کے خط اور منی آرڈر برابر آتے رہتے ہیں۔ اس سے پہلے دہلی میں اچھا خاصا چلتا ہوا مطب بند کیا اور چھولس آکر لیٹ رہے۔ خدا جانے کیا دال میں کالا کر بیٹھے۔ ورنہ حکمت ایسا پیشہ نہ تھا کہ راتوں رات نفرت ہو گئی۔ اس سے بھی بہت پہلے آگرہ یا کسی دوسرے شہر میں وہاں کے سب سے مشہور شاعر کا دیوان چوری ہو گیا تھا۔ شاعروں میں الزام تراشیاں ہوئیں اور جوتا چلنے کی نوبت آئی۔ ان کا نام بھی درمیان میں گھسیٹا گیا تھا اور وہ موقعہ نازک دیکھ کر اس شہر سے ملبے پڑ گئے تھے۔ اس طرح کے خوردبینی اعتراضات کا سلسلہ چل پڑا۔ مرتضیٰ حسین نمبردار ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ قضیے طے کرنا ہی ان کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ انھوں نے اپنے ہنر سے سب کا منہ بند کر دیا۔ اور سمجھا بجھا کر سب کو رضامند کر لیا۔ جو لوگ اعتراض کرنے میں آگے تھے وہ بھی خاموش ہو گئے اور بادلِ ناخواستہ ہی سہی، صبح کو عیدگاہ میں پہونچ گئے۔ نمازِ عید خیریت سے ہو گئی اور سب خوشی سے گلے ملے۔ اس وقت تک کوئی قصّہ نہ تھا۔ جب واپس چلنے لگے تو بعض مسخروں نے ایک دوسرے کے کان میں پھونکنا شروع کیا کہ مولانا ندیم برنی

نماز بھول گئے۔ دعائے قنوت جتنی دفعہ پڑھانی چاہیے تھی اس سے کم پڑھائی۔ یہ بات ذراسی دیر میں پھیل گئی، جیسا کہ فارسی کا محاورہ ہے، برلب بود کان رسید۔ ندیم برنی آسانی سے میدان چھوڑنے والے نہ تھے۔ انھوں نے اپنی مضبوط صفائی پیش کی۔ کہتے تھے، ملاحظہ فرمائیے، ان جاہلوں سے جان آفت میں ہے، انصاف سے غور کیجیے، مختصر پڑھائی تو ہنسی اڑاتے ہیں کہ ندیم برنی بھول گیا۔ اور لمبی پڑھادیتا تو روتے کہ اتنا سارا وقت عیدگاہ میں چلا گیا ملنے ملانے کا دن تھا۔ ہر ایک سننے والا کہتا تھا، بیشک مولانا، آپ کی بات حق ہے، اور ہنستا ہوا اپنے گھر کو چلا جاتا تھا۔

●

# حفیظ الحسن، حیدر عباس

حفیظ الحسن جس خاندان کے فرد تھے وہ سید خانی کہلاتا ہے۔ اصلاً یہ جارچے کے چہارم والوں کی ایک شاخ ہے۔ چھولس میں سید خانی کیوں اور کب آکر بس گئے، یہ کسی کو یاد نہیں ہے۔ حفیظ الحسن کی ذات میں ایک دلچسپ خوبی تھی جو کم لوگوں میں پائی جاتی ہے، وہ یقین رکھتے تھے کہ زندگی کے صالح اعمال کا صلہ بڑھاپے میں ضرور ملتا ہے یعنی بیمہ کمپنی والا احساب، کہ جو کچھ جمع کیا آخر میں وصول کرو اور منافع بھی ملے گا۔ اس سے روح اور جسم دونوں فیض پاتے ہیں۔ روحانی برکت یہ کہ طبیعت مطمئن اور مسرور رہتی ہے۔ اکثر احساس ہوتا ہے کہ صوفیوں کی باطنی تربیت کے سات مقامات میں سے کسی ایک مقام تک آ گئے۔ جسمانی فیض کی نوعیت یوں سمجھیے کہ نظام شمسی میں ہمارے سیارے کی گردشیں عمر عزیز کو کہیں تک لے جائیں۔ مثلاً کے طور پر اسّی برس یا اس سے بھی آگے پہونچا دیں۔ پھر بھی ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان جواب نہ دیں گے۔ حفیظ الحسن سے مل کر ان دونوں باتوں کی تصدیق ہو جاتی تھی، وہ مختصر وجود کے آدمی تھے، مگر چلتے تھے نوجوانوں

کو پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہوا میں چھڑی سمیت اڑ رہے ہیں۔۔۔
علی الصبح خاص عزیزوں کے گھر چکر لگانا ان کی پرانی عادت تھی۔ اس معمول میں ہمارا
گھر بھی شامل تھا۔ میری ماں کے وہ خالو تھے۔ خالو سے پردے کا کیا سوال، البتہ
دادی اماں ذرا سا پردہ کرتی تھیں۔ جسے شرفا کی عورتیں مزاحاً گلابی پردہ کہتی ہیں۔ وہ ہنستے
ہوئے داخل ہوئے۔ چھڑی کے کھٹکنے نے خبردار کر دیا۔ پھر بھی ہلکی سی آواز دیتے تھے۔
منہ میں دانتوں کا بالکل پتہ نہیں، ہنسی کی لہر باہر نکلی اور بے روک ٹوک پوری داڑھی
پر پھیل گئی۔ ان کو ہنستا دیکھ کر سب کا جی خوش ہو جاتا تھا۔ خیریت پوچھی، کوئی تازہ بات
یاد آئی تو فی البدیہہ سنائی اور چل دیے۔ میری ماں نے کہا بھی تو زیادہ دیر بیٹھنے میں
تکلف کرتے تھے۔ ایسا ہی جلدی کا دورہ سویرے باہر کی بیٹھک میں ہوتا تھا۔ حقہ
تیار ہوا تو ہلکا سا کش لگایا، یعنی افتتاح کر دیا اور پھر نہ رکتے تھے۔ عموماً چھوٹے بچے سب
کو پیارے لگتے ہیں۔ حفیظ الحسن کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ وہ بچوں کو بے حد پیارے
لگتے تھے۔ دادا حفیظ الحسن، حلوا، میٹھے چاول، گویا کہ ٹیلیویژن کی تصویریں تھیں جو
چشم زدن کے وقفے سے آگے پیچھے گڈمڈ ہوتی گذر جاتی تھیں۔ دادا حفیظ الحسن کو دیکھا،
اور بچوں کے منہ میں پانی آ گیا۔ مسجد میں چاولوں کی دیگ چڑھے یا حلوے کا عمل ہو، وہ بہت سارے
چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھروں سے بلواتے تھے، پرہیزگار لوگ حلقے میں بیٹھے ہیں، درمیان
میں حلوے کے طباق، اور عمل پڑھا جا رہا ہے۔ یہ دادا حفیظ الحسن ہی کو معلوم تھا کہ کتنی
دیر پڑھائی جاری رہے گی اور دعا کب مانگی جائے گی۔ تمام بچے صبر کے ساتھ اگربتی کی
خوشبو اور حلوے کی بھاپ سونگھتے رہتے تھے۔ دادا حفیظ الحسن کی طرف بچوں کے اعتماد
کی نظریں دیکھنے والوں کو حیرت اور خوشی ہوتی تھی۔ اگر عرش سے معصوم فرشتوں کی چہل پہل
تھوڑی دیر کے لیے زمین پر آ جائے اور یکایک گھی میں تر بتر حلوے کی رکابیوں سے خاطر
ہونے لگے تو کیا رنگ ہوگا، یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔

حفیظ الحسن کی اولاد نرینہ میں چار بیٹے تھے، حیدر عباس، رضی عباس، عقیل عباس،
اور احمد عباس۔ رضی عباس دینی علوم کے فاضل تھے، زندگی بھر واعظین کی تحریک سے وابستہ

رہے، اور ایک سرگرم واعظ کی حیثیت سے بشیتر عرصہ پنجاب کے شہروں میں گزرا، حیدر عباس فرزند اکبر تھے۔

●

حیدر عباس کا چھولس سے وہی تعلق تھا جسے علم ریاضی کی اصطلاح میں جُدا نہ ہونے والا جز کہتے ہیں اور یہ کیفیت نصف صدی سے زیادہ عرصے تک برقرار رہی۔ بعض افراد کی وضع قطع میں ایسی شان ہوتی ہے کہ ان سے مل کر اوپر کی سات پشتوں کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ حیدر عباس کے تیور اسی قسم کے تھے۔ یہ ایک قول فیصل تھا جس پر تقریباً سب متفق تھے کہ کسی اجنبی کو تمام سادات جارچہ چھولس کے اطوار و ہنجار کا معائنہ کرانا ہو تو حیدر عباس کو سامنے کر دیجیے۔ پھر کسی سے ملاقات کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ تنہا حیدر عباس کی ذات کافی تھی۔

یہ نہایت سادہ تصوّر ہے کہ سادات جارچہ چھولس اپنے اجداد کے وطن سبز دار سے وارد ہو کر بالکل بیکار پڑے رہے اور کچھ کر کے نہ دکھایا۔ یعنی کھیتی اور ہاتھ پاؤں کے سارے کام چماروں سے کراتے تھے، خود دن بھر بے فکری سے حقہ پیتے رہتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ بھی اپنی حقیر بساط کے مطابق اس تہذیب کے خط و خال سنوارنے میں دل و جان سے لگے رہے، جو آج کل کے دانشوروں کی اصطلاح میں ہند اسلامی تہذیب کہلاتی ہے۔ شہری مرکزوں پر جو کچھ ہوتا رہا وہ سب نے دیکھا۔ دیہات قصبات کے دور افتادہ ماحول میں جس خاموش انداز سے تہذیب آگے بڑھی اس پر پوری طرح نظر کہیں گئی، کہیں نہ گئی۔ ویسے تو بلا استثنا اس کے نمونے ہر جگہ موجود تھے، چھولس کی رونق برسوں تک حیدر عباس کے دم سے قائم رہی۔

آدمی کا اجتماعی رویّہ سب سے پہلے اس کی گفتگو واضح کرتی ہے اور اسی سے شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انسانی روابط کا سارا دارومدار قاعدے کی بات چیت پر ہے۔ حکمائے قدیم جانتے تھے کہ یہ کس قدر مشکل اور نازک فن ہے۔ وہ اس محتاط نتیجے پر پہنچے کہ خاموش رہنے میں خیریت ہے۔ یہی تاکید "اندر فوائد خاموشی" کے تحت شیخ سعدی کرتے ہیں، مطلب،

یہ کہ عیب ثواب دونوں ڈھکے رہیں تو خواہ مخواہ کی پریشانیاں دور رہیں گی. مگر اس سے معاشرتی ضرورت حل نہیں ہوجاتی، معاملات کا تقاضا ہر وقت باہمی تبادلۂ خیال پر مجبور رکھتا ہے. گفتگو کا فن کردار کی تربیت کے بغیر نہیں آتا. تربیت یافتہ کردار کا نتیجہ متاثر کرنے والی گفتگو تو پھر لا محالہ لوگ ایسے آدمی کے قائل ہوجائیں گے اور وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا میں امتیازی مقام حاصل کرلے گا. حیدر عباس کی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے کسی ترکیب سے دلچسپ گفتگو کا فن سیکھ لیا تھا. صحیح طور سے اس فن کا فیض کہنا چاہیے کہ ان کی شخصیت میں غیر معمولی دلکشی تھی اور عملی زندگی میں وہ ایک کامیاب انسان تھے.

حیدر عباس کے پاس بیٹھ کر احساس ہوتا تھا کہ شہروں سے باہر قصباتی شرفائے اردو زبان کے محاورے ایجاد کرنے میں کیسی ذہانت دکھائی ہے اور اس کے رنگ و بو کی دولت میں کس قدر اضافے کیے ہیں وہ زمیندار تھے اور ظاہر ہے کہ عام معمول کے طور پر صبح سے شام تک نہایت متفرق قسم کی مخلوق سے نمٹنا پڑتا تھا. دیہاتیوں کی مکاری دغابازی اور ہیرا پھیری کی عادتیں ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی تھیں اور ذہن میں تازہ مثالوں کی کمی نہ تھی. ان کے برجستہ کنایات اور محاورے سن کر سوچنا پڑتا تھا کہ واقعی انسانی فطرت بھی کیا عجیب چیز ہے. اکثر حیدر عباس کے ایک چبھتے ہوئے مقولے کا وزن پوری تقریر پر بھاری ہوتا تھا. دوسری بات اور تھی، وہ باتیں کرتے وقت خیال رکھتے تھے کہ کسی کو بدگمانی یا خدانخواستہ غلط فہمی پیدا نہ ہو، یعنی کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ گفتار کے غازی ہیں. وہ آواز کے اتار چڑھاؤ اور جملوں کی ساخت پرداخت سے سننے والوں کو مرعوب کیے رہتے تھے کہ سو فی صدی مرد معاملہ اور مرد میدان ہیں. جس کا جی چاہے آزمالے. اور پھر کوئی ایسا محاورہ چسپاں کرتے تھے کہ مخاطب پر مطلب آئینہ ہوجاتا تھا.

گفتگو اگر لطیف ہے تو فن کا درجہ رکھتی ہے اس میں ویسی ہی نشاطیہ کیفیت، لطافت اور تازگی پائی جاتی ہے جو کسی بھی فن میں، مثال کے طور پر شاعری میں پائی جاتی ہے، کہ سنتے رہیے اور لطف اٹھاتے رہیے، جی ہی نہ بھرے گا. یہ نکتہ پردازی کا فن حیدر عباس

کے پاس واقعی طور سے پایا جاتا تھا۔ ان کی جس حلقے میں نشست برخاست تھی، وہاں نہ کسی نے بسیار گوئی کا عیب ان پر لگایا اور نہ وہ اس عیب کی زد میں آنے تھے۔ کمال کا سامنا رشک اور حسد سے ضرور رہتا ہے، حیدر عباس بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنٰی نہ تھے۔ مدعی ان کے خلاف کچھ اور باتیں کہہ کر جی ٹھنڈا کر لیتے ہوں گے، یہ کسی نے کبھی نہ کہا کہ ان کی باتوں سے ہمارا جی گھٹتا ہے بلکہ برعکس معاملہ تھا۔ حیدر عباس شاعروں کی طرح جذباتی واقع ہوتے تھے۔ اکثر اپنے دوستوں سے روٹھ جاتے تھے ان کا ملنا بیٹھنا بند ہوا تو گویا کہ رونق گئی، تفریح کا سامان گیا۔ وہ وقت تمام اہل نشست پر نہایت کٹھن گزرتا تھا اور سب ان کو منانے پھسلانے میں لگ جاتے تھے۔ خوش قسمتی یہ تھی حیدر عباس دوبارہ راضی ہونے میں دیر نہ لگاتے تھے وہ آئے اور محفل میں رونق آگئی، ہر ایک کے منہ سے ماشاء اللہ نکلتا تھا۔ جو فی الحقیقت دل کی آواز ہوتی تھی۔

حیدر عباس اپنے گھر کے سارے قیمتی اور معمولی کھیڑے میں صرف ایک چیز کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے، جیسے عاشق کے بارے میں مشہور ہے کہ معشوق کے خط کو آنکھوں اور سینے سے لگا کر رکھتا ہے۔ وہ چھولس کی مزروعہ آراضی کا نقشہ تھا جو کپڑے پر بنا ہوا تھا۔ نقشے میں کھیتوں کی نشان دہی نمبروں کے حساب سے کی گئی تھی اور غالباً ہر کھیت کا رقبہ بھی دیا ہوا تھا۔ حیدر عباس کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ نقشے پر نظر ڈالی اور ایک سانس میں انگلی رکھ کر ہر کھیت کو بتانا شروع کر دیا اصل مالک کون، کس کی کاشت میں، کاشت کار شکمی ہے یا موروثی ہو گیا۔ پٹواری ان کی مہارت کو جانتا تھا اور خفیہ معاملہ ان سے چھپاتا نہ تھا۔ کبھی کچہری تحصیل جانا ہو گیا تو لوگ ان کی جلت پھرت پر حیران ہو کر پوچھتے تھے۔ آپ پٹواری تو معلوم نہیں ہوتے، ایسی شیروانی اور چھڑی پٹواریوں کے پاس کہاں ہوتی ہے، آخر کون ہیں۔ اور حیدر عباس ہنس کر رہ جاتے تھے۔ ان کا دعوٰی تھا کہ میں غدر سے آج تک چھولس کی ہر جائیداد کے بارے میں بتا سکتا ہوں کہ پہلے کس کے پاس تھی، پھر کہاں پہنچی، اور نقل و انتقال کے عمل میں کیا ہیر پھیر ہوئے۔ کون سے بزرگ نے آدھی کا بیعنامہ کیا اور آدھی میں دھینگا مشتی ہل ڈالا، کہاں فوجداری ہوتے ہوتے رہ گئی

اور کن خاندانوں میں واقعی جھگڑا ہوا۔ مجھے بیشمار واقعات یاد ہیں۔ میں چھولس کی بولتی ہوئی تاریخ ہوں۔

ہند اسلامی تہذیب کے عناصر میں سوز خوانی کا فن ایک دلچسپ اضافہ ہے اور علاقائی فرق کے حساب سے سوز پڑھنے کے متنوع اور متعدد لہجے وجود میں آ گئے ہیں۔ حیدر عباس کامیاب اور ماہر سوز خواں تھے۔ اور یہی ان کی ذات کا سب سے نمایاں وصف تھا۔ نسل ایک سہی، مگر چھولس سے زیادہ جار چے کے سوز خواں علی الخصوص خوش گلو مشہور رہے ہیں۔ حیدر عباس نے بھی قدرتی طور سے بہت اچھی آواز پائی تھی۔ یہ خوبی لازماً اور بلا دقت آدمی کو مقبول سوز خواں بنا دیتی ہے۔ وہ بذات خود اس فن کی تعلیم کے لیے باہر کہیں نہیں نکلے، منشی محمد رفیع کے شاگرد تھے۔ البتہ ان کے استاد نے سوز خوانی کو پوری جانفشانی سے سیکھا تھا اور اس کی خاطر علم موسیقی کی ہفتخواں تک گئے تھے حیدر عباس ذہین آدمی تو تھے ہی، ان کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ جو سوز اور مرثیے انھوں نے اپنے بستے کے لیے انتخاب کیے تھے ان کی بندشیں دل میں اتار رکھی تھیں۔ اصول یہ ہے کہ اول تو آواز پر قابو ہو، دوسرے ہر مصرعے کی بندش یاد رہے، یعنی کون سے لفظ پر چڑھاؤ اور کہاں اتار، تو سرگم کی پابندی خود بخود مکمل ہو جائے گی، حیدر عباس کو یہ باریک نکتہ معلوم تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً مشق اور ریاضت کی شرط سے بھی غافل نہ رہتے تھے۔ فن کے اکتسابی حدود اس قدر ہیں کہ استاد سے سیکھا اور اس کی پیروی شروع کر دی۔ مگر فن الہامی چیز بھی ہے، مثلاً جیسے شاعر کے دل پر شعر نازل ہوتا ہے ویسا ہی معاملہ آہنگ کا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ الہام کی برکت سے سوز خواں بھی محروم نہیں رہتا: یقیناً یہ فیض حیدر عباس تک پہنچا ضرور تھا۔ وہ بعض سوز اور مرثیے اس انداز سے پڑھتے تھے اور فن کا ایسا حق ادا کرتے تھے کہ جواب نہ تھا۔ اول تو وطن سے باہر کہیں سوز پڑھنے جاتے نہ تھے اور اگر اتفاق ہو گیا تو پرانے اساتذہ ان کے کمال کا اعتراف کرتے تھے۔ ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ حیدر عباس ذیابطیس کے مریض تھے اور مٹھائی کا شوق تھا۔ معالج تنگ رہتے تھے اور ڈراتے تھے۔ انھوں نے زبردست قوت ارادی

کی بدولت زندگی بھر کام چلایا اور ستّر برس سے متجاوز عمر پائی۔ ایک دفعہ میرٹھ میں زیرِ علاج تھے۔ محرّم کا چاند نکل آیا، ڈاکٹر کا اصرار ہوا کہ چھ تاریخ تک رکنا پڑے گا، قہراً جبراً ٹھہرے۔ وہاں ایک بوڑھی طوائف عزاداری کرتی تھی کبھی شہر کی نہایت مشہور و معروف گانے والی رہی تھی اور سوز خوانی میں بھی زبردست نام تھا۔ میرٹھ کے سارے معززین اس کی مجلس میں پہنچتے تھے۔ حیدر عباس بھی بلائے گئے اور معرکے کی مجلس پڑھی۔ وہ بوڑھی عزادار کہتی تھی کہ عرصے سے کسی صاحب کمال سوز خواں کو سننے کی آرزو تھی، اب آخری دور ہے، مولا کا کرم سمجھتی ہوں کہ آج یہ آرزو پوری ہو گئی۔ حیدر عباس جب تک بیٹھے رہے ان کو دیکھ کر بار بار ہاتھ جوڑتی تھی اور چلے تو سارا تبرک ان کے تھیلے میں لوٹ دیا۔

شہر بانو، حیدر عباس کی بیوی بھی سوز پڑھتی تھیں۔ یہ ان کا شتینی ملکہ اور ذوق تھا۔ ان کی پیدائش جارچے کی تھی۔ سنا ہے کہ شہر بانو کے بھائی متوسّل حسین جارچے کے معقول سوز خواں شمار ہوتے تھے، ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان مہاجرت کر گئے۔ شہر بانو جب تک زندہ رہیں چھولس کی زنانی مجلسوں کا معیار سنبھالے رہیں۔

ضمناً حیدر عباس کی ذات سے وابستہ ایک واقعہ ایسا ہے کہ ضبط تحریر میں آ جائے تو مناسب رہے گا۔ موجودہ نسل رخصت ہوئی تو کوئی یاد نہ رکھ پائے گا۔ مولانا ابن حسن نے پاکستان پہنچ کر میرے باپ کو لکھا کہ انفرادی مہاجرت ہو رہی ہے۔ تم اجتماعی طور سے جو کچھ جارچہ چھولس میں برادری کے لوگ مقیم رہ گئے ہیں سب کو لے کر آ جاؤ۔ میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔ دو لبستیاں انتخاب کی ہیں، بالکل جارچہ چھولس کا سا نقشہ، زمین بھی کافی ہے، کوئی نقصان نہ ہوگا۔ میرے باپ تقریباً تیار ہو گئے۔ ابن حسن ان کے بچپن کے دوست تھے۔ حیدر عباس نے سنا تو رونا شروع کر دیا۔ ساری برادری کی کھلبلی ایک طرف اور حیدر عباس کا کہرام ایک طرف۔ جنگل کی طرف گئے، باغ میں آم کے پیڑ سے لپٹ کر بین کیے اور مرثیہ پڑھا۔ پیار میں جھالڑا کہتے تھے، اکیلا انشی من آم دیتا تھا۔ میرے باپ حیدر عباس کی مرضی کے بغیر قدم اٹھانے کو تیار نہ تھے۔ حیدر عباس کا یہ عالم کہ راتوں کی نیند اڑ گئی۔ رات بھر ٹہلنا، میرے باپ سے اور دیگر اہل نشست سے

گلے مل کر رونا اور مرثیے پڑھنا، کوئی ہنس پڑا تو اس کی آفت آگئی۔ قصہ مختصر یہ کہ اجتماعی مہاجرت کا ارادہ ملتوی ہو گیا۔ چار چھ پلس میں جو اہل برادری آج رہتے ہیں، ان کا وجود حیدر عباس کے مستحکم ارادے کا طفیل اور ان ہی کے دم سے ہنوز بخیر ہے۔

•

# بھیّا رفیع

بھیا رفیع میرے باپ کی صحبت کے نہایت معتبر آدمی تھے۔ ساری بستی ان کو بھیّا رفیع کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ عمر میں میرے باپ سے بہت بڑے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ آپس میں دوستی تھی۔ معتبر کا مطلب یہ کہ میرے باپ کہیں آئیں جائیں، وہ ہر وقت چوپال میں موجود رہیں گے، خاموش مزاج کے آدمی تھے، ذرا سی دیر کو گھر گئے کھانا کھایا اور چلے آئے۔ مستقل رہنا سہنا اور رات کو سونا چوپال میں رہتا تھا۔ ایسے کئی بزرگ اور بھی تھے، وہ سب اہل چوپال کہلاتے تھے، ان میں بھیا رفیع کا نام سب سے اوپر آتا تھا۔ سادات کی عورتوں میں پردے کا خاصا رواج ہے، بھیّا رفیع سے کوئی عورت پردہ نہ کرتی تھی۔ جوان لڑکیاں ہوں یا ادھیڑ عمر کی مائیں، وہ سب کے بھیا لگتے تھے۔ چوپال کا کل انتظام بھیّا رفیع کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ حقّہ، تمباکو، آگ، گھڑوں میں پانی، رات کو روشنی، مہمان آگیا تو بستر، اور طرح طرح کی اتفاقیہ ضرورتیں۔ تمام معاملات پر بھیّا رفیع نظر رکھتے تھے۔ اگر رات کو کسی کے منہ سے نکل گیا، بھیّا رفیع، پانی ٹھنڈا نہیں ہے تو صبح کو گھڑے بدل جاتے تھے۔ کوئی بول اٹھا، بھیّا رفیع، لال ٹین کیا ٹمٹما رہا ہے، تو دن نکلتے ہی نوکر چمنی صاف کرتا نظر آتا تھا۔ مگر سب سے سنگین شکایت حقّے اور تمباکو کی سمجھی جاتی تھی، بھیّا رفیع نوکر کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور تمباکو کا پورا نسخہ اپنے سامنے تبدیل کراتے تھے۔ میرے بچپن میں بھیا نام کا بھڑ بھونجا تمباکو میں شیرہ ملا کر کوٹنے پر تعینات تھا، وہ مر گیا تو گھر کا نوکر کوٹنے لگا، مگر بھیّا رفیع معائنہ کرتے رہتے تھے۔ ایسی ہی نگرانی

بغیر کسی کے کہے چارے کی رکھتے تھے، نوکروں کو گھبراہٹ رہتی تھی کہ ان کی کوئی حرکت بھیار فیع کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے گھر کے فرد تھے اور میرے ماں باپ دونوں کی بہت ساری چھوٹی موٹی فکریں اپنی گردن میں ڈالے رکھتے تھے۔ بھیار فیع کی ذاتی زندگی میں تنہا ایک خوبی ایسی تھی جو آدمی کی عزت بڑھانے اور دوسروں کی نظر میں محبوب بنانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ وہ صابر انسان تھے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے اس خاص وصف کی اہمیت یوں ہے کہ آدم کی اولاد میں ذرا کم بلکہ شاذ و نادر پایا جاتا ہے۔ خدا نے بھیار فیع کو سات بیٹیاں دی تھیں، اور محمد رضی نام کا ایک بیٹا تھا۔ تمام اہل برادری ان کی قناعت، سادگی اور جفاکشی کی عادت کے قائل تھے، اور سب کو بھیار فیع سے محبت تھی۔

●

# ڈاکٹر غلام حسنین نجم

ڈاکٹر غلام حسنین نے پولیس میں ملازمت سے زندگی شروع کی، مگر گھر سے جو تربیت لے کر گئے تھے اس کی رو سے پولیس کی نوکری پسندیدہ چیز نہ تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں، آہستہ آہستہ گمان یقین میں بدلنے لگا کہ اس کام کے قابل نہیں ہیں، اضطراب کی ایک کیفیت وہ ہوتی ہے کہ آدمی خود اپنی ہی نظر میں مشتبہ اور قابل اعتراض بن جائے۔ آخر انھوں نے دل کی گھبراہٹ اور ذہنی کشمکش کا حال اپنے انگریز حاکم کو جا کر سنایا کہ تھانوں کے افسر بالائی آمدنی کے ذریعے مزے مارتے ہیں، میں اس کو سراسر ناجائز سمجھتا ہوں، میرا حال تنگ ہے۔ تھوڑا سا علم طب پڑھا ہے، مجھے اجازت دی جائے کہ فالتو وقت میں مریضوں کو پکڑنا شروع کر دوں تاکہ گذر بسر کا سلسلہ آسانی سے چلے اور تنگی سے نجات ملے۔ وہ انگریز کوئی ہمدرد قسم کا آدمی تھا۔ کہنے لگا رسمی طور سے تو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ البتہ میں تمہاری مجبوری سمجھ گیا، چپکے سے

کام جاری کردو، کوئی مضائقہ نہیں. غلام حسنین بڑا سا بورڈ لگا کر بیٹھ گئے. کچھ یونانی طب کے نسخے، کچھ ہومیوپیتھی، غرض کہ گاڑی چل نکلی. چھولس کے جو لوگ اجمیر میں رہتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مطب میں زبردست ہجوم تو کبھی نہیں دیکھا گیا، بہرحال ایسا بھی نہ تھا کہ بالکل مکھیاں مارتے ہوں۔ اکثر شہرت یہی تھی کہ مریضوں کو ان کے علاج سے شفا ہوتی ہے۔ جب تک اجمیر میں رہے، اطمینان بخش کام تھا۔ نوکری سے ریٹائر ہو کر چھولس آئے تو مطب کا بورڈ ساتھ آیا اور چھولس کے بازار میں ایک دوکان پر لٹک گیا۔ سیدوں کے کمالات کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کوئی قصہ نہ ہو تب بھی پیچدار نکتے نکالنا جانتے ہیں۔ انجمن رضویہ کی سرپرستی، انجمن کا مدرسہ، اس قبیل کے مسائل ڈاکٹر غلام حسنین کے سامنے پیش کیے گئے۔ علاج مفت، دوا مفت، غیر اور اجنبی مریض آیا تو مجمع دیکھ کر کھسک گیا۔ ڈاکٹر غلام حسنین کا مطب تھوڑے ہی دن میں ایک مکمل نشست گاہ بن گیا۔ وہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ زندگی بھر مطالعہ کیا تھا اور وہی ان کا شوق تھا۔ انھوں نے گھر سے کتابیں لا کر مطب میں رکھ لیں، تمام اہل نشست کو اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات اصل ماخذوں سے سناتے تھے اور عربی فارسی عبارتوں کا مفہوم ترجمہ کر کے بتاتے تھے۔ روزانہ ان کے مطب میں مختصر سی مجلس ہونے لگی۔ مگر ایسی صاف ستھری، بے ضرر، اور علمی انداز کی صحبت دیہاتیوں کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ گاؤں کا ماحول دھڑے بازی کا ماحول ہوتا ہے۔ سب کا جی چاہتا ہے رسہ کشی کے مزے آتے رہیں۔ ایک طرف کا امیر جماعت بھاری بھر کم ہو گا تو دوسری جماعت کا زور ٹوٹے گا۔ بات جب ہے کہ تماشائے جنگ فیلان دیکھنے کو ملے۔ کچھ دنوں تک ڈاکٹر غلام حسنین نے اپنی بضاعت کے مطابق یہ خدمت بھی انجام دی۔ آخر میں سخت جی بھر گیا اور باہمی اختلافات سے دل برداشتہ ہو کر قطعاً علیحدہ بیٹھ گئے۔ ان کے پاس پست و بلند تجربات کی کمی نہ تھی، مگر حقیقتاً ایک رفیق اور صلح پسند دل پایا تھا۔ غلام حسنین سب کے ساتھ محبت سے پیش آنے والے انسان تھے۔

آدمی کی زندگی کا زیادہ مفید اور یادگار دور اکثر اوقات اس نقطے سے شروع ہوتا ہے جب ناگزیر ذمہ داریوں سے نجات ملے۔ متفرق سرگرمیاں ختم ہوں

اور آسائش کے لیل و نہار میسر آجائیں۔ بہت سی پوشیدہ صلاحیتیں اس کے بعد ہی جاگتی ہیں۔ یہ انوکھی بات سہی مگر تجربے کے خلاف نہیں ہے۔ غالباً غلام حسنین کو احساس نہ تھا کہ وہ ایک کامیاب خطیب ہیں اور مذہبی موضوعات پر بہترین تقریر کر سکتے ہیں۔ وہ پڑھتے ضرور تھے مگر شوق کی تسکین سے آگے کی بات نہ تھی۔ ہمارے وطن کی مجلسوں میں بیشتر تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا قاعدہ رہتا آیا ہے۔ جارچہ چھولس کی بستیاں اچھا تحت اللفظ پڑھنے والوں سے کبھی خالی نہیں رہیں۔ اتفاقاً کوئی مولوی صاحب تشریف لے آئے تو بات دوسری، ورنہ مرثیہ ہی پڑھا جاتا تھا۔ وہی رواج ابھی تک مقبول ہے۔ عموماً لوگ ڈاکٹر غلام حسنین کی طرف اس وقت دیکھتے تھے اور ایسی صورت میں اشارہ کیا جاتا تھا جب ذاکر نے کہہ دیا کہ میں مرثیہ نہیں لایا۔ پرانے بزرگوں کی وضع کی ہوئی ایک اصطلاح تھی جسے بھرتی کہتے تھے۔ وہ اسی قبیل کے پڑھنے والوں کے لیے تھی۔ غلام حسنین نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ وہ بھرتی کے مقرر نہیں ہیں اور اپنے دل نشیں اندازِ بیان سے مجلسوں میں رنگ جمانے لگے۔ وہ تقریر کے ذریعہ جدید ذوق کو سیراب کرنا جانتے تھے۔ جیسے آج کل یونیورسٹیوں کے لوگ احتیاط کی خاطر لکھ کر تقریر تیار کرتے ہیں، نہ ایک جملہ زائد نہ موضوع سے ہٹنا، نہ لفظوں کا فراٹا، نہ مترادفات کی بھرمار۔ ویسی ہی خوبی غلام حسنین کی مجلس میں ہوتی تھی، مطالعہ تو تھا ہی، عمر کے ساتھ فکر بھی پیدا ہو گئی تھی۔ موضوع کو پہلے سے ذہن میں ترتیب دے کر بولتے تھے۔ ابتدا سے آخر تک مجمع ایسی توجہ سے سنتا تھا کہ ہر جملہ ذہن میں نقش ہو جاتا تھا۔ منبر پر بیٹھتے نہ تھے، یہی طریقہ مولانا ابن حسن کا تھا، منبر کے برابر کھڑے ہوئے اور پچاس منٹ کے حدود میں تقریر ختم کر دی۔ غلام حسنین کے انداز میں ایک معنوی حسن پایا جاتا تھا جس کو ان کی طبیعت کے گداز اور خلوص کا انعام کہنا چاہیے۔ یہ دل کشی سب ذاکروں کے حصے میں نہیں آتی۔

مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو غلام حسنین اپنے بیٹے ظہیر الحسنین کے ساتھ پاکستان چلے گئے، حکیمانہ فکر اور دردمندی سے لبریز دل، انھوں نے خلقِ خدا کی خدمت کا ایک

دلچسپ طریقہ سوچا، مردوں کو خوابوں کی تعبیر بتانا اور عورتوں کو تعویذ دینا۔ یہ ترکیب نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ حقائق کی سختیوں کا مارا ہوا مہاجر رات بھر جھگی میں پڑا طرح طرح کے خواب دیکھتا تھا۔ غلام حسنین تعبیر میں اس ہنرمندی کے ساتھ جنت کے قصر کا یقین دلاتے تھے کہ ہر آدمی ان کے پاس سے خوش اور مطمئن واپس جاتا تھا۔ وطن کے عزیزوں سے سنا کہ مردوں سے زیادہ عورتوں کی بے حساب بھیڑ لگی رہتی تھی کیتھولک عیسائی جس طرح مرتے دم مقدس پادری کے سامنے زندگی بھر کے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے، اسی انداز سے بلکہ اس سے بھی زیادہ رازداری کے ساتھ، عورتیں غلام حسنین شاہ جی کے کان پر منہ رکھ کر اپنا درد دل بیان کرتی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے خاموشی سے سنتے رہتے تھے اور بغیر ایک پیسہ لیے ہر ایک کو تعویذ دے کر چلتا کر دیتے تھے۔

●

# حکیم ریاض علی

حکیم ریاض علی مشہور اور کامیاب طبیب تھے۔ روزانہ اوسطاً پچاس مریض ضرور دیکھتے ہوں گے۔ یہ اوسط برسات کے دنوں میں جب فصلی بخار اور متفرق بیماریاں زور دکھاتی ہیں، دوگنا بلکہ بعض اوقات حساب سے باہر ہو جاتا تھا۔ تقریباً نصف صدی تک ان کی شہرت بدستور قائم رہی، نہ مطب کی رونق میں کمی آئی اور نہ مریضوں کا ہجوم کم ہوا۔

مسلمانوں کی تہذیب میں طب یونانی کو محکم اور نمایاں مقام حاصل ہے، یہاں تک کہ مغربی دنیا اس کو طب اسلامی کہنے لگی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے ایک کام بہت اچھا کیا۔ وہ اپنے تہذیبی عوامل کے ساتھ طب یونانی کو ہمیشہ جوڑے رہے اور اس کی مقبولیت میں فرق نہ آنے دیا۔ ان کا کیسا بھی معمولی قصبہ ہو، وہاں ایک ہوشیار اور

تجربہ کار طبیب ضرور بیٹھا نظر آئے گا. طبیب اُن کی آبادی کی ایک علامت ہے. عالم اسلام کے دوسرے خطوں میں اس فن کے آثار تقریباً مفقود ہو چکے ہیں. حد یہ کہ جس سرزمین میں اس کی پیدائش ہوئی وہاں کوئی ٹھیک سے اس کا نام بھی نہیں جانتا طب یونانی، یعنی چہ؟

حکیم ریاض علی خاموش مزاج کے انسان تھے، ظاہر ہے کہ یہ خوبی ان کے پیشے کا نتیجہ تھی. جدید علاج کے سسٹم مریض سے مفصّل احوال پوچھتے ہیں. یہ تفصیلات اصطلاح میں ہسٹری کہلاتی ہیں. یونانی طب کا طریقہ اس سے بالکل مختلف ہے. وہاں پہلا اصول یہ ہے کہ اصل کیفیت نبض بتائے گی، مریض کا بیان سخت مشتبہ ہوتا ہے، صرف نبض پر بھروسہ کر کے تشخیص تک پہنچنا چاہیے. حکیم ریاض علی کا انداز یہ تھا کہ مریض لمبی کہانی گایا کرے، ان کی خاموشی میں خلل نہ پڑے گا. انھوں نے بغیر ردّ عمل ظاہر کیے نبض پر انگلیاں رکھیں اور نسخہ لکھ دیا. بیشتر نسخے معمولی اور مختصر ہوتے تھے. مگر جس طرح تیر نشانے پر لگتا ہے، وہی اثر ان کا نسخہ دکھاتا تھا.

ہماری برادری کا قصبہ شکارپور، ہمارے وطن سے دور نہیں ہے، وہاں ہماری پشتینی قرابت داریاں ہیں. شکارپور کے اطبائے حاذق کی ہمیشہ شہرت رہی اور بیشتر بزرگوں نے معالجات میں ایسا کمال پیدا کیا کہ شکارپور طبیبوں کا قصبہ کہلانے لگا. یہ وقار ابھی کل پرسوں تک برقرار تھا. وہاں کے ایک طبیب کا قصّہ ہے کہ اپنے فن میں کمال رکھتے تھے مگر مزاج نہایت نازک پایا تھا. نبض استغراق سے دیکھتے تھے. مریض کو کچھ کہنے کی بالکل اجازت نہ تھی. اگر وہ ذرا سا بول پڑا، حکیم جی دل گھبراتا ہے، یا اسی قسم کی کوئی بات منہ سے نکال بیٹھا تو سخت ناراض ہو کر کہتے تھے. بس نسخہ بھی خود ہی لکھ لو، یہاں کیوں آ گئے، اور نبض کے اوپر سے انگلیاں اٹھا کر دیر تک خبر لیتے تھے. اگر مریض کی خوشامد سے ٹھنڈے ہوئے تو ایک سانس میں اس کی تکلیفوں کی رُوداد، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پڑھ کر سنا رہے ہیں. مریض کو بے حد حیرت ہوتی تھی، مگر حکیم صاحب کی نازک مزاجی کا خوف بھی دل میں بیٹھ جاتا تھا. ہمارے وطن میں شکارپور کے حکیم صاحب کی داستانیں جن لوگوں نے بھی سُن رکھی تھیں، اور سچ یہ ہے کہ بیشتر کو علم تھا. وہ حکیم ریاض علی کی نرم طبیعت کے بیحد مداح اور تہِ دل سے قائل تھے. سب کو ان کے اخلاق کا فیض حاصل تھا، اور پوری برادری ایسے نیک سیرت طبیب کے وجود پر فخر کرتی تھی.

باقر حسین نام کے ایک طبیب حکیم ریاض علی کے خاندان میں ان سے ایک نسل پہلے اور پیدا پیدا ہوئے۔ وہ عجیب و غریب صفات کے انسان تھے۔ ریاض علی کے برعکس جن کی خاموشی مشہور تھی حکیم باقر حسین کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور نکتہ پردازی کا جواب نہ تھا مریض کو آدھا آرام ان کی خوش مزاجی سے ہو جاتا تھا۔ دوا کی نوبت بعد میں آتی تھی۔ ان کی شہرت یہ تھی کہ روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا جانتے ہیں۔ علم و فضل کے اعتبار سے بھی منتہیانہ درجے پر فائز تھے۔ ذاکری کے فن سے پوری واقفیت حاصل تھی اور کامیاب مجلس پڑھتے تھے۔ مگر جار چہ جہوس سے باہر جا کر پڑھنے میں ہمیشہ تکلف کیا۔ حکیم باقر حسین کے کمالات کی تعریف ایسے لوگ بھی کرتے تھے جو عام طور سے دوسروں کی تعریف کے معاملے میں کنجوس ہوتے ہیں۔ اولاد میں ایک بیٹی ذکیہ بیگم چھوڑی تھی ذکیہ بیگم اور آل محمد کی اولاد پاکستان مہاجرت کر گئی۔

●

آدمی جس قدر دنیاوی کامیابی حاصل کرے اسی تناسب سے دینداری کی طرف مائل ہوتا چلا جائے یہ بہت اچھی بات ہے۔ بظاہر اس کو پست و بلند تجربات اور صالح فکر کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں، یا باطنی تربیت کا فیض تصور کر لیجیے مگر اس وصف سے آراستہ ہستیاں شاذ و نادر ہوتی ہیں اور یہ خوبی پیدا کر لینا آسان نہیں ہے۔ حکیم ریاض علی کا معمول تھا کہ عبادت اور وظائف میں کافی وقت گزارتے تھے۔ عمر کے ساتھ اس اہتمام میں اور زیادہ اضافہ ہوتا گیا۔ طب کے فن میں کامل سمجھنے سے کہیں زیادہ لوگ ان کو شریف النفس انسان سمجھتے تھے۔ ایسے آدمی کا احترام تو سب کرتے ہی ہیں۔ ان کی ذات سے دلوں میں محبت ہونا قدرتی بات تھی۔ وہ ترقی کے زینے پر طولانی جدوجہد کر کے چڑھے تھے۔ اور جو کچھ بھی حاصل کیا تھا ذاتی شرافت اور دیانت کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔ کامیابی ایک تو وہ ہوتی ہے جو دوسروں کی نظرِ عنایت کا طفیل کہلاتی ہے۔ مگر خالص اور اصلی کامیابی کا معاملہ ذرا سا نازک ہے، وہ خونِ جگر کے بغیر ہاتھ نہیں آتی۔ حکیم ریاض علی عرصہ تک

تیشہ و سنگ کی سختیاں جھیل کر کامیابی کی منزل تک آئے تھے۔

مطب میں بیشمار بیماریوں کی ریل پیل، اور درمیان میں مختصر سی کرسی پر حکیم ریاض علی، سامنے میز پر کتابیں، قلمدان اور متفرق چھوٹی بڑی شیشیاں، ان کا استقلال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر شیشی کی بو کا رخ حکیم صاحب کی ناک کی طرف، جو خفیہ یاددہانی کے طور پر نکلی اور ناک سے سنگین ٹکراؤ کیے بغیر واپس شیشی میں چلی آئی۔ پرانے وقتوں کے داستان گو عموماً اس قسم کی داستانیں سناتے تھے کہ جنات کا لشکر لڑنے آگیا، اور کبھی یہ کہ خوفناک دیو ہوا میں اڑتے ہوئے آئے اور لپک کر چاروں طرف سے گھیرا ڈال دیا۔ مطب کی طرف سے گزرنے والوں کو پرانی داستانیں یاد آنے لگتی تھیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے تھے کہ واقعی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ فرض کیجیے انسانی تخیل نے خوفناک بلا اور خطرناک مشکل کے لیے دیو کا استعارہ ایجاد کیا ہے، اس لیے کہ جنات سے انکار ناممکن، تو پھر اس میں کیا شک ہے کہ بلائیں بھی انسان ہی پر نازل ہوتی ہیں، وہی مقابلہ کرتا ہے اور وہی فتح پاتا ہے۔ حکیم ریاض علی کا مطب اس خیال کی تائید اور ثبوت کے لیے موجود تھا۔ ان کا یہ عمل تھا کہ اکثر و بیشتر نسخہ لکھتے وقت استخارہ کرتے تھے۔ طبیب اور مریض کا حال دیکھتے ہی تسبیح کے دانے گھمانے لگے، یہ عجیب بات تھی۔ مگر حکیم ریاض علی عجیب انسان نہ سہی، مختلف قسم کے انسان ضرور تھے۔ ان کی راتیں نماز اور وظیفے میں گزرتی تھیں۔ قدرتی طور سے ہوا یہ کہ وظیفہ نسخے کی مدد کرنے لگا۔ مذہبی تربیت کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ استخارہ ایک قسم کی مناجات ہے آدمی خود کو اقدام میں عاجز اور فیصلے میں مذبذب پاتا ہے تو استخارے کی جانب رجوع کرتا ہے۔ مثلاً مریض شدید تکلیف کے عالم میں سامنے ہو اور طبیب تشخیص کے وقت دل میں عاجزی کے ساتھ خدا کو یاد کرے استخارے کا سب سے مناسب محل یہی ہے۔ انسان کو سہارا چاہیے یا اعتماد اور آسودگی کی پناہ کہہ لیجیے۔

حکیم ریاض علی کا قاعدہ تھا، اور اس قاعدے پر کامل نصف صدی تک

پابندی سے عمل ہوتا رہا، کہ عصر اور مغرب کے درمیان چھڑی ہاتھ میں لے کر پوری بستی کے گشت پر نکلتے تھے اور ہر ایسے گھر میں، علی الخصوص اہل برادری کے دروازے پر، پہنچتے تھے جہاں کوئی بیمار ہے اور ان کے زیر علاج ہے۔ جدید طریقۂ علاج جو بہت سائنٹفک ہو گیا ہے، اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ مریض کو شفایاب کرنے میں جس قدر اثر دوا کا ہوتا ہے، اس سے زیادہ نہیں تو اتنا ہی فائدہ معالج کی مستعدی اور دیکھ بھال پہنچاتی ہے۔ ہماری برادری کے بزرگ حالات سے مجبور ہو کر بہت سی عادتیں بدل چکے ہیں، البتہ ایک عادت ایسی ہے، جیسے جلی ہوئی رسی کے بل، کہ ابھی تک نہیں گئی ہے۔ احتیاط کے باوجود اسے رعونت نہ کہیں تو سمجھ میں نہیں آتا نصیب دشمناں اور کیا کہیں۔ حکیم ریاض علی برادری میں مفت کے نوکر سمجھے جاتے تھے۔ ان کو برادری والوں کی جیب سے ایک کوڑی کی بھی آمدنی نہ تھی اور نہ وہ اس کی امید رکھتے تھے۔ فوراً کسی کے گھر نہ پہنچے تو اُلٹا یہ کہ ناراض ہو گئے اور شکایتوں کا انبار لگا دیا۔ اس کے برخلاف حکیم ریاض علی کے مزاج میں غیر معمولی انکسار تھا۔ یقیناً اس خوبی کو ان کی نماز دل کے خشوع اور حضور قلب کی دعاؤں کا تحفہ سمجھنا چاہیے۔ چھولس کے نواح میں چاروں طرف ہندو آباد ہیں۔ نواحی دیہات میں دور تک حکیم ریاض علی کے کمال کی شہرت تھی۔ ان کی جو کچھ بافت تھی بیرونی مریضوں سے تھی۔ وہی ان کے مایحتاج کا وسیلہ تھے۔ پھر بھی ان کی ماہوار کمائی کا اوسط، بہت سے بزرگوں کا جی لگانے اور دماغ لڑانے کے لیے ایک نہایت مزیدار موضوع تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان قیاس آرائیوں میں حکیم صاحب کے قریبی عزیز بھی، مردوں سے زیادہ عورتیں اور عورتوں سے زیادہ مرد، سب شامل رہتے تھے۔ وہ نسل ابھی زندہ ہے جس نے حکیم ریاض علی کو خاموشی کے ساتھ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر خلق خدا کی خدمت کرتے دیکھا ہے۔ یہ قصے آئندہ نسلوں کے کان تک پہنچیں گے تو نہ توں حکیم ریاض علی کا احسان

دنیا کو خصوصاً برادری والوں کو یاد رہے گا۔ ان کا سال وفات ۱۹۶۹ء ہے۔

# پیر جی ابراہیم حسین

پیر جی ابراہیم حسین، غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہونے والی دوسری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے باپ پیر جی ایوب حسین، غدر کے نزدیک چند سال قبل یا بعد پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کے تین بیٹے یعقوب حسین، اسحاق حسین، سید محمد اور تھے۔

تاریخ ماضی کی یادوں کا نام ہے۔ مختصر جماعتوں کا مربوط وجود علی الخصوص یادوں کی بدولت برقرار رہتا ہے۔ مگر معاملہ یہ ہے کہ یادیں تحت الشعور میں دبی ہوئی غائب رہتی ہیں، جیسے فضائے لاانتہا میں بعض ستاروں کی روشنی، کبھی نظر آ گئی اور کبھی نہ آئی۔ وقت اس کا تدارک عجیب طریقے سے کرتا ہے اور اس عمل کی تکرار جاری رہتی ہے۔ تھوڑا عرصہ گذرا کہ یکایک ایسا آدمی ابھر کر سامنے آئے گا جس کے سینے میں گزشتہ کئی صدیوں کی روایات جیتی جاگتی ملیں گی۔ وہ ایسے تمام مشترکہ آداب کی نمائندگی کرے گا جو سب کو عزیز ہیں، وہی ان کو محفوظ رکھنے میں دوسروں سے زیادہ احتیاط کا ثبوت دے گا، چاہے اس کو ذاتی خسارہ ہی کیوں نہ بھگتنا پڑے۔ اکثر اس کی صورت اور سیرت، اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کی ادائیں لوگوں کے لیے دلچسپی بلکہ صریحاً ہنسی کا باعث ہوں گی۔ مگر یہ سب تسلیم کریں گے کہ دافعی اس کی ذات میں کوئی جوہر ضرور موجود ہے۔ پیر جی ابراہیم حسین اسی قسم کے آدمی تھے۔

سادات چھولس کے مورث اعلیٰ، میر سید علی سبزواری کے چار بیٹے تھے، سید احمد، سید اکبر، سید خان، اور سید علی اصغر۔ ان چار بزرگوں کی نسل سے چار خاندانوں کی

ابتدا ہوتی ہے۔ ابراہیم حسین کے خاندان والے سب پیرزی کہلاتے ہیں۔ پیرزی سید امجد کی اولاد ہیں۔ مشہور رہے کہ پیرزی طبیعت کے ذرا تیکھے اور نرالے لوگ تھے۔ ظاہری ثبوت یہ کہ ماہ وسال کی لاتعداد گردشوں کے باوجود شمالی ہند کی دھوپ لو اور گرمی ان کے خراسانی ناک نقشے اور رنگ کو بگاڑ نہ سکی۔ سیدوں میں خوشی کی تقریبات کے موقعے پر ایک قاعدہ تھا۔ خوش حالی بہت سے قاعدے ایجاد کرتی ہے، اب یہ قاعدہ متروک ہو چکا ہے۔ عام دعوت کے علاوہ مٹھائی کی گاڑی بھر کر پوری بستی میں گھماتے پھرتے تھے۔ ہر گھر میں، نوزائیدہ بچے اور نوکر سمیت، گن کر مثلاً لڈو ہیں تو پانچ لڈو فی نفر کے حساب سے پہنچا دیے جائیں گے۔ یہ رسم بھاجی کہلاتی تھی۔ دستور کے مطابق ہمیشہ بھاجی کی تقسیم پیرزی حضرات کے گھر سے شروع ہوتی تھی۔ اس خاندان کے لوگ سب سے ممتاز تھے اس لیے پیرزی بن بیٹھے یا پیرزی تھے اس بنا پر امتیازی حیثیت حاصل کر لی، فی الحال یہ فیصلہ مشکل ہے۔ مزاج کی عجیب اور نرالی عادتوں کے واقعات لوگوں کو بہت سے یاد ہیں۔ ایک پیرزی کو گانے کا شوق ہو گیا، نہایت معمولی بساط، مگر مراثی ملازم رکھ لیا۔ کبھی وہ گاتا تھا، کبھی خود سناتے تھے، رات بھر سارنگی اور ڈھولک کا ہنگامہ، اہل وعیال کا ناک میں دم ہو گیا، چاند دیکھا اور پہلی تاریخ کو پابندی کے ساتھ مراثی کی تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ مدتوں گانے بجانے میں لگے رہے۔ معظم حسین نام تھا، پیرزی دولت کہلاتے تھے۔

فرد ہو یا خاندان، ایک دفعہ کسی کے عجیب اطوار کا چرچا زبانوں تک آ جائے تو پھر سخنِ عام بہت دور تک پہنچتا ہے۔ خواجہ حافظ کی تاکید ہے، اعتبارِ سخنِ عام چہ خواہد بودن۔ لیکن کوئی اس پر عمل نہیں کرتا۔ آدمی کی عادت ہے کہ صحیح اور غلط کی پروا کیے بغیر حیرت میں ڈالنے والی باتیں ضرور سنے گا اور جی خوش کرے گا۔ سید امجد کے خاندانی سلسلے میں شاہ غریب کا قصہ اسی نوعیت کی ایک مثال ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضعیف الاعتقادی کیا کمال دکھا سکتی ہے۔ شاہ غریب کی جسمانی

ہیئت طبعی حالت کے مطابق درست اور سالم نہ تھی۔ نواح کے ہندو دیہات میں ان کی کرامات کا غل مچا۔ عقیدت مندوں اور مریدوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہندو تصورات میں دیوتا کو سانپ کے روپ میں دیکھنا پرانی روایت ہے۔ مریدوں نے مشہور کر دیا کہ شاہ غریب سانپ کی طرح لہراتے ہیں۔ پھر ہوا یہ کہ کہیں شادی کی تقریب تھی۔ شاہ غریب رات کے وقت وہاں سے گزرے، باورچیوں نے چاول کی بھبکتی ہوئی دیگ ان کے اوپر پھینک دی، وہ چاندی کی ٹکیا بن گئے، بالکل کھری جس میں ذرا سا کھوٹ نہ تھا۔ مریدوں کے ملال اور افسوس کی حد نہ تھی۔ سب نے چاندی کی ٹکیا کا جنازہ اٹھایا اور دہلی روانہ ہو گئے، وہاں دادا کے مزار کے بالکل پہلو میں دفن کر آئے۔ یہ قصہ سیّد امجد کے خاندان والوں نے اپنی پیری کی دوکان چمکانے کی غرض سے خود تصنیف کیا، اس کا امکان کم نظر آتا ہے۔ پیر جی شاطر اور چلتے لوگ نہ تھے، عقیدت مندوں کا تحفہ معلوم ہوتا ہے، جن کے تصوّرات میں اکثر دیوتا سانپ کی وضع اختیار کر لیتے ہیں۔ البتہ پیر جی صاحبان نے اتنا ضرور سوچا کہ سخن عام کی شہرت عام ہو گئی تو فائدہ اٹھانے میں کیا مضائقہ ہے۔

چھولس میں اس قسم کا تماشا اب بھی اکثر نظر آتا ہے۔ عطیہ عباس، ہمارے ایک خاندانی بزرگ کی وفات کو زیادہ دن نہیں ہوئے، پرہیزگار آدمی تھے ہر سال جہاں برسات میں فصلی بیماریوں نے پریشان کیا، نواح کی ہندو عورتیں ان کے پاس گنڈا تعویذ مانگنے کے لیے بھیڑ لگائے رہتی تھیں، پڑھا ہوا پانی بھی بہت مقبول تھا، اور دور دور جاتا تھا۔ سیدوں میں اس نوعیت کی کرامات دکھانے کا رواج ہمیشہ اور ہر جگہ رہا ہے۔ شاہ غریب کی مقبولیت ان کے حد سے زیادہ مختصر، ٹیڑھے پیدائشی طور سے غیر طبعی، اور عجیب الخلقت وجود کا نتیجہ تھی۔ دوسرے اس میں کیا شک کہ وہ اللہ والے بزرگ تھے۔ غرضکہ شاہ غریب کی برکت سے ان کے پورے خاندان کو مدتوں چڑھاوا ہاتھ آیا۔

ابراہیم حسین نے اس ورثے کو سنبھال کر رکھا اور کافی سمجھا۔ اس سے ان

کے دل کو تسلی ہوئی اور زندگی بھر خوش رہے۔ بشتر خاندانی روایات بہت ساری محرومیوں کا مداوا ہوتی ہیں۔ اگرچہ عام قاعدہ اور تجربہ یہ کہتا ہے کہ معاشرہ اپنی چلتی گاڑی میں آرام دہ جگہ ان ہی لوگوں کو دے گا جن کی جیب بھاری ہے، یا اقتدار کی کوئی دوسری علامت پاس رکھتے ہیں، افراد کی طاقت بھی ایک معقول سہارا ہے۔ چھوٹے معاشرے میں خاندان اور وسیع ماحول میں رائے عامہ کی حمایت نمایاں قوت ہوتی ہے۔ مگر ابراہیم حسین اس قبیل کی سہولتوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے، اور نہ پروا نہ کی۔ وہ غریب آدمی تھے اور ان کی ملکیت میں ذاتی جائداد تھوڑی سی ہی ہوگی، بلکہ کل ملاکر خاندان کے مشترکہ بیگھے بسوے بھی حساب میں زیادہ نہ بیٹھتے تھے۔ پھر بھی انھوں نے ہمیشہ سیدوں کی برادری سے اپنی حیثیت کا اعتراف کرایا اور سب کو اپنے وزن کا احساس دلاتے رہے۔ زرعی معاشرے میں مقابلہ نہیں ہوتا۔ لوگ قناعت پسند ہوتے ہیں اور زمانے کے سرد وگرم صبر سے برداشت کرتے ہیں۔ ایسے ماحول میں ذرا سا بھی توانا شخصیت کا آدمی ہے تو آسانی سے حاوی آجاتا ہے اور سب کو دھمکائے رہتا ہے۔ یہی پیر جی ابراہیم حسین کا خاص وصف تھا۔ دوسروں کی معمولی خطا بھی سامنے آگئی تو بخشتے نہ تھے۔ اور کسے باشد کھری سنانے کا موقعہ ہوا تو خاموش رہنا گناہ سمجھتے تھے۔

ایک سبب اور بھی تھا کہ لوگ پیر جی ابراہیم کی ناز برداری کرنے پر مجبور تھے۔ انھوں نے موت وحیات سے متعلق برادری کی ایسی مشکل ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں کہ سب ان کے مشکور رہتے تھے۔ ان کی ذات اس اصول کی زندہ مثال تھی کہ انسان عمل اور کردار سے دوسروں پر اپنی سبقت ثابت کرتا ہے۔ ایک طرف ابراہیم حسین کا احسان اور ایثار، دوسری طرف ان کی بے تحاشا تلخ نوائی اور زبان پر ہر وقت بغیر نقطوں کے گونجتے ہوئے الفاظ، پھر بھی نہ کوئی برا مانتا تھا اور نہ کسی کو شکایت ہوتی تھی۔ وہی بات تھی جو کسی شاعر نے مجبور ہو کر کہی ہے: تم کہو اور سنا کرے کوئی۔

کنیز فاطمہ ابراہیم حسین کی دوسری بیوی ہیں جن کا جارچے سے تعلق ہے۔ پہلی

بیوی کی یادگار عسکری حسن تھے۔ کنیز فاطمہ ہنوز بقید حیات ہیں۔ نوّے سے اوپر عمر ہوگی۔

مشہور ہے کہ ایک دفعہ کوئی تقریب در پیش آئی اور کسی پیر جی کا سادات بارہہ کی طرف جانا ہوا۔ وہاں ایک بزرگ نے اپنے باپ دادا کے ٹوٹے پھوٹے ہاتھی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ جیسا کہ سادات بارہ کے سیدوں کو شوق ہے، ذرا سا کمزور آدمی دیکھا اور رعب جمایا، خوبیوں کا جواب نہیں ہے، بات نیرنگیٔ روزگار کی ہونے لگی۔ پیر جی اس احساس سے غافل نہ تھے، مگر مزاج قلندرانہ پایا تھا، زمین شدیم چہ شد آسمان شدیم چہ شد، آخر گفتگو نے طول کھینچا تو پیر جی نے بے نیازی کے انداز میں کہا، ہمارے پاس ہاتھی کبھی نہیں رہے اور نہ نیرنگیٔ روزگار نے آج تک ہمارا کچھ بگاڑا، ہم بکریاں پالتے ہیں۔

---

## محمد رضا ۔ غلام رضا ۔ رونق حسین

محمد رضا، غلام رضا، دونوں ہم قافیہ نام ہونے کی وجہ سے سگے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا نہ تھا۔ اوّل الذکر کا سلسلہ سیّد اکبر کے خاندان (پیر کی پٹّی) سے ملتا تھا۔ دوسرے بزرگ غالب علی کی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور محلہ گڑھی میں سکونت تھی۔ البتہ دونوں میں طبائع کا اشتراک تھا، دونوں تجارت کا شوق رکھتے تھے اور بساط کے مطابق کامیاب تجربہ حاصل کیا تھا، لہٰذا ان دونوں کا ذکرِ خیر ایک ساتھ کرنا مناسب معلوم ہوا۔ بالآخر ایک قیمتی ثبوت مل گیا اور جستجو کی تسکین ہوگئی۔ یعنی تجارت ایسا لفظ نہیں ہے جو کہ جارچہ چھولس کے سیّدوں کی لغت میں قطعی پایا ہی نہ جاتا ہو۔

محمد رضا نے ابتدائی عمر میں خوش حالی کا منھ دیکھا تھا اور پیسے خوب پاس رہتے تھے۔ پھر زمینداری کے چکّر میں پڑ گئے اور کاروبار پر اطمینان بخش توجہ دینا دشوار ہو گیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا، نہ جیب میں پہلا سا بھاری پن رہا، نہ

ہاتھ میں وہ کشادگی باقی رہ پائی۔ البتہ مزاج میں خاص طرح کی تمکنت تھی جو کبھی نہ گئی۔ غالباً فراغت کی تاثیر ہے کہ جانے کے بعد بھی انسان کی طبیعت پر اپنی تھوڑی بہت چھاپ ضرور لگی چھوڑ جاتی ہے۔ محمد رضا سے پہلی ملاقات میں ملنے والے اندازہ کر لیتے تھے کہ اچھی گذاری ہے اور گرے پڑے آدمی نہیں ہیں۔ ایک عادت نہایت دلچسپ تھی، کسی سے خوش ہوتے حد سے زیادہ تعریف، اور جس سے ذرا ناراض اس کی شان میں بے تحاشا ملّاحیان، کسے باشد، بخشتے نہ تھے۔ ماننا پڑے گا کہ ان کو سیٹھ جی کے لقب سے عشق تھا۔ اُدھار مانگنے والوں کو علم تھا کہ ان کی جیب سے پیسے نکالنے کے لیے کیا کہہ کر خطاب کرنا چاہیے۔ محمد رضا اس آفاقی تقسیم کو مانتے تھے کہ جارچہ چھولس میں دو قسم کی خلقت رہتی ہے۔ اوّل شریف جن کی خاطر مدارات تو کرنا ہی چاہیے، خوبیوں کے اظہار میں مبالغہ بھی کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جنس دوئم یعنی واہیات اور نامعقول، ایسی خلقت پر صبح سے شام تک تبرّا پڑھنا واجب ہے تاکہ دنیا کو عبرت حاصل ہو اور وہ اپنی حرکتوں سے باز آئیں۔ دہلی جانا ہوتا تھا، اور کاروبار کی ضرورتوں سے اکثر جاتے تھے، تو وہاں کے قیام میں گوشت کو ہاتھ نہ لگاتے تھے، کہتے تھے کہ یہاں ذبیحہ نہیں ہوتا، قصاب جھٹکا کھلاتے ہیں۔ قدرتی طور سے خوش قیافہ واقع ہوئے تھے اور اچھا لباس پہننے کا شوق تھا۔ زندگی کے آخری دور میں کیفیت یہ تھی کہ نشست کے لیے آنے والوں میں کسی نے مزاج پوچھ لیا تو بیساختہ داغؔ کا شعر پڑھتے تھے اور نہایت زوردار قہقہہ لگاتے تھے:

ہوش و حواس تاب و تواں جا چکے ہیں داغؔ　　اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

•

غلام رضا، تجارت کو علمی کام سے کہیں زیادہ ایک قسم کا فکری موضوع سمجھتے تھے اور طرح طرح کے منصوبے سوچتے رہتے تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی یا کالج میں پڑھے بغیر اقتصادیات کا یہ اصول سمجھ لیا تھا کہ جائز منافع کی صورت میں دولت کی تولید کا نام تجارت ہے۔ کامیابی ہونا قدرتی بات تھی۔ مگر جس جگہ ان کی سکونت تھی، وہاں کا ماحول ایسی نیک کوششوں کے لیے سازگار نہ تھا جن کی طرف غلام رضا کی نظر رہتی تھی۔ چھولس

محلہ گڑھی کے سید، خصوصیت کے ساتھ قریبی عزیز یعنی کہ بھتیجے وغیرہ، ان کے نفع نقصان کی سالانہ میزان ہمیشہ برابر کئے رہتے تھے۔

غلام رضا کی ذات میں صبر، تحمل اور درگذر کی عجیب صفات جمع تھیں۔ گاؤں میں ایسا آدمی اوّل تو نادرالوجود ہوتا ہے اور اگر کہیں اتفاق سے مل جائے تو پورا معاشرہ فخر، برکت اور خوش نصیبی کی بات بعد میں سمجھتا ہے۔ حیرت پہلے ہوتی ہے کہ یہ حضرت کس کام کی چیز ہیں اور کہاں سے آ گئے۔ ان کا مزاج ساری برادری سے مختلف تھا۔ کوئی اُدھار لے کر ٹہل جائے۔ اندھیرے اجالے کھیتوں میں نقصان کر دے، دوسری جگہ کا غصہ ان کے دروازے پر کھڑا ہو کر اتارے، گالیاں دے، لٹھ دکھائے، غلام رضا کو ہر بات برداشت کرنے کی عادت تھی۔ کسی نے ان کو بدمزہ اور مایوس ہوتے کبھی نہیں دیکھا، اور نہ کوئی یہ گواہی دیتا تھا کہ ہم نے ان کی زبان سے دوسروں کے خلاف ناگوار کلمات سُنے ہیں۔

محرم کی ساتویں تاریخ شب میں، حضرات گڑھی مل کر بلاؤ کی مجلس کرتے ہیں۔ مدتوں سے رواج چلا آرہا ہے۔ زیارت برآمد ہوتی ہے اور مجمع زبردست ہوتا ہے۔ اس کو شاہانہ اہتمام کی مجلس کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ غلام رضا جب تک زندہ رہے چندہ ان کی تحویل میں رہتا تھا۔ گڑھی کے لوگ جھگڑے کے مضبوط، حساب کے وقت اعتراضات کا انبار، جاہلوں کی آخری تان اس الزام پر ٹوٹتی تھی کہ کھا گیا۔ غلام رضا خاموشی سے سب کچھ سنتے تھے، جیسے کسی اور کی خبر لی جارہی ہو۔ ان کی ذات سے کوئی مطلب نہیں۔ حسبِ دستور دوسرے برس کا محرم آیا اور سات تاریخ سے پہلے لوگوں نے ان کی طرف چندے کی رقم بڑھانی شروع کی تو کبھی شکایت نہ کرتے تھے، کہ پچھلے سال مجھ پر الزام تھوپ چکے ہو، بھاگ جاؤ، میں ذمہ داری نہ سنبھالوں گا۔ ذرا نرم انداز میں منھ سے نکل بھی گیا کہ اب کی دفعہ کسی اور کو امانت سنبھالنے دو، تو چاروں طرف سے خلقت شور مچاتی تھی، نہیں منشی جی، ہمیں آپ کے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ جہاں انھوں نے یہ سُنا، چپکے سے چندہ سنبھالنا

شروع کر دیا، فوراً پنسل اور ڈائری ہاتھ میں لے لی، جو عشرہ محرّم کے کئی دن بعد تک ہاتھ میں رہتی تھی۔ حساب کی نوبت آئی تو پھر وہی ہی گڑبڑ پھیلتی تھی اور ویسا ہی غل مچنا لازمی تھا۔ غلام رضا لوگوں کی نکتہ چینی کو عین ثواب کا باعث اور بخشش کی سفارش تصوّر کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ حکیمانہ مزاج رکھنے والے افراد کے ذہن میں ایک مرکزی خیال ہوتا ہے، علمی اصطلاح میں اس کو نظریہ کہتے ہیں۔ غلام رضا کا پختہ خیال تھا کہ انسان زندگی میں ترقی کا ایک موقع ضرور پاتا ہے، یہ اور بات کہ موقع نکل جائے اور بعد میں خبر ہو، یا کسی کو بالکل خبر نہ ہو۔ البتہ اس بات سے اختلاف نہ رکھتے تھے کہ ذرا سی ہوشیاری گرہ میں ہو تو بہت سے موقعے بھی مل سکتے ہیں۔ وہ مفصّل طور سے سمجھاتے تھے کہ تجارت میں کامیابی کے لیے عقل سے زیادہ چالاکی اور موقع شناسی کی ضرورت ہے، اور پھر موقع شناسی کے معنی مثالوں کے ذریعہ واضح کرتے تھے۔ مہاجن برادری کی بابت نہایت خراب رائے تھی اور بنیوں کی سخت مذمّت کرتے تھے کہ چھوٹے ہوں یا بڑے، سب چور ہوتے ہیں، حالانکہ تجارت اور چوری میں فرق ہے۔ اگر کوئی اس معاملے پر سوال کر بیٹھتا، تو گفتگو دیر تک جاری رہتی تھی۔ ان کو دھیمی آواز میں بولنے کی عادت تھی اور قریب سے جاننے والے اُن کے لہجے کی نرمی اور لطافت کے بہت زیادہ مدّاح تھے۔

متفرق تجارتوں کا سلسلہ چھولس میں اور چھولس سے باہر ہمیشہ چلتا رہا۔ مثال کے طور پر جاڑے آئے، کریشر چلایا، گنّے خریدے، گڑ تیار کر کے بیچا، موسم تبدیل ہوا، کریشر بند کر دیا، گرمی شروع ہوئی، تالابوں میں مچھلیاں پالنے کے لیے بند بنایا گیا، وقت سے پہلے برسات آگئی، تھوڑی سی پکڑوا پائے تھے، باقی پانی کے ریلے میں اچھل کے صاف گئیں۔ شاید دیہاتیوں نے اشارہ کر دیا تھا، غلام رضا کے جال سے ہوشیار رہنا، ہمیں بھی پھنسنے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ کھیتوں میں پانی کی سپلائی کا خیال آیا، بڑا سا انجن اور پمپ خرید لائے، لوگوں نے بھرائی کے پیسے پابندی سے نہ دیے، بات

یہیں پر ختم نہیں ہوئی، وہ جو بچوں کی نظم کا ایک مصرعہ ہے: سناؤں تمھیں بات اک رات کی، علی الصبح ٹہلنے نکلے، پتہ چلا کہ انجن کے قیمتی پرزے رات میں چوری ہو گئے، ڈھانچہ رہ گیا، پنچایت بیٹھی، کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، اینٹوں کا بھٹہ لگایا، زیادہ لاگت درکار تھی، دوسرے قریبی عزیز، جوّاد حسین کو شریک کر لیا، چھولس اور نواح میں اینٹ کی خریداری کم تھی، کام خسارے کی طرف جانے لگا، مجبوراً بند کرنا پڑا، البتہ بھٹے کا مجموعی فائدہ کہنا چاہیے کہ سب کو پہنچا۔ میری ننھیال کی بیٹھک جو کچھ دنوں سے خستہ حالی کے عالم میں تھی، پکّی بن کر کھڑی ہو گئی، قریبی عزیزوں میں جس بھیّا کا جتنا حق اور دعویٰ غلام رضا پر بن سکا، اور حسبِ مراتب کسی سے جس قدر شرمائے یا گھبرائے، وہ اتنی ہی اینٹیں لینے میں کامیاب ہو گیا، بیشتر لوگوں کے غسلخانے، دالان اور صدر دروازے پکّے نظر آنے لگے۔ برادری کی ساری عورتوں کو پکّے چولھے بنانے کا شوق ہوا، ان کا اشارہ پاکر بچوں کا تانتا بندھ گیا، سب کے چولھے مضبوط ہو گئے۔ مجھے پورا علم نہیں، سنا ہے، غلام رضا کا شوق، اصول اور تجربہ ہمیشہ ان کو فقط ایک ہی جدوجہد میں لگائے رہا اور مقصد کی جستجو سے کبھی تھک کر نہ بیٹھے۔ برادری ایک زبان ہو کر کہتی تھی کہ غلام رضا تجارت نہیں کرتے، عاشقی کرتے ہیں۔

غلام رضا کے ذہن کا مرکزی خیال، یعنی زندگی میں ترقی کا ایک موقعہ، واقعی صحیح ثابت ہوا۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوتے ہی انھوں نے فوج کو انڈا، مرغی سپلائی کرنے کی ٹھیکیداری میں ہاتھ ڈالا۔ یہ ایک عجیب حسنِ اتفاق تھا، کمپنی رجسٹر کرا لی تھی اور کمپنی کے نام سے کاروبار تھا۔ ان کی مالی سطح دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ گئی، مگر مزاج کی سادگی ویسی ہی رہی اور گھر کے معیار پر بھی ہاتھ کی مضبوط گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائی، وہ چھولس میں ایک ہائی اسکول کھولنے کا منصوبہ بنانے لگے، میرے والد کو اپنے برادرِ نسبتی محمد حنیف کو مشوروں میں شرکت کا اہل سمجھتے تھے، محمد حنیف نہایت شائستہ شخصیت کے انسان تھے۔ بلند شہر کے مسلم

ہائی اسکول کی مالی معاونت کے لیے طرح طرح کی کوششوں میں لگے رہے۔ اس کا کیا علاج کہ زمانہ تیزی سے بدلا، ملک تقسیم ہوا، مسلمانوں کے خلاف فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ غلام رضا کی کمپنی کا بھاری سرمائے کا مال ریلوے اسٹیشنوں پر لٹ گیا اور ایسا خسارہ ہوا کہ سنبھل نہ پائے، ان کو ذرا غم نہ تھا۔ صوفیوں کی سی لاتعلقی اختیار کرلی۔ کبھی ذکر آیا تو نہایت متانت کے لہجے میں کہتے تھے، دنیا کے پست و بلند کا کیا اعتبار ہے۔ غلام رضا کی شیروانی اکثر دھوبی کے گھاٹ پر جاکر لوٹ آتی تھی۔ سامنے کی طرف پان کی پیک کا چھوٹا سا نشان تھا جو ہمیشہ چمکتا رہتا تھا۔ اصل میں وہ سرخ نشان نہ تھا، ایک آگاہی اور ایک علامت تھی: ترقی کا موقعہ پھر بھی آسکتا ہے، مرد باید کہ ہراساں نشود۔

غلام رضا کو سیدوں کی جہالت پر نہایت صدمہ اور افسوس تھا۔ وہ بظاہر عملی انسان ہونے کے باوجود اعلیٰ تعلیم کو ترقی کی کلید سمجھتے تھے۔ آج کے زمانے کا کھلا اعلان ہے کہ مقابلے کے میدان میں سبقت کا اصول نظر انداز کرکے کوئی آدمی عزت سے نہیں رہ سکتا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر افراد تو کیا قوموں کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی بہترین استعداد پیدا کیے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے۔

○

جارچے کے رونق حسین بھی اسی ردیف میں آتے ہیں۔ ان کی دوکان میں جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، سارا مال دوئم درجے کا، فقط پیڑے اصلی اور اعلیٰ درجے کے ہوتے تھے۔ جس نے چکھ لیے قائل ہوگیا اور جہاں گیا تعریف کرتا گیا۔ رونق حسین کا قول تھا اور بیجا نہ تھا، کہ حلوائی میرے آگے کان پکڑتے ہیں، عجیب بات یہ کہ رونق حسین بیحد دبلے آدمی تھے اور جیسا ڈیل ڈول حلوائیوں کا ہوتا ہے، ان کی جسامت بالکل سوفی صدی برعکس تھی۔ ذرا سا گمان نہ ہوتا تھا کہ کبھی مٹھائی کی خوشبو سونگھی ہوگی، کھانا تو بڑی بات تھی۔ دونوں وقت پتلی دال

اور دو روٹیاں، دوسری کسی نعمت سے مطلب نہیں۔ گھر والے کچھ ہی کھایا کریں۔ ہمارے والد کا بھی یہی حال تھا۔ یہ احتیاط بے فائدہ نہیں جاتی۔ اطبّا کی رائے میں عمرِ دراز اس احتیاط کا نقد انعام ہے۔

## سجّاد حسین، عابد حسین

سجاد حسین اپنے معاصرین میں سراپا برکت شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے نوجوانی میں حیدرآباد دکن کا راستہ لیا، اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کا زمانہ تھا۔ وہاں نظام کی سوار فوج میں ملازمت مل گئی، بعد میں رسالے کے افسر ہو گئے، عمر کا بیشتر حصہ حیدرآباد میں گذرا۔ وہیں شادی کی تھی، آخری دور میں چھپولس واپس چلے آئے۔ وطن کے عزیز ان کی بیوی کو دکھن والی کہتے تھے، نام سے کسی کو مطلب نہ تھا، ہمیں ہوش آیا تو ہم بھی دادی دکھن والی کہنے لگے۔ دادی دکھن والی کی نمایاں خوبی یہ تھی کہ خالص دکنی لہجے میں بات کرتی تھیں۔ چھپولس آکر انھوں نے اپنا وہی لہجہ برقرار رکھا اور ذرا سا بھی فرق واقع نہ ہونے دیا۔ بولنے میں پورا خیال رکھتی تھیں کہ نہ وہاں کا کوئی لفظ چھوٹے، نہ یہاں کا زبان پر آئے، مزاج میں محبت اور ملنساری تھی، برادری کی ساری عورتیں ان کا احترام کرتی تھیں۔

سجّاد حسین بالکل سپاہیانہ طبیعت کے انسان تھے۔ فوج کے لوگ خوش مزاج، خطر پسند، مستعد اور انسانی روابط میں مخلص ہوتے ہیں، مکّاری اور دنیا داری پسند نہیں کرتے، آپس میں ہمدردی سے پیش آنا اور وقت پر دوسروں کی مدد کے لیے تیار رہنا ان کی عادت ہوتی ہے۔ سجاد حسین کی ہمدردی کا ہر فرد قائل تھا، برادری ہو یا غیر برادری، سب ان کی نیک نیتی پر بھروسا کرتے تھے اسی لیے ان کے پاس دکھ درد سنانے والوں کو پہنچنے میں تکلّف نہ ہوتا تھا۔ وہ صحیح مشورے دیتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوا امداد بھی کرتے تھے۔ مزاج

کی سادگی کے باوجود سپاہی ایک خاص فلسفے کا قائل ہوتا ہے، یعنی جسم اور دماغ دونوں مضبوط رہیں اور دونوں کو عیبوں سے پاک رکھنا چاہیئے۔ سجاد حسین بذاتِ خود زمیندار تھے، لیکن لوگوں کو مقدمے بازی سے منع کرتے تھے۔ خصوصاً جھوٹا حلف اور جھوٹی گواہی ان کی نظر میں بیحد واہیات حرکتیں تھیں۔ دوسرے، جہاں کہیں جھگڑا فساد تیار دیکھتے فوراً موقعے پر جا کر فریقین کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سیدوں کا پرانا قاعدہ ان کو پسند نہ تھا کہ فریقین جھگڑے کے بعد فریاد کرتے ہوئے آئیں تب معاملے پر غور کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج کا سپاہی جو خیموں کے اندر بیابانی ہوا ئیں اور موسموں کی شدت جھیلتا ہے، جس کے کان گولیوں کی سیٹیاں اور توپوں کی گرج سن چکے ہوتے ہیں، اور جس کو علم ہے کہ زندگی اور موت میں ایک لمحے کا یا کہہ لیجیے کہ ایک بالشت کا فاصلہ بھی نہیں ہوتا، وہی امن کا مطلب اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وہ حیدر آباد سے ایک نوکر ساتھ لائے تھے، اس کو کہیں کام سے بھیجنا ہوا تو گھوڑے کی چال کا اشارہ، سرپٹ بیساختہ زبان سے نکلا، ورنہ دکن کی ٹکسال کا ڈھلا ہوا کوئی خالص حیدر آبادی لفظ بول گئے۔ جسے نوکر خوب سمجھتا تھا اور سننے ہی ہوا ہو جاتا تھا۔ سجاد حسین کے کوئی اولاد نہ تھی، اپنے بھتیجے زمرّد حسین کو ہی اپنی نشانی سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر زمرّد حسین نے بھی اُن کی اور اپنی چچی کی خدمت کا حق زندگی بھر ادا کیا۔ علی عباس ان کے دوسرے بھائی طفیل حسین کی یادگار تھے جو ہمیشہ لاہور میں رہے۔

سجاد حسین کا تعلق سید اکبر کے سلسلے سے تھا۔ سید اکبر کی تیسری پشت میں ایک بزرگ پیر محمد نام کے گذرے ہیں۔ ان کی نسبت سے پورا خاندان پیر کی پٹّی کہلاتا ہے۔

**عابد حسین** مذکورہ بالا سجاد حسین کے بھائی تھے۔ وہ عمر بھر وطن سے باہر کہیں نہ نکلے، زمینداروں میں یہ دستور تھا کہ خاندان کے افراد ملازمت پر چلے جائیں تو ایک آدمی وہیں رہے گا۔ جدّی جائیداد سنبھالنے کا قرعۂ فال عابد حسین کے نام آیا۔ انسانی حیات کی وسیع پیمانے پر ضمانت اسی میں ہے کہ کچھ لوگ زمین کے سینے سے فصلیں اُگاتے رہیں۔

امن کے زمانے میں نوعِ بشر کا پیٹ بھرنے کے لئے جفاکشی کرنا اور بدامنی پھیل جائے تو خاموشی سے گھر میں بیٹھ جانا، گاؤں کی مخلوق اپنا وجود سالم رکھنے کی ترکیب ہمیشہ سے جانتی ہے۔ طوفان ایسے حقیر درختوں کا کچھ نہیں بگاڑتا جو لچک کر زمین سے لگ جاتے ہیں۔ عابد حسین خود ہل نہ چلاتے تھے، عام طور سے سیدوں میں ہل چلانے کا قاعدہ تھا، مگر یہ کام انھوں نے اپنے نوکر جسرام چمار سے سیکھ رکھا تھا۔ اگر کبھی کھیت میں ہل کے دو چار چکّر گھمانے کا اتفاق ہو گیا تو بیحد خوش ہوتے تھے، جیسے مصوّر کو اپنے تازہ شاہکار کی تخلیق پر خوشی ہوتی ہے۔ جسرام کی تعریفیں اور زیادہ دل بڑھاتی تھیں، وہ کئی دن تک کھیت کے پاس سے گذرنے والوں کو دکھاتا رہتا تھا: "یہ ہلائی کے کھونڑ میاں نے نکالے ہیں۔" عابد حسین روز مرّہ کی دیکھ بھال کے معاملے میں ڈھیلے آدمی نہ تھے۔ تجربے نے خوب بتا رکھا تھا کہ آبادی سے جنگل کی طرف رُخ کرنے والی خلقت کو ناپسندیدہ سمجھنا چاہئے تاوقتیکہ پہلے سے نیت اور مقصد واضح نہ ہو۔

عابد حسین کے تصوّر میں زندگی ایک ہموار راہ تھی جس میں پستی اور بلندی کا اندیشہ نہ ہونے کے برابر تھا اور جدوجہد کی ضرورت بھی زیادہ نہ تھی۔ جنگِ عظیم اوّل سے قبل اور دو دہائی بعد تک، دیہاتی زمیندار سادگی اور سکون کے ساتھ بالکل الگ اور محفوظ دنیا میں رہتا تھا۔ آج صنعتی معاشرے کے آدمی کو دوسرے حالات کا سامنا ہے۔ شہر طاقتور مقناطیس ہیں اور اور گاؤں کا وجود تحلیل ہوا جاتا ہے۔

سادگی کی برکت اور طمطراق کی قباحت سے سب کو اتفاق ہے۔ دیہاتی بود و باش میں سادہ وضع کا ایک صریحی فائدہ یہ ہے کہ قریبی عزیز جو صبح سے شام تک پاس بیٹھتے ہیں اور ساری خبریں رکھتے ہیں، اپنی نہایت شدید ضرورتوں کی کہانیاں زیادہ نہ سنائیں گے اور اُدھار بھی کم مانگیں گے۔ عابد حسین یہ باریک نکتہ سمجھتے تھے۔ ان کی کاشت میں وسیع رقبہ تھا اور سالانہ آمدنی کا حساب اس ترکیب سے بٹھاتے تھے کہ کچھ فالتو رقم بچ رہتی تھی۔ خاموشی سے ذوالقربیٰ کے حکم پر عمل کرنے کی بات الگ رہی ویسے بذاتِ خود پوری احتیاط رکھتے تھے کہ جیب کی گرمی کا اندازہ دوسرے نہ کر پائیں۔ یہ زندگی کا ایک دور تھا جس کی بنیاد سادہ چلن،

پر تھی۔ طبیعت پر اس دور کے نقوش ہمیشہ باقی رہے اور زائل نہ ہوئے۔ دوسرا اور اس سے مختلف دور اس وقت شروع ہوا جب ہادی حسین نے ان کو اپنی جائیداد کا مختارِ عام بنایا اور خود گنج باسود ضلع بھیلسہ کی زمینداری اور وہاں کے معاملات نمٹانے کی خاطر لمبے عرصے تک وطن سے باہر مقیم رہنے لگے۔ اکثر ایسا ہوا کہ واپس لوٹنا چاہا بھی تو گلاب بائی کی محبت نے روک لیا۔ یہ دور عرصے تک جاری رہا۔ عابد حسین نے یہ زمانہ اس قدر انہماک سے گذارا، اور ایسے ناقابلِ فراموش تجربوں سے سابقہ رہا کہ ہر مہینہ بلکہ ہر ہفتہ کوئی تازہ روئیداد لے کر آتا تھا جو گذشتہ سے زیادہ دلچسپ ہوتی تھی۔ قدرتی بات تھی کہ وہ ان واقعات کو کبھی نہ بھولے۔ آخری عمر میں وہی قصے ان کی یادوں میں چراغ کی طرح جگمگاتے تھے۔ مختارِ عام کی حیثیت سے آئے دن تحصیل کچہری کا چکر، اہلکار دورہ کرنے آئیں تو خاطر تواضع، کام ٹھیک نہ بیٹھا تو دیہاتیوں کی دل لگی، تفریح، افواہ سازی اور تازہ گپ عجیب رنگ دیکھنے کو ملے اور طرح طرح کے تماشوں سے گذرے۔ عبرت کا تقاضا تھا کہ سارے حالات تفصیل سے کانٹ چھانٹ کیے بغیر دنیا کو بتائے جائیں۔ آخر کوئی تو یاد رکھے کہ عابد حسین کا بھی کیا عالم تھا اور کیسی ہوا تھی۔ میر کا قول غلط نہیں ہو سکتا۔ پھرتا ہے فلک برسوں، تب ہم جیسے آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگ مزے سے مسکراتے رہتے تھے۔ بہت سی باتوں کی تکرار پر اُن کے بیٹے ڈاکٹر زمرّد حسین کا جی گھٹتا تھا اور شرماتے تھے مگر بولنے کی مجال نہ تھی۔ گھر میں ڈاکٹر صاحب کی بیوی خورشیدی بیگم کے کان تک خبر جاتی تھی کہ فلاں قصہ بیان ہو رہا ہے تو خوب جی بھر کر ہنستی تھیں

○

## ڈاکٹر زمرّد حسین

ڈاکٹر زمرّد حسین کی پوری زندگی شہر میں بسر ہوئی، مگر طبیعت پر قصباتی اشراف کی تہذیب کا پکا رنگ تھا اور وہ رنگ کبھی نہ گیا۔ ان کو اپنے آداب کا ایسا ہی خیال رہتا تھا جیسے کسی پابندِ شرع آدمی کو نماز کا خیال رہتا ہے۔ عموماً شہر میں قصباتی شرفا اے

آداب نہیں چلتے۔ زمرد حسین کی گاڑی حسب دستور چلتی تھی، وہ فیاض آدمی تھے اور دوسروں کے ساتھ تواضع سے پیش آنا ضابطۂ اخلاق کی پہلی شرط تصوّر کرتے تھے۔ یہ امتیاز ان کو قبول نہ تھا کہ دیہات قصبات کی خاطر تواضع جغرافیا اور تاریخ کی مجبوری ہوتی ہے۔ آنے والا دور سے آیا اور مدّت کے بعد آنا ہوا، شہر کے ملاقاتیوں کی نوعیت اس طرح کی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر زمرد حسین کے طور طریقے دوسرے تھے۔ دونوں کے ساتھ عام مدارات سے بڑھ کر قصباتی انداز کی مفصّل تواضع ان کی خاص عادت تھی۔ اس خیال کا داخلہ ان کے ذہن میں ممنوع تھا کہ احباب ذرا سی دیر میں اپنے گھر میں واپس پہنچ جائیں گے اور بیشتر ایسے لوگ ہیں جن کا آنا روز رہتا ہے۔ دفتری عملے کے چھوٹے موٹے حاضر باش آسانی سے اشارہ پا سکتے تھے کہ خاص مہمان کی آمد دیکھ کر کھسک جایا کریں۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی۔

زمانے کی رنگا رنگ تماشہ گاہ میں ڈاکٹر زمرد حسین نے بہت سے بازاروں کی سیر کی تھی: پہلی جنگِ عظیم میں عراق کے محاذ پر گئے تھے، لاہور میڈیکل کالج میں اس وقت داخل ہوئے تھے جب ہندوستان میں اس فن کے پڑھانے والے مہیّا نہ تھے اور اساتذہ کا اسٹاف لندن سے لایا جاتا تھا، ملازمت کے سلسلے میں پہلے دہلی اور پھر میرٹھ میں ایک عمر گذاری تھی، باب المعاملات سے تعلّق رکھنے والے بےشمار متفرق تجربے گرہ میں رکھتے تھے، وہ حیوانِ دو پا جس کو آدمی کہتے ہیں، اس کی کونسی نیکی و بدی اور استادی و ہنرمندی ایسی تھی جس کو براہِ راست مشاہدہ کرنے، برتنے، بھگتنے اور سمجھنے کا اتفاق مکرّر نہ ہوا ہوگا، پھر بھی زمرد حسین کے مزاج میں نہ ذرا سی درشتی اور سختی پیدا ہوئی اور نہ رویّہ بدلا۔ وہ جیسے تھے ہمیشہ ویسے ہی رہے۔ علی الخصوص اس رائے سے سب کو اتفاق تھا کہ ان کا دل ہمدردی سے لبریز ہے، اور محبت کے احساس سے دھڑکتا ہے۔ ایسے افراد کم ہوتے ہیں جو بساط سے زیادہ نزدیک و دور کے عزیزوں پر احسان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ملک کی تقسیم سے پہلے جب تک میرٹھ میں قیام رہا حالات نہایت سازگار تھے۔ زمرد حسین کی طرف سے مروّت، کشادہ دستی اور تواضع کے بے دریغ اظہار میں کسی طرح کا فرق واقع نہ ہوا۔ نکتہ

چینوں کی کمی نہ تھی اور جس نے جو چاہا کہا، البتہ یہ اعتراض کسی کی زبان سے سننے میں نہ آیا کہ زمرّد حسین پہلی سی خاطر نہیں کرتے اور فی الحال وہ انداز نہیں رہ گیا ہے جو گذشتہ دنوں میں پایا جاتا تھا۔ وہ کمزوری ان کی ذات میں بالکل نہ تھی جو اکثر صاحب قسم کے بڑے آدمیوں میں پائی جاتی ہے کہ اپنے حاجتمند رشتے داروں کو چھوٹی موٹی نوکری پر چپکانے سے بیحد شرماتے ہیں اور سفارش کرنے کا معاملہ ہو تو بالکل ہی جان سوکھ جاتی ہے۔ زمرّد حسین کو وطن کے غریب، کم سواد اور بیکار ٹہلنے والے لوگوں کو روزگار سے لگانے کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔

زمرّد حسین ہمارے گھر کے داماد تھے۔ خورشیدی بیگم نے آکر مہر بانو کی جگہ لی تو رشتہ ٹوٹنے نہ دیا اور علی ہادی کو اپنے بھائی کی جگہ سمجھا۔ وہ مروّت اور محبّت کے آداب سے خوب واقف تھیں۔ اخلاق کی خوبی معمولی نہیں ہوتی۔ زمرّد حسین اور خورشیدی بیگم دونوں کے پاس یہ خوبی موجود تھی۔ زمرّد حسین تو خیر جہاں دیدہ اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ خورشیدی بیگم کی تربیت کو خداداد انعام کہنا چاہیئے۔ ایسی بلند ظرف ہستیاں کم نظر آتی ہیں۔ یہی میاں بیوی کے درمیان قدرِ مشترک تھی جس کی بدولت دونوں زندگی بھر ایک دوسرے سے خوش اور مطمئن رہے۔

خورشیدی بیگم کو احساس تھا لیکن اس میں تلخی کا شائبہ بالکل نہ تھا کہ شوہر طبیعت کے بادشاہ ہیں۔ گھر میں روزانہ دوستوں کی محفل اور مہمانوں کی رونق رکھتے ہیں۔ ان کے بچوں کو وہ سہولت حاصل نہیں جس کا رواج درمیانی طبقے میں پایا جاتا ہے، یعنی لوگ بچّوں کی تعلیم پر شروع سے خاص نظر رکھتے ہیں اور اپنی جیب کی کافی رقم اسی مد پر خرچ کرتے ہیں۔ زمرّد حسین کا اعلان تھا کہ بچّے اپنے شوق سے پڑھیں تو کون روکتا ہے، ساری ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی ہیں، اور کیا چاہیئے۔ خورشیدی بیگم نیم طنز اور نیم شکایت کے انداز میں کہتی تھیں، چھ مہینے کے لئے اپنا لشکر لے کر چھولس چلی جاتی ہوں اور چھ مہینے میرٹھ میں رہتی ہوں۔ ان کا اندیشہ بیجا نہ تھا۔

ابتدائی مرحلے پر میری تعلیم زمرّد حسین اور خورشیدی بیگم کی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ اُن

دونوں نے مجھے ہمیشہ اپنی اولاد کے برابر سمجھا اور اپنی سرپرستی میں جگہ دی۔ اتفاقیہ طور سے سبیل نکل آئی۔ اصل میں ہمارے والد کو جیوتشیوں کی پیشین گوئیاں سننے کا نہایت شوق تھا۔ دنیا بھر کے جیوتشی آتے تھے اور اُن کی خاطر تواضع رہتی تھی۔ ویسے وہ ضعیف الاعتقاد بالکل نہ تھے، ہوشیار انسان تھے۔ محض تفریحی مشغلہ چاہیے تھا۔ چرنجی پڑیا خاص چھوس کا رہنے والا مہینے میں ایک پھیری ضرور لگاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ آیا تو میں بھی بیٹھک میں والد کے پاس تھا۔ تقریباً دس سال کی عمر رہی ہوگی۔ میرا حال معلوم کرنے کے لیے چرنجی دیر تک پوچھتی اور گھورتا دیکھتا رہا۔ آخر تلک لگے ماتھے پر شکن ڈال کر اعتماد کے ساتھ بتلایا: "میاں کے بھاگ میں علم نا ہے" والد صاحب نے ذرا سی کراری حکمیہ آواز میں دوبارہ کہا: اچھی طرح دیکھو۔ چرنجی میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ میں اُس دن کا ماجرا کبھی نہ بھولا۔ آج تک جہاں کہیں دندان ساز کے بورڈ پر بتیسی والی ہنستی ہوئی شکل کی طرف نظر اٹھتی ہے تو چرنجی یاد آجاتا ہے۔

دادی اماں پر چرنجی کی پیشین گوئی کا حال کھلا تو انھوں نے ڈاکٹر زمرّد حسین کے کان تک بات پہنچائی۔ زمرّد حسین نے فوراً مجھے اپنے پاس میرٹھ بلا بھیجا اور فیض عام اسکول میں پانچویں جماعت میں داخلہ کرادیا۔ تیا اُن نے ذرا سی عمر میں انگریزی سکھادی تھی۔ اسکول میں انگریزی کی تعریف ہوئی۔ حساب کے استاد نے کئی دفعہ مار لگائی۔ پانچویں چھٹی کے بعد میرٹھ سے چلا آیا، ہائی اسکول پاس کر کے دوبارہ گیا۔ سائنس زمرّد حسین کے ایما سے پڑھی اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم ان کی نگرانی میں مکمل کی، وہ مجھے ڈاکٹر دیکھنا چاہتے تھے، میں اپنی لاپروائی سے ڈاکٹر نہ بن سکا، البتہ جو کچھ بھی بنا اور اتفاقات نے بنایا، راہ ڈاکٹر زمرّد حسین نے دکھائی تھی۔ آگے چل کر زندگی میں جو کچھ حاصل ہوا، اور آج تک مزے سے گذارتا ہوں، اس کا سارا ثواب اور سارا حساب زمرّد حسین اور خورشیدی بیگم کے کھاتے میں جاتا ہے۔

ڈاکٹر زمرّد حسین ایسی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو تقسیم کا المیہ دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوئی۔ تاریخ ایسے دردناک اور بھیانک منظر کم پیش کرتی ہے۔ پنجاب آگ اور خون کا دریا

بن گیا اور ہمارے پھوپھا زمرّد حسین مہاجرت کرنے والی بیشمار خلقِ خدا کے ساتھ اسی آگ اور خون کے دریا کو عبور کر کے ایک طرف سے دوسری طرف پہنچے۔ پاکستان جا کر ڈاکٹر زمرّد حسین نے اپنی متروکہ جائیداد کا مطالبہ پیش کرنے میں نہایت تکلّف سے کام لیا۔ حالانکہ عابد حسین چھولس کے بڑے زمیندار تھے۔ مزاج کی قلندری نے نہ دفتروں کا چکّر لگانے کی اجازت دی، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے دیا۔ مجبوریوں کا دباؤ ہو تو غالبؔ کا بتایا ہوا بلند اصول بہت کم بندگانِ خدا یاد رکھ پاتے ہیں : اے خانماں خراب نہ احسان اٹھائیے

## میر کرم علی

میر کرم علی فارسی پڑھاتے تھے اور راجہ صاحب دتیا کے استاد تھے۔ دتیا بندیلکھنڈ میں جھانسی سے نزدیک ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ راجہ صاحب نسلاً راجپوت تھے اور اُن کے اجداد نے مغل حکومت کی اہم خدمات انجام دی تھی۔ انھوں نے پرانے امرا کی طرح اپنے استاد کا اعزاز ملحوظ رکھا اور زندگی بھر دتیا سے باہر کہیں جانے نہ دیا۔ وہاں میر کرم علی مختصر سا مدرسہ چلاتے تھے، شاگردوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ بیشتر ریاست کے عہدیدار ٹھاکروں کے بچے تھے جن کی راجہ صاحب سے رشتہ داری تھی اور برادری کا ناتا تو سب ہی کا تھا۔ گویا خصوصی نوعیت کا مدرسہ کہنا چاہیے۔ جیسے بعد میں انگریزوں نے پہاڑی مرکزوں پر دولت مند ہندوستانیوں کی اولاد کو صاحب بنانے کی غرض سے قائم کیے تھے۔ ٹھاکر میر کرم علی کی دانشمندی کا اعتراف اور اُن کی ذات کا احترام کرتے تھے۔ دتیا میں ان کی زندگی نہایت آرام سے گذری۔ بڑھاپے میں گھر چلے آئے۔

فارسی صدیون تک ہندوستان کی سرکاری اور دفتری زبان کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ بتدریج اس کو ایک تہذیبی علامت کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ فارسی سے واقفیت تہذیب کی سند تصوّر ہوتی تھی۔ تغیّر زمانے کا مزاج سہی، معاشرے کے عام رواج کافی دیر میں تبدیل ہوتے ہیں۔ انڈین نشینلزم کا غلغلہ خوب شروع ہو چکا تھا۔ جہاں اس کے

بہت سارے مقاصد واضح تھے وہاں ایک یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے تمدنی آثار و علائم پر سیاہ برش پھیرنا ہے۔ پھر بھی اتفاق ایسا ہوا کہ فارسی کی مقبولیت میں کچھ دن اور فرق نہ آیا اور جیسا کہ انگریزی زبان کا محاورہ ہے، زندہ رہنے کا ٹھیکا تھوڑا سا مزید مل گیا۔ عام طور سے اشراف کا طبقہ تہذیب کے معاملہ میں قدامت پسند ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں قدیم تہذیبی قدروں کی حفاظت یہی طبقہ کرتا ہے۔ ہندو روسا کا مزاج بھی ایسا ہی تھا۔ وہ فارسی ضرور پڑھتے تھے۔ عوام سے امتیاز اور فاصلہ رکھنے کی خاطر بھی اچھی بات تھی کہ فارسی سے تعلق کا سلسلہ چلتا رہے۔ تاریخی تسلسل اور ماضی کی یاد میں سالم رکھنے کا سوال الگ تھا، پرانے وقتوں میں ان کے باپ دادا بہت بڑے لوگ تھے اور فارسی بول سکتے تھے۔ غیر ملکی زبانوں کا تسلط ہندوستان کی قسمت رہی ہے۔ آزادی سے پہلے اس قسم کے نمونے مل جاتے تھے۔ غالباً مہاراجکمار وجیانگرم ہندو والیانِ ریاست میں آخری بزرگ رہے ہوں گے جن کو فارسی پر معقول عبور تھا۔ شاہ ایران محمد رضا پہلوی ہندوستان آئے (سنہ ۱۹۵۶ عیسوی) اور ہندوؤں کے شہر مقدس، وارانسی، کی سیر کے لیے تشریف لے گئے تو شاہ سے مہاراجکمار نے فارسی میں باتیں کیں۔ شب کی ضیافت میں جو مہاراجکمار کے محل میں ہوئی شاہ ایران کے ساتھ میزبان کے علاوہ راجہ صاحب بنارس اور راجہ صاحب پنڈراول (ضلع بلند شہر) میر سید اکبر علی خاں کے بیٹے سید رضا علی خاں کھانے کی میز پر شریک تھے۔ جمہوریت کے نظام نے اس طبقے کا وجود جڑ سے صاف کر دیا۔

میری دادی صغریٰ بیگم، میر کرم علی کی واحد اولاد تھیں۔ میر کرم علی کی شادی جارچے میں ہوئی تھی۔ دادی اماں اکثر سناتی تھیں کہ میں بالکل بچی تھی جب میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ مجھے نانی اپنے ساتھ لے گئیں اور میری پرورش نانی کے گھر جارچے میں ہوئی۔ وہیں سے رخصت ہو کر یہاں تمھارے دادا کے گھر آئی۔ میرے نانا طبیب تھے۔ انھوں نے مجھے خاص توجہ سے پڑھایا۔ وہ چاہتے تھے کہ مجھے مختصر طور سے طب بھی سکھائیں اور نسخے یاد کرائیں، اس غرض سے اپنے ساتھ مطب میں لے جانے لگے۔ میں تھوڑی سی بڑی ہو گئی تو نانی نے مطب میں جانے سے روک دیا۔

میر کرم علی تقریباً جنگِ عظیم اوّل (سنہ ۱۹۱۴ء) سے کچھ پہلے دنیا کی سکونت چھوڑ کر چھولس واپس آ چکے تھے۔ وہ اس وقت بوڑھے تھے مگر پڑھنے پڑھانے کی دلچسپیاں برقرار تھیں اور اپنے ساتھ کافی کتابیں لے کر آئے تھے۔ عالمِ اسلامی میں دوسرے مقامات پر ایسا نہ سہی، برِّصغیر کے مسلمان چونکہ سیکڑوں برس صریحاً اقلیت ہونے کے باوجود حاکم رہے تھے، لہٰذا خاص طرح کی سیرت اور خاص اطوار کی تشکیل قدرتی بات تھی۔ یہاں سرکاری عہدہ پانا اصلی ترقی اور حکومت کی بڑی سی کرسی پر بیٹھنا صحیح کامیابی سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ معلّمی پیشے کی بابت کیا تصوّرات ہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جارحے میں ترقی، یعنی کرسی پانے کی تھوڑی سی مثالیں ہیں، لیکن چھولس کی خلقت کو بہت زیادہ احساس ہے کہ ہم نے بالکل ترقی نہیں کی اور یہاں کوئی آدمی، یعنی کہ بہت بڑا افسر، کبھی پیدا نہیں ہوا۔ واقعی بات صحیح ہے۔ مجھے علی گڑھ میں اس قسم کی گفتگو سننے کا اکثر اتفاق ہوا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کا مجموعی دور، غزنویوں کا ابتدائی عہد چھوڑتے ہوئے، جو کہ دو حصّوں میں بانٹا جاتا ہے، عہدِ سلطنت اور مغل عہد، دونوں کا عرصۂ زمانی یکساں ہے۔ سلطان محمد بن سام غوری سے ابراہیم لودی تک ۳۳۴ برس، اور وہ دن کہ ہندوستان کی جامع مسجدوں میں بابر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا جب سے اس دن تک کہ حضرت ابوظفر بہادر شاہ نے قلعۂ معلّیٰ کو خیرباد کہا: شما را عیش خوش باد در ایں خانہ کہ من رفتم، تین سو اکتیس ۳۳۱ برس، مجموعی حساب دونوں طرف برابر سمجھئے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ عہدِ سلطنت کی جو کتابیں محفوظ رہیں اور ہم تک آئیں، ان کی تعداد، معیار اور کیفیت سے قطعِ نظر بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس مغل عہد کے علمی و ادبی سرمائے پر نظر ڈال کر حیرت کی حد نہیں رہتی۔ علوم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں بچا جس پر ہمارے باپ دادا نے تالیف و تحقیق کا ذخیرہ یادگار نہ چھوڑا ہو۔ مسلمان ہر میدان میں علمی جستجو کرتے نظر آتے ہیں۔ سیاسی زوال ہوتا رہا پھر بھی تخلیقی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہ آیا، بلکہ الٹا معاملہ ہوا کہ زوال کی مدّت میں کتابوں کی تصنیف و تالیف کا شوق اور زیادہ ترقی کی طرف بڑھا۔ اس پر لطف یہ کہ کیفیت و کمیّت دونوں اعتبار سے معیار بلند نظر آتا ہے۔ لبِّ لباب یہی سامنے آیا اور نتیجہ یہی نکلا کہ عہدِ سلطنت

میں افرادی قوت کم تھی۔ جس قدر افراد تھے سب کو سلطنت کا بوجھ سنبھالنے اور امورِ مملکت انجام دینے میں لگنا پڑتا تھا۔ کتابیں پڑھنے اور لکھنے کے لئے دوسرا ماحول اور سراسر دوسری جنس کی مخلوق چاہیئے۔ مغل عہد میں نقشہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ افراد کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور علمی مزاج کے لوگ امورِ سلطنت کے بکھیڑوں سے جان بچا کر مسلسل پڑھائی لکھائی کے کام میں لگے رہے۔ محض علم کی طلب اس طبقے کا مقصود تھا۔ اٹھارویں صدی کے انگریز ادیب ڈاکٹر جانسن کے اس قول نے غیر معمولی شہرت حاصل کی کہ کسی معاشرے یا ملک کی عظمت و آبرو کا پیمانہ وہاں کے اہلِ قلم اور مصنفین ہوتے ہیں۔ اس سے بھی پہلے خواجہ حافظ نکتے کی بات کہہ چکے تھے: فراغتے و کتابے، و گوشۂ چمنے، خواجہ کی تاکید میں کیا نزاکت پوشیدہ ہے، یہ راز معلمی پیشہ آدمی ہی جانتا ہے، وہ نہ تو خود کو بڑا آدمی سمجھتا ہے، نہ بڑے لوگوں سے مطلب، نہ بڑی مہمات سے واسطہ، پھر بھی برابر سوچتا رہتا ہے کہ کچھ کر کے مروں گا۔ اس کی کیفیت بالکل اس شاعر کے حسبِ حال ہوتی ہے جو اپنی محبوبہ سے، بلکہ شاید بیوی ہو، بگڑ کر کہتا ہے: مانتا ہوں میں نے زندگی بھر کچھ نہیں کیا، قطعی بھاڑ جھونکا، پھر بھی ایک کام تو کر ہی دیا: اینقدر بس کہ ترا بر سرِ ناز آوردم۔

میر کرم علی کے شاگردوں میں راجہ صاحب دتیا کے علاوہ بلکہ ان سے بھی زیادہ قابلِ ذکر کوئی اور شاگرد تھا تو بس ایک ہی تھا۔ وہ میرے باپ سید علی ہادی تھے۔ والد صاحب کو فقط اپنے نانا سے یا تھوڑا بہت منشی محمد رفیع سے پڑھنا نصیب ہوا۔ مدرسے میں باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی۔ علی گڑھ جانے کے لئے کالا ٹرکش کوٹ سل کر تیار ہو چکا تھا، مگر ہادی حسین بیمار ہو کر بسترِ مرگ پر لیٹ رہے اور والد فوراً زمین جائیداد کے جھمیلوں میں پھنس گئے۔ مطالعے کا شوق تھا، جو کچھ سیکھا، ادب، شاعری، قانون، سیاست سب ذاتی محنت سے سیکھا، پھر بھی بہت کچھ جو سیکھنا چاہیئے تھا، رہ گیا۔ رقعاتِ عالمگیری کو آسمانی کتابوں کے بعد سب سے بڑی کتاب سمجھتے تھے اور عالمگیر کی طرف منسوب مقولے مثلاً "رعایائے ہند ظلم پسند است"، وغیرہ، ہر وقت تکیۂ کلام کے طور پر بولنے کی عادت تھی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ عملی زندگی میں ہمارے والد کا پہلا قدم ہموار اور نرم زمین پر نہیں

پڑا۔ ہادی حسین کی وفات کے وقت چار بچے کے ایک بزرگ ننھیالی رشتے داری کی بنا پر والد کے ماموں ہوتے تھے۔ سارے خاندان کی رائے ہوئی کہ ان کو مختارِ عام بنا دیا جائے۔ انھوں نے یہ عنایت فرمائی، خدا جانے کیا سوجھی، کہ والد کے خلاف مال خورد برد، زبردست بدعنوانی اور لاکھوں کی جعلسازی کا مقدمہ تیار کر کے چپکے سے گرفتار کرا دیا۔ والد کی عمر سترہ سال فقط، نہ کم نہ زیادہ، بحید دُبلے اور سوکھے آدمی، جسم پر گوشت کا نام نہیں، اور عمر کے لحاظ سے جس قدر وزن ہونا چاہیئے اس سے بہت کم تھا۔ حوالات میں دن بھر روئے پیٹے، فولاد کی سلاخیں کہاں سنتی ہیں۔ ہادی حسین کے ایک پرانے دوست، سیٹھ بلدیو پرشاد، گنج باسودا کی مہاجن برادری میں سب سے بڑی حیثیت کے آدمی شمار ہوتے تھے۔ وہ شام کو مجسٹریٹ کے گھر پہنچے اور کہا کہ لڑکا جسمانی اعتبار سے کمزور اور نابالغ ہے، رئیس زادہ ویسے، اگر رات کو حوالات میں کچھ ہو گیا تو خواہ مخواہ مصیبت کھڑی ہو گی۔ مجسٹریٹ ضمانت منظور کرنے پر راضی ہو گیا۔ البتہ دعوے کی سنگینی اور مالی نوعیت کے پیشِ نظر بہت بڑی نقد رقم داخل کرنے کی شرط لگائی۔ سیٹھ بلدیو پرشاد نے اشرفیوں کی تھیلیاں لے جا کر مجسٹریٹ کے سامنے رکھ دیں۔ والد صاحب حوالات سے باہر آئے تو اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا، بہر حال سیٹھ جی کی یہ کوشش کامیاب ہو گئی کہ رات حوالات میں نہ گزارنے دوں گا۔ وہ اگلے دن سیٹھ بلدیو پرشاد کے نام مختار نامے پر دستخط کر کے ایسے نکلے کہ برسوں گنج باسودا کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا۔ سیٹھ جی نے اس مدافعت کے ساتھ کہ مدعا علیہ نابالغ ہے، مقدمے کی پیروی اپنے ہاتھ میں لی۔ دس برس مقدمہ چلا، بالآخر کامیابی ہوئی اور جائیداد ہمارے والد کے حق میں بحال رہی۔ اس عرصے میں سیٹھ جی کے زمیندارانہ ٹھاٹ سے ناراض ہو کر خاص ان کی برادری کے لوگ ہمارے والد کو خفیہ طور سے بلانے لگے اور اصرار کیا کہ سیٹھ جی کو ہٹائیے، جائیداد اپنے ہاتھ میں لیجیے، یہ لوٹ مچا رہا ہے۔ ایک لالہ صاحب نے تو اپنے میل میں شراکت کی پیش کش کی۔ علاقہ سارا پہاڑی، میل کا ٹیوب ویل دور فاصلے پر ندی میں لگا تھا۔ سیٹھ جی کا جب جی چاہتا تھا نوکروں کو بھیجا، پائپ کٹوایا اور پانی کی سپلائی روک دی۔ ہمارے والد کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا تھا، مختار نامہ منسوخ نہ کروں گا۔ سیٹھ جی

میرے محسن ہیں۔ زمیندار عموماً سیر چشم ہوتے تھے اور سود و زیاں کی پروا اس طبقے کو کم ہوتی تھی۔ میرے والد معمول زمینداروں سے ہی مزاج و یسا ہی تھا، اس کو ضد کہہ لیجیے۔ سیٹھ بلدیو پرشاد کو ڈرامہ کرنا بھی آتا تھا۔ حساب کتاب کے معاملے میں والد نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور وہ فوراً ہادی حسین کی دوستی کو یاد کر کے رو پڑتے تھے۔ مقامی مخالفتوں کا فائدہ بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ سیٹھ جا ہر سال ایک فرضی حساب اور کچھ نقد رقم ہمارے والد کو مسلسل بھیجتے رہے۔ والد بھی خوش رہتے تھے کہ گھر بیٹھے رئیس گنج باد سودا کہلاتے ہیں۔ ایک قباحت یہ تھی کہ بیماریوں نے زندگی بھر ستایا۔ گنج باد سودا کے معاملات سخت مستعدی چاہتے تھے۔ چھولس چھوڑنا پڑتا، یہ بھی نازک سوال تھا، قصہ مختصر یہ کہ ۱۹۴۷ء آگیا۔ وہ پرانا نظام ایک ڈوبتا سورج تھا۔ کب تک غروب نہ ہوتا۔

میر کرم علی ماہ رمضان کے روزے رکھتے ضرور تھے اور دنیا سے واپس آکر تو بالکل پابند ہو گئے تھے۔ البتہ بہت سے معاملات میں ان کا ذہن روایتی انداز سے ہٹ کر سوچنے کا عادی تھا۔ خاص احباب کی نشست میں دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ روزہ عربوں کے وحشیانہ خصائل میں نرمی پیدا کرنے کی غرض سے نازل ہوا تھا، ساری دنیا کے مسلمان مفت میں پھنس گئے۔ فقہا نے مسئلے پر نظر ثانی کرنے کے بجائے اس کو ارکانِ دین میں داخل کر لیا۔ شریعت جو قانون سازی کا دوسرا نام ہے، اکثر یا تو مصلحت تک پہنچ نہیں پاتی یا آنکھ چرا جاتی ہے۔ اسی طرح روزہ داروں کی حرکتیں خصوصاً افطار اور سحر کی بے اعتدالیاں ان کو قطعی پسند نہ تھیں اور علانیہ مذاق اڑاتے تھے۔ یعنی رمضان آیا اور حیوانی جبلت ابھر کر سامنے آگئی، انسان اور حیوان کا فرق رخصت ہوا۔ عقل کا منشا جبلتوں کو بے لگام ہونے سے روکنا ہے، رمضان نے بے تحاشا کھانے کا جواز پیدا کر دیا، چھوٹ مل گئی، خدا کی خوشنودی اسی میں ہے تو بھئی خوب حاصل کیجیے۔

امام غزالی کے ابتدائی سوانح اور احوال سے جو لوگ واقف ہیں وہ یقیناً اتفاق کریں گے کہ اگر دانشور اپنی فکر کو آزاد چھوڑ دے تو کہاں تک جا سکتا ہے۔ کس قدر سوالیہ نشان سر اٹھاتے ہیں اور کیا اندیشے سامنے آتے ہیں۔ آج کل دانشوری کی روایت کا بہت نام لیا

لیا جاتا ہے، غور کیجیے تو مسلمانوں میں یہ روایت مسلسل موجود اور متحرک نظر آتی ہے۔

عزاداری کے سلسلے میں بھی میر کرم علی کا رویّہ عام قصباتی شیعوں سے مختلف تھا۔ مختصر بستیوں میں رہنے والی شیعہ برادری کے پاس وقت کی کمی نہیں ہوتی۔ مجلسوں سے غیر معمولی شغف کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ میر کرم علی کا معمول تھا کہ عشرۂ محرم کی مجلسوں میں پابندی سے شریک ہوئے اور پھر گھر بیٹھ گئے۔ طبیعت مطالعے کی عادی تھی۔ دستور کے مطابق جارچہ چھولس میں نائی مجلس کا بلاوا دینے نکلتا تھا۔ میر کرم علی کے پاس پہنچا اور سمجھیے کہ گرفتار ہو گیا۔ حقّہ تازہ کیا، چلم بھری، دوسرے کاموں کا حکم مل گیا، یہاں جا، وہاں جا، وہ خوشامد کرتا تھا، بلاوے کو دیر ہو جائے گی۔ میر کرم علی کا خیال تھا، اور اس کے اظہار میں تکلّف نہ کرتے تھے، کہ افراط سے مجلسوں کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ دوسرے شیعہ فرصت کے اوقات کو ضائع کرتے ہیں اور تعمیری کاموں کے نہیں رہ جاتے۔ عزاداری کے جلوس کی بابت بھی کہتے تھے کہ تعزیہ وعلم کی حد تک صحیح، مگر ہوشیار رہنا چاہیے کہ اس مقدّس رسم پر ہندوؤں کی رام لیلا کا سایہ نہ پڑ جائے۔

جارچہ چھولس کے سیّدوں کا دور تک معائنہ کر جائیے، واضح ہو جائے گا کہ نہایت حقیر بساط اور بعید معمولی لوگ، مگر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ہر معمولی فرد اپنی ذات کے اندر ایک طویل ماضی لیے پھرتا ہے اور اس کا وجود قطرے کی طرح وقت کے بہتے ہوئے دریا کا حصّہ ہے، ہماری ہستی مرہونِ حباب اور تاکید حق بجانب: چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے، پھر بھی انسان دنیا کا مستقل شہری ہے اور اس کارخانے کی رونق کو ہزاروں برس سے سنبھالے ہے۔ سادات جارچہ چھولس کا جہاں تک تعلق ہے، کم از کم عالمگیر کے بعد سے علانیہ شیعہ ہیں۔ اس فرقے کی ابتدا کا پہلا دن حقیقت میں وہاں سے شمار ہوتا ہے جب رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آخری حج سے واپس تشریف لاتے ہوئے اپنے وصال سے ٹھیک ۹۰ دن قبل مقامِ غدیر پر خطبہ ارشاد فرمایا اور خطبے کے بعد ایک خیمے کے اندر رات گئے تک مبارکباد کا جشن ہوتا رہا۔ تجربہ شاہد ہے کہ ابلاغ انتہائی دشوار عمل ہے۔ اگر کہنے والے کے منہ سے ایسی بات نکلی جو سننے والے کو اچھی نہ لگی یا مفاد سے ٹکراؤ ہوا، تو ذہن میں ردّ وقبول کی کشمکش کا باعث بن جائے گی۔

عقل بہانہ جو واقع ہوئی ہے اور تاویلات کا عجیب ہیر پھیر کھڑا کرنا جانتی ہے۔ غدیر کی اہمیت مسلّم الثبوت، لہٰذا فطری طور سے اعتراضات واختلافات، طعن وتشنیع اور تضحیک وتمسخر کا ہدف بننا چاہیے تھا۔ اقلیتی جماعتوں کا المیہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اُن کے خلاف رسوائی اور افترا پردازی کا بازار بہت جلد گرم ہو جاتا ہے۔ اقلیت کو بدنام کرنا بہت آسان ہے۔ اسماعیلی تحریک اور اسماعیلیوں کے مشہور داعی حسن ابن صباح پر تحقیق کے ضمن میں پروفیسر محمد حبیب، علی گڑھ میں تاریخ کے استاد، مذہبی طبقے کی شکایت کرتے ہیں کہ ان کی طبیعت فحش باتوں کی طرف فوراً لپکتی ہے اور پست لطیفے ایجاد کرنے میں زبردست پھرتی دکھاتی ہے۔ غدیر کے سلسلے میں خیریت یہ ہوئی کہ اخلاقی انحرافات کے قصے جو مشہور ہوتے ان بزرگوں کی اختراع نہیں ہیں جو قسمیں کھا کر سناتے اور پھیلاتے ہیں۔ اصل میں مسیحیت پہلی دفعہ روم میں داخل ہوئی تو عیسائی مبلّغین کی کامیابی کو روکنے کی غرض سے وہاں کے قدیم باشندوں نے اُن پر گھناؤنے الزامات عائد کیے (ایڈورڈ گبن: زوالِ سلطنت روما، سولھواں باب)۔ الفاظ کی تبدیلی کے بغیر وہی تہمتیں وہاں سے اٹھا کر شیعوں پر چسپاں کر دی گئی ہیں۔ عبرت کا سبق یہ حاصل ہوا کہ فحش اور واہیات بہتان سخت جان ہوتے ہیں، دور تک جاتے ہیں، دیر تک جیتے ہیں، اور متعدی بیماریوں کی طرح ایک قوم قبیلے کی جان چھوڑ کر دوسرے کی آبرو کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں۔

○

## محمد حسنین، محمد مہدی

محمد حسنین نور پور میں رہتے تھے، موٹے نمبردار کی عرفیت سے مشہور تھے، نام کوئی نہ لیتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ نور پور کا تصور موٹے نمبردار اور اُن کی اونچی کرسی کی چوپال کے بغیر دشوار تھا۔ نور پور اور موٹے نمبردار دونوں ہم معنی لفظ تھے۔ محبّت سے پیش آنا محمد حسنین کی خاص عادت تھی، وہ جانتے تھے کہ دنیا کس قدر بے رحم واقع ہوئی ہے۔ تھوڑی سی شرافت سے رعب نہیں کھاتی اور کام نہیں چلتا۔ سب کو اپنا گرویدہ بنانے کے لئے بہت زیادہ نیکی

اور انسانیت پاس ہونا چاہیئے۔ اس بات کو نظر میں رکھ کر جو ایثار بھی زندگی بھر کرنا پڑا ہو، لوگ ان کے بےحد قائل تھے۔ مثلاً اگر کبھی افواہ اڑ گئی، ظاہر ہے مسخرے کب مانتے ہیں۔ کہ عید کی نماز کے بعد عید گاہ کی پشت پر پھیلے ہوئے میدان میں سیّدوں کی دوڑ ہوئی اور موٹے نمبردار سب سے آگے نکل گئے، تو برادری میں یہ کہنے والا کوئی نہ تھا کہ ایسا ناممکن ہے یا کیوں کر ہو گیا۔ کسی کو اچھا نہ لگتا تھا کہ موٹے نمبردار کے نام پر ذرا سا بھی حرف آئے۔

نورپور میں مکھیا کے تقرّر کا قصّہ کھڑا ہوا۔ محمد حسنین سے زیادہ بڑی حیثیت کا آدمی کوئی نہ تھا، مگر کسر یہ تھی کہ معقول زمیندار ہونے کے باوجود زمینداروں والی چلت پھرت بالکل نہ آتی تھی، محض میرے باپ کے اثرات پر بھروسہ کیا۔ میرے باپ نے تحصیلدار سے دوستی اور اُن کی نسلی شرافت پر بھروسہ کیا۔ تحصیلدار صاحب ضلع میرٹھ کے کسی نوابی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد حسنین کے پشتینی سلسلے میں ذرا سے فاصلے پر تین چار بھائیوں کا ایک خاندان تھا۔ اُن کو واقعی زمیندارانہ استادی کے داؤ یاد تھے۔ انھوں نے یہ کیا کہ ایک دن تاروں کی چھاؤں میں اچکنیں پہن کر چپکے سے تحصیل کا راستہ پکڑا۔ وہاں بغیر کسی کو درمیان میں ڈالے براہِ راست ایک عدد خالص گھی کی ھنڈلی، ایک ٹوکری میں کچھ انڈے، اور دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر مبلغ پانچ روپیہ نذرانہ تحصیلدار کو پیش کیا، خوب چکنی چپڑی باتیں ملائیں۔ تحصیلدار نے بڑے بھائی کو مکھیا بنانے کی سفارش کلکٹر کی منظوری کے لئے بھیجدی۔ محمد حسنین کا معاملہ مزید بگاڑنے کے لئے ان کے خلاف تفصیلی رپورٹ لکھی: میں نے نورپور کا معائنہ کیا، وہ موٹا آدمی ہے، بھاری چارپائی پر بیٹھتا ہے، بڑا سا حقّہ سامنے رکھتا ہے، بہت لمبا ڈھیلا کرتا پہنتا ہے، بالکل کانگریسی معلوم ہوتا ہے، انگریزی سرکار کا وفادار نہیں ہو سکتا۔" میرے باپ ضلع کے ایک اپنے سے بھی بڑے رئیس کو ساتھ لے کر انگریز کلکٹر کے پاس بھاگے دوڑے، وہ نہ مانا، تحصیلدار کی تحریر پتھر کی لکیر تھی۔

قدرتی طور سے محمد حسنین کی شخصیت پُروقار تھی، اس سے بھی زیادہ وقار اور وزن ان کی بات میں تھا۔ اُن کے مُنھ سے جو کچھ نکل گیا وہی سب نے مان لیا۔ مشہور تھا

کہ موٹے نمبر دار بات بالکل کھری کہتے ہیں اور جھوٹ نہیں بولتے، بول بھی نہ سکتے تھے۔ اس لیے کہ چالاک آدمی نہ تھے، البتہ "قسمیہ" ان کا تکیہ کلام تھا، گفتگو شروع کرنے سے پہلے یا بعد میں احتیاطاً "قسمیہ" ضرور کہتے تھے، جیسے عدالت میں کچھ بھی بیان دینا ہو حلف نامہ لگانا لازمی ہوتا ہے۔

محرّم آتے ہی نمبر دار کی چوپال امام باڑے میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ ایّام عزا میں اُن کا اہتمام اور انہماک دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ ملک کی تقسیم سے پہلے تک نور پور میں شب کی مجلس اور ذوالجناح کے جلوس کی رونق یادگار ہوتی تھی، جارچہ اور چھولس دونوں جگہ کی خلقت وہاں پہنچتی تھی اور بہت شاندار مجمع ہو جاتا تھا۔

محمد حسنین کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بھتیجوں کو نہایت شفقت سے پالا اور تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھا۔ ایک بھتیجا، ابن علی، منصبیہ کالج میرٹھ کا فارغ التحصیل تھا۔ عزیز الحسن سب سے بڑے بھتیجے ہیں۔ وہ اپنا خاندانی سلسلہ جلیسر والے دادا سے بتاتے ہیں۔ دوسری اطلاع عزیز الحسن سے یہ حاصل ہوئی کہ ہمارا خاندان نور پور میں پہلے آباد ہوا، میر سیّد علی کی اولاد چھولس میں ہمارے بعد آئی، واللہ اعلم۔ اصل میں میر سیّد حسن سبزواری کے سات بیٹوں میں سے ایک کا نام سیّد ابراہیم تھا۔ سیّد ابراہیم کا مزار جلیسر میں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نور پور کے سیّدوں کو تین شاخوں میں تقسیم کریں تب حساب صحیح بیٹھے گا: ۱۔ سیّد ابراہیم کی اولاد ۲۔ سیّد علی اصغر کے سلسلے سے متعلق قادر علی کی نسل، اور ۳۔ ایک گھر سیّد اکبر کے اخلاف کا آباد تھا جس کے کُل افراد پاکستان مہاجرت کر گئے۔

ہمارے گھر کا سب سے قریبی رشتہ نور پور میں محمد حسنین کے کہنے سے چلا آتا ہے۔ میرے دادا کی دو بہنوں کا بیاہ اُن کے خاندان میں ہوا تھا۔ الٰہی بیگم اور آمنہ بیگم دونوں کے شوہر سیف علی اور محمد مہدی، سگے بھائی تھے اور محمد حسنین والی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ الٰہی بیگم اور آمنہ بیگم نے دختری اولادیں چھوڑیں۔ نواسوں میں علی الترتیب نذیر حسین اور شبیہ عباس سے نسل جاری ہے۔

محمد مہدی نور پوری علمی ذوق کے آدمی تھے۔ عربی اور فارسی کتابوں کا جو ذخیرہ ہمارے

والد تک پہنچا، ان میں بعض کے حاشیے پر "محمد مہدی نور پوری" کے دستخط ثبت ہیں۔ وہ حیثیت کے اعتبار سے نہ امیر تھے نہ غریب تھے۔ آرام سے زندگی بسر ہوتی تھی۔ سواری کے لئے رتھ اور منجھولی کا خواب کبھی نہ دیکھا۔ ایک درمیانہ سا گھوڑا پاس رکھتے تھے جیسا کہ بیشتر سیّدوں کا قاعدہ تھا۔ برصغیر کے دیہات قصبات میں مسلمان شرفا کا ایک طبقہ مدتوں موجود رہا جس کی نرالی عادتیں تھیں۔ ان کا اصرار تھا کہ پڑھنے لکھنے کے مشاغل میں وقت گذاریں گے اور محض تہذیبی دلچسپیوں سے سروکار رکھیں گے۔ ہمارے ان بزرگوں نے بظاہر کچھ نہ کرنے کے باوجود ایک کام کیا، ان کی معمولی بساطِ تسلیم، پھر بھی وہ "مردانِ مست" اگر بغداد اور قرطبہ کی روایات تک نہ پہنچ سکے تو بخارا اور شیراز کی میراث کو ضرور سینے سے لگائے رہے۔ ملک کی تقسیم اور خاتمۂ زمینداری کے بعد دنیا بدل گئی، مسلمانوں کا وہ خوش حال طبقہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا۔ وہ صورتیں قصباتی زندگی میں اب کہاں نظر آتی ہیں، محض یاد باقی رہ گئی ہے، تاریخ زماں ہست فسانہ بہ فسانہ۔

○

## منشی محمد علی

محمد علی کی سکونت نور پور میں تھی۔ خوش حال زمیندار تھے، تحت اللفظ ذاکری کا شوق تھا، اور اس فن کو سیکھنے میں جان لگائی تھی۔ علی الخصوص مشہور تھا کہ اُن کی زبان سے مرثیہ سُن کر بیساختہ خواجہ حافظ شیرازی کا قول یاد آجاتا ہے: قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است۔ ایک دفعہ محمد نذیر انجینیر نے اُن کو اپنے گھر مجلس پڑھنے کے لئے مدعو کیا۔ سامعین اشتیاق کے ساتھ پہنچے اور کشادہ ہال باہر تک بھر گیا۔ محمد علی نے رسمًا رباعی سلام سے افتتاح کر کے، جیسا کہ پرانے ذاکروں کا قاعدہ ہے، میر انیس کا مرثیہ شروع کیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میر انیس نے مدینے سے کربلا کی روانگی کے حال میں دو مرثیے اس انداز سے کہے ہیں کہ دونوں کی بحر اور ردیف ایک ہے: ۱۔ فرزندِ پیمبرؐ کا مدینے سے سفر ہے ۲۔ کنعانِ محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے۔ دوسرا مرثیہ خوبصورت استعارات اور عالمانہ بلاغت سے بہت زیادہ آراستہ ہے۔

شاید انیس اپنے مخصوص اور منفرد طرزِ بیان سے ہٹ کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ میرزا دبیر کا رنگ کونسا مشکل ہے، وہ بھی دبیر کے رنگ میں کہہ سکتے ہیں۔ محمد علی نے وہی مطلع پڑھا:

کنعانِ محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے

(کنعان، فتح = زبر) ۔ نیچے سے محمد نذیر نے اصلاح کی گرہ لگائی، کِنعان: (کسرہ = زیر) محمد علی نے مرثیہ بند کر دیا اور کہا لُغت منگا لیجئے۔ مجلس میں سناٹا چھا گیا۔ منبر پر ذاکر کو ٹوکنا جسارت کا فعل تھا۔ محمد نذیر بوڑھے ضرور تھے، مگر محمد علی بھی کوئی مبتدی نہ تھے۔ ان کو درسیات میں شامل سارے علوم اور خاص طور سے فارسی کی متداول کتابوں پر کامل عبور تھا، معانی و بیان کی نزاکتوں کو جانتے تھے، تاریخی تلمیحات سے گہری واقفیت تھی۔ اور انیس و دبیر کے استعمال کیے ہوئے صنائع بدائع ہر وقت ذہن میں حاضر رہتے تھے۔ غرضکہ مجمع نے ہڑبونگ مچادی۔ محمد علی منبر پر جم کر بیٹھ گئے اور اصرار کیا کہ لغت فیصلہ کردے گی تب آگے بڑھوں گا۔ پڑھے لکھے بزرگوں کو موشگافی کا موقع ہاتھ لگا۔ بے پڑھی خلقت مُنہ پھاڑے تماشا دیکھتی تھی۔ محمد علی نے منبر سے اتر کر اپنے گھر کا راستہ لیا۔ خاص اہتمام کی مجلس کا اس طرح درہم برہم ہونا لوگوں کو پسند نہ آیا، سب نے چپکے سے بانیٔ مجلس کو ذمہ دار قرار ٹھہرایا اور اعتراض کا نشانہ بنایا۔ سامعین رخصت ہو گئے اور محمد نذیر نے لُغت دیکھی تو سخت ندامت ہوئی۔ کنعان کا تلفظ واقعی فتح = زبر سے تھا۔ وہ شام کو بیس پچیس آدمیوں کا ہجوم ساتھ لے کر محمد علی کے پاس معذرت کرنے نورپور پہنچے، ان کو گلے سے لگایا، اپنے اشتباہ کا علانیہ اعتراف کیا، اور بار بار شرمندگی کا اظہار کرتے رہے۔ محمد علی کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا، نورپور کے لوگ بہت خوش ہوئے، سب نے ایک زبان ہو کر کہا، واہ، محمد علی کا جواب نہیں ہے۔ جھنڈا گاڑ دیا، قسمیہ۔ جارچے خبر پہنچی تو دو چار حضرات خوشی کا اظہار کرنے اور مرحبا کہنے کے لئے دوڑے ہوئے آئے۔

منشی محمد علی کا تعلق سید اکبر والے سلسلے سے تھا۔ غالباً اُن کے دادا گلزار حسین یا ایک دو پشت اوپر کے کوئی بزرگ اپنے خاندان، پیرکی پٹی کا ٹھکانا چھوڑ کر نورپور میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ چار بھائی تھے (محمد علی[1]، امجد علی[2]، وصی حسن[3]، محمود الحسن[4])۔ تواضع

انکسار، اور وضعداری میں سب برابر، مگر خداداد لیاقت اور علم و فضل کے اعتبار سے محمد علی کی شہرت زیادہ تھی۔ آج کل کے دانشمند خداداد لیاقت کے ذرا کم قائل ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ذہن کی استعداد مسلسل ریاضت اور باقاعدگی کے ذریعہ بلند ہوتی ہے۔ محمد علی نے واقعی جاں فشانی سے علمی مزاج پیدا کیا تھا۔

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ پڑھنے لکھنے سے طبیعت میں جو خاص طرح کی نفاست پیدا ہوتی ہے وہ دیہاتیوں کے لیل و نہار سے جوڑ نہیں کھاتی۔ زمینداروں کے ساتھ ایسا معاملہ نہ تھا۔ وہ شاعر کی اس خفیہ ہدایت کا مطلب سمجھتے تھے کہ "تالابوں میں رہو اور دامن تر مکن ہشیار باش" انھوں نے گاؤں میں جی لگانے کے مشغلے ڈھونڈھ رکھے تھے۔ مثلاً ان کے معمولات میں باغ لگانے کا شوق ضروری تھا۔ اس کام میں اختراع اور تنوّع کے خوب موقعے تھے۔ محمد علی بھی باغ کے شوقین تھے۔ ان کی ملکیت میں بڑا سا باغ تھا جس میں فربہ درختوں کی نہایت افراط تھی۔ خاص طور سے آموں کے سلسلے میں کہا جاتا تھا کہ اُن کے باغ میں طرح طرح کے آم پائے جاتے ہیں۔ وہ آموں کی جنیات پر کامیاب تجربے کرتے رہتے تھے اور لوگوں کو ان کے مشورے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ہمارے والد کو انھوں نے اپنے ہاتھ سے تیار کئے ہوئے متعدد قلم تحفے میں دیے تھے۔ والد کی عادت تھی کہ ان درختوں کے آم دوستوں کو کھلاتے وقت یا گھر میں ہم سب کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہوا تو کبھی محمد علی کا ذکرِ خیر ضرور کرتے تھے۔ یہ ہر سال ایک پرانے دوست کی یاد تازہ کرنے کا طریقہ تھا اور ایک رسم سی بن گئی تھی۔

شومیٔ قسمت، محمد علی کی آخری منزل ایک دردانگیز المیہ اور ناگہانی حادثہ تھا، جس کی کسی کو دُور دُور ذرا بھی خبر نہ تھی۔ وہ وقت سے بہت پہلے دنیا کو خیرباد کہہ کر رخصت ہو گئے۔ نورپور کا نقشہ آزادی اور خاتمۂ زمینداری سے قبل ایسا تھا کہ سیّد زمیندار اور تعداد تھوڑی سی۔ مسلمان راجپوت کاشتکار اور وہی غالب تعداد میں وہاں آباد تھے۔ راجپوتوں کے دل میں نہ کبھی سیدوں کے خلاف زمیندار کاشتکار والی رقابت پیدا ہوئی اور نہ جداگانہ مسلک کے باوجود برتاؤ میں فرق آیا۔ دونوں ہمیشہ سے

مکمل اعتماد کے ماحول میں رہتے تھے۔ بدقسمتی کہیے، ایک دن کسی معمولی سی بات پر سیدوں اور راجپوتوں کے لڑکے آپس میں جھگڑنے لگے۔ محمد علی کے کان میں شور وغل کی آواز گئی، ان کے سامنے مرثیوں کا بستہ کھلا تھا اور بیٹھے مرثیہ لکھ رہے تھے، اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے۔ فوراً بھاگ کر بیچ بچاؤ کرانے کی غرض سے دونوں فریقوں کے درمیان میں گھس گئے۔ عین اسی وقت کسی لڑنے والے کا لٹھ محمد علی کے سر پر لگا، چوٹ شدید تھی وہ ایسے بیہوش ہوئے کہ پھر ہوش میں نہ آئے۔ ہنگامہ کرنے والوں کو ذراسی دیر پہلے تک احساس نہ تھا کہ ان کے ہاتھ اپنی بستی کی سب سے زیادہ قابل فخر، نیک سیرت اور بے قصور ہستی کے خون میں رنگین ہونے والے ہیں۔

آدمی کے حوصلے کی اصل پہچان یہی ہے اور جوانمردی اسی کا نام ہے کہ وہ دوسروں کی سلامتی کے لئے جان پر کھیل جائے۔

○

## حیدر عباس (نورپوری)، شبیہہ عباس

حیدر عباس کے پاس زیادہ بڑی جائیداد نہ تھی، حالانکہ نورپور کے اکثر سیدوں کی ملکیت میں مزروعہ آراضی کے لمبے رقبے تھے۔ مگر ان کو قاعدے سے زندگی گذارنے کی ترکیب آتی تھی۔ خوش پوشاک رہنے کے عادی تھے اور شخصیت سے وجاہت کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کا اصول تھا کہ بستی اور برادری کے قضیوں میں بالکل نہ پڑنا چاہیئے اور جہاں تک ہوسکے دور رہنا چاہیئے۔ وہ قدرتی طور سے شرمیلے آدمی تھے، کوئی اختلافی معاملہ کھڑا ہوا، اور انھوں نے خانہ نشینی اختیار کی۔ فریق بن جانا تو در کنار، احتیاط کا تقاضا تھا کہ رائے بھی محفوظ رکھو، منافقت سے سخت پرہیز کرو، خاموش رہنا سب سے بڑی خیریت کی بات ہے۔ حیدر عباس نے اپنے اس انداز میں زندگی بھر ترمیم اور تبدیلی کو ضروری نہ سمجھا۔ اگر انسان تہذیب اور پاکیزگی کا مدرسہ کہلائے جانے کا مستحق ہے تو یہ تشبیہہ حیدر عباس کی ذات پر صادق آتی تھی۔

قصبات دیہات میں پرانے وقتوں سے ذاکری کا ایک خاص طریقہ چلا آتا تھا جس کو حدیث خوانی کہتے تھے۔ وہ رواج آج کل شہروں سے مولویوں کی ریل پیل نے بالکل ختم کر دیا ہے، شاید کہیں دور افتادہ بستیوں میں ابھی تک باقی ہو۔ حدیث خوان منبر پر بیٹھا، مصائبِ اہلِ بیتؑ، خصوصاً واقعاتِ کربلا کی کسی ایک روایت کو دل گداز لحن میں بیان کرنا شروع کیا اور وقفے وقفے کے ساتھ حاصل کلام کے طور پر مرثیوں کے شاہ بیت اشعار لگاتا چلا گیا۔ شعر بلند ترنّم سے پڑھے جاتے تھے۔ حدیث خوان کی آواز میں غیر معمولی درد و سوز ہوتا تھا۔ عام طور سے حدیث آدھا گھنٹہ جاری رہتی ہوگی۔ اختتام دست بہ سینہ کھڑے ہوکر نوحے پر ہوتا تھا۔ نیچے بیٹھے ہوئے دو تین آدمی آواز ملا کر نوحہ سنبھالتے تھے۔ اتنی سی مختصر مدت میں مجلس کا مقصد حاصل ہو جاتا تھا اور پورا مجمع محسوس کرتا تھا کہ ایمان تازہ ہو گیا۔ حیدر عباس انور پوری بھی حدیث پڑھتے تھے، زمزمے کی خداداد برکت پائی تھی اور ایسی مہارت پیدا کر لی تھی کہ بڑے بڑے تحت اللفظ پڑھنے والے ذاکروں کو اُن کی کامیابی پر رشک آتا تھا۔

○

**شبیہ عبّاس** حیدر عباس کے بھتیجے اور ان کے بھائی ظفر عباس کی واحد اولاد تھے۔ ماں کی ننھیال کے اتنے بڑے کنبے میں لے دے کے فقط میرے باپ کا دم تھا۔ ظفر عباس کا انتقال ہوا تو وہ بالکل کم عمر تھے، تعلیم و تربیت کچھ تو حیدر عباس کی نگرانی میں ہوئی اور کچھ میرے باپ نے معاملہ سنبھالا۔ میرے ماں باپ دونوں سے اُن کا گہرا تعلق تھا اور انھوں نے ہمیشہ ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھا۔ شبیہ عباس منصبیہ کالج میرٹھ کے فارغ التحصیل تھے، جہاں جارجہ جھولس کے لڑکوں کی چھوٹی سی فوج بیشتر اوقات جمع رہتی تھی۔

طالب علمی کے زمانے سے جس بچّے کو سختی کا مُنہ دیکھنا پڑ جائے وہ اوّل دن سے سوچتا ہے کہ جہاں زندہ رہنا مشکل سوال ہے وہاں دوئم درجے کا معمولی اور پھسڈی

طالب علم بن کر رہوں، دنیا بھر کی ذلت اٹھاؤں، فائدہ کیا ہوگا اور مستقبل کہاں لے جائے گا۔ اس کی سمجھ میں یہ نکتہ باریک خوب آجاتا ہے کہ زبردست عرق ریزی کے بغیر کسی رعایت اور سہولت کا دروازہ کھلنے والا نہیں ہے۔ وہ پہلا مقصد یہ قرار دیتا ہے کہ جو ساتھ پڑھنے والے ہر وقت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ایسی قابلیت پیدا کر کے دکھاؤں کہ چونک پڑیں، اور جن استادوں کا رحم کھانے کے لئے بھی جی نہیں چاہتا وہ دل سے اعتراف اور قدر کرنے لگیں۔ انسان ہمیشہ کا جادوگر ہے۔ خوابیدہ صلاحیتوں کو جگانا اور حرکت میں لانا کیسا ہی امر دشوار ہو سیکھ ہی لیتا ہے۔

شبیہہ عباس ذہین آدمی تھے، مذہبی تربیت کے باوجود مزاج میں شگفتگی کی افراط تھی اور مہذب بذلہ سنجی کا فن خوب آتا تھا۔ ایسے افراد جن کے نزدیک زندگی جوانی اور جوانی زندگی ہے، یعنی بڑھاپے کے روح فرسا تجربے تک پہنچتے ہی نہیں، ان کو ایک فائدہ بھی ہوتا ہے: نہ دل اندر سے مرجھاتا ہے اور نہ اوپر سے شکل مرجھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہمیشہ تازہ اور شاداب نظر آتے ہیں۔ شبیہہ عباس کے جینے میں یہی خوبی اور دلکشی تھی جو آخری وقت تک برقرار رہی، بیمار اور کمزور ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ موت آدمی سے یہ تقاضا کہاں کرتی ہے کہ پہلے کچھ بیمار ضرور رہیئے پھر انتقال فرمایئے۔

مجھے اپنے ذکر خیر کا شوق نہیں، شبیہہ عباس سے اس نوعیت کا ارتباط تھا کہ مجبوراً اپنی اوقات شریف کے سلسلے میں ذرا سا اشارہ کرنا پڑے گا۔ میرے والد ان کے ماموں تھے اور میں رشتے کا بھائی تھا۔ وہ شاعری کے شوقین تھے اور شاید یہ متعدی بیماری منصبیہ کالج سے لگا کر نکلے تھے۔ کتابوں سے سنجیدہ محبت اور مطالعے میں انہماک واستغراق نسلی اثرات کا نتیجہ تھا جو خون میں رواں دواں تھا۔ میری کیفیت، جب ہوش سنبھالا اور شبیہہ عباس سے قریب ہوا، بالکل دوسری تھی۔ عموماً گرمیوں کی تعطیلات میں گھر رہنا ہوتا تھا۔ ہماری مردانہ بیٹھک کا نقشہ ایسا تھا کہ سامنے والے لمبے دالان در دالان میں ہمارے ابا اور ان کے تمام احباب دوپہری گذارتے تھے۔ پہلو میں دو کمرے، بہت سوچا، تاش کھیلنے کے علاوہ دوپہری کاٹنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔ لڑکے جمع

ہوجاتے تھے۔ چونکہ بچّے کھلاڑی سے تپّا پھینکنا کسی نے نہ سیکھا تھا اس لیے خاموشی سے کھیلنے کے بجائے سب مل کر غل مچاتے تھے۔ سوال یہ تھا، برادرِ بزرگ مولانا شبیہہ عباس کہاں جائیں۔ ہمارے کمرے سے ملحقہ اندر کی طرف ایک کمرہ اور تھا۔ وہاں کتابیں رکھی تھیں۔ لمبے چوڑے تخت پر ایک اتنا ہی لمبا چوڑا پرانا قالین جو دادا کبھی کربلا یا مشہد سے لائے ہوں گے، اور کم وبیش نیل گائے کی برابر گاؤتکیہ، اس پر شبیہہ عباس لیٹ جاتے تھے۔ انھوں نے تھوڑے ہی دن میں ایسا نفسیاتی کرتب دکھایا کہ مجھے بعد میں اکثر حیرت ہوئی۔ نہ تاش کے کھیل کی مذمت، نہ شور مچانے کی شکایت، مجھے بلا کر پاس بٹھایا اور دنیا بھر کی دلچسپ باتیں سنانے پر آگئے۔ میرا جی لگنے لگا تو فارسی کی کتابیں نکال کر پڑھانا شروع کیا اور کہا آگے ذراسی عربی بھی پڑھاؤں گا۔ تاش کھیلنے والے لڑکوں نے یہ ماحول دیکھا تو چپکے سے کھسک گئے۔ میں بالکل نہ جانتا تھا اور نہ ان کو خبر تھی کہ یہ اتفاقی تعلیم آگے چل کر میرے کام آنے والی ہے۔

گریجویشن کے بعد، میں سائنس چھوڑ کر قانون کی تعلیم پر لگ گیا۔ دوستوں نے مذاق اڑایا۔ ضمناً فارسی ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں اس قسم کی اجازت تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد علی گڑھ میں عالم یہ تھا کہ بیشتر جوان اساتذہ نے یونیورسٹی چھوڑ کر پاکستان کا راستہ لیا۔ یہ صورت کئی برس تک جاری رہی۔ تقریباً ہر شعبے میں جگہ خالی تھی۔ پروفیسر ہادی حسن، فارسی اور اسلامی علوم کے مشہور و معروف فاضل نہایت شفیق استاد تھے۔ اتفاق سے وہ بھی کیمبرج یونیورسٹی سے سائنس کے گریجویٹ تھے۔ انگریزی زبان کا ایسا فصیح البیان خطیب اور حیرت انگیز شخصیت کا آدمی برّصغیر کی یونیورسٹیوں کو کم میسّر آیا ہوگا۔ امتحان کا نتیجہ آگیا تو انھوں نے بلایا، اور دیر تک یہاں وہاں کی باتیں کرتے رہے۔ حالات کے انقلاب کا سب کے دل پر اثر تھا۔ کہا سرحد پار نہ کرنا، اور بتلایا، لکچرر کی پوزیشن خالی ہے، تم مناسب رہو گے۔ وہ عادتاً ذاتی قسم کی گفتگو بھی انگریزی میں کرتے تھے۔ میں نے ادب سے عرض کیا کہ قانون کے پیشے میں قسمت آزمائی کا ارادہ کرچکا ہوں۔ ان کی عالمانہ دلیلوں نے خاموش کردیا۔

نہ کوشش نہ سفارش، نوکری مل گئی، حالات ایسے ہی تھے۔ خلاصہ یہ کہ شبیہہ عباس کی تربیت نے سمت متعین کی اور آنے والے چالیس برس کے لئے میرے مستقبل کا فیصلہ ہو گیا۔ اگر ہو سکا، کوئی تالیف یادگار چھوڑ کر گیا اور اس کی شہرت میرے ساتھ رخصت نہ ہو گئی تو ہمیشہ فارسی کا آدمی کہلاؤں گا۔ یہ خیال نہ کبھی شبیہہ عباس کے دل سے گذرا اور نہ انھوں نے اس قسم کی تاکید کی کہ مجھے بھی یاد رکھنا ایسا راستہ دکھائے دیتا ہوں، سیدھے بڑھتے چلے جاؤ گے کہیں دقت نہ ہوگی۔ وہ بالکل دوسری جنس کے آدمی تھے جیسا کہ کوئی شاعر کہہ گیا ہے:

قفلِ شکستہ درِ میخانہ ایم ما

○

## مصطفیٰ بیگم

مصطفیٰ بیگم کے باپ کا نام کرامت علی تھا اور داروغہ اقبال حسین کے ساتھ ان کی شادی ہوئی تھی۔ کرامت علی کے جدِّ امجد میر سید خان کا نکال جارچے کے چہارم والو سے شمار ہوتا ہے۔ اہلِ جارچہ کے مورثِ اعلیٰ، میر سید حسن سبزواری کی بابت تفصیل سے معلوم ہے کہ سید مبارک شاہ کے دربار میں ایک مقتدر امیر تھے۔ میر سید خاں اُن کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے بھی امرا کے حلقے میں جگہ پائی۔ ممکن ہے بہلول لودی کا زمانہ دیکھا ہو یا بعد کے کسی بادشاہ کی حکومت میں عروج حاصل ہوا ہو۔ سید خان ان کا خطاب ہے، نام نہیں ہے، جس سے ان کے مرتبے کا ثبوت ملتا ہے۔ صریحی طور سے واضح نہیں کہ کس بادشاہ نے سید خان، کا خطاب عنایت کیا۔ بہرحال خطاب علم، نقارہ صرف بادشاہ کی طرف سے عطا ہوتا تھا۔ شجرہ بھی معاملے کی سراغرسانی میں کچھ مدد نہیں کرتا۔

چھولس میں میر سید خان کی اولاد کے چار پانچ گھر ابتدا سے آباد چلے آتے تھے۔

یہ خاندان سیّد خانی کہلانے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرامت علی کے علاوہ دیگر افراد کے پاس زیادہ آراضی نہ تھی۔ چھولس کی شمال مشرقی سمت میں زرعی جائیداد کا بہت بڑا خطّہ کرامت پورہ کہلاتا ہے۔ اس سے کرامت علی کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ گذشتہ روایتیں بھی یہی تصدیق کرتی ہیں کہ کرامت علی وسیع زمینداری کے مالک تھے۔

مصطفیٰ بیگم کی سسرال کے بزرگ چار پانچ پیڑھی اوپر کوئی حافظ جی تھے۔ جن کا نام فی الحال اُن کی نسل کے افراد کو بھی یاد نہیں رہ گیا ہے۔ حافظ جی کی مناسبت سے خاندان کے لوگ حافظ پوتے کہلاتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں احسن عباس کی عمر نوّے ۹۰ برس سے متجاوز پہنچ چکی ہوگی۔ وہ بتلاتے ہیں: "حافظ جی کا نکال گیدھیوں میں سے تھا، نام میں بھول گیا۔ یاد آگیا تو بتادوں گا۔ سارا کنبہ جاہل، جیسا کہ گیدھیا کے لقب سے ظاہر ہے۔ حافظ جی ان لوگوں میں پڑھے لکھے اور نیک سیرت پیدا ہوئے۔ بالکل درویش صفت انسان تھے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے کہ جب محلّہ گڑھی میں مسجد کا وجود نہ تھا۔ گڑھی کی مسجد تو محمد نذیر انجینیر نوکری سے رٹائر ہوکر آگئے (سنہ ۱۹۱۰ء کے قریب) تب انھوں نے بنوائی ہے۔ حافظ جی کو نماز کے لئے بار بار آنے میں زحمت ہوتی تھی، وہ اپنا گھر چھوڑ کر مسجد کے پاس آگئے اور چھپر ڈال کر رہنے لگے۔ جہاں اب بازار میں اقبال حسین کی دو منزلہ بیٹھک ہے، یہ اصل میں کشمیریوں کا مردانہ مکان تھا۔ سامنے والے احاطے میں اُن کے گھوڑے بندھے رہتے تھے۔ حافظ جی مرنے لگے تو وصیّت کی کہ میں عمر بھر کشمیریوں کے پاس بیٹھا، یہی میرا کفن دفن کریں گے۔ اُن کی وصیّت کی تعمیل ہوئی۔ چھپر کے چھوٹے سے مکان میں حافظ جی کی اولاد بدستور رہتی رہی۔ افضل حسین کے وقت سے یہ گھر ترقی کرتا ہے اور برادری میں سب سے بڑی حیثیت کا گھر شمار ہونے لگتا ہے۔ افضل حسین عالم آدمی تھے اور سوجھ بوجھ بہت پائی۔ اُن کے بیٹے اقبال حسین انسپکٹر پولیس ہوگئے۔ چھولس میں سب انسپکٹر متعدد ہوئے۔ اقبال حسین کے علاوہ انسپکٹر کے درجے تک کوئی نہ پہنچا۔ جارچے والوں کی بات اور ہے، وہ ہمیشہ ہم سے آگے رہے۔ صدر الاسلام جارچے کی نسل سے تھے، آزادی کے بعد عرصے تک پولیس کے سپرنٹنڈنٹ رہے۔

لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ عیانؔ کے بھائی تھے۔ ہادی حسین کی بیوی ان کے کُنبے کی تھیں۔ لہٰذا اس رشتے سے علی ہادی عیان وغیرہ کی بابت کہا کرتے تھے کہ "میرے ماموں نانے ہیں"۔ احسن عباس اس بیان کے راوی ہیں۔

جرّار حسین ہمارے معاصرین میں اس خاندان کے واحد فرد ہیں جن سے چھولس نہ چھوٹا۔ دیگر افراد پاکستان مہاجرت کر گئے۔ جرّار کی تعلیم منصبیہ کالج میرٹھ میں ہوئی تھی، فارغ ہو کر ایک کالج میں اُردو پڑھانے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں کے تعلیمی اداروں سے اُردو کا صفایا ہوا تو ہمدرد میں جا کر نوکری کر لی۔ عرصے تک دہلی میں مقیم رہے۔ تھوڑے دن ہوئے چھولس واپس آ گئے ہیں۔ وہ شاعر ہیں، دہلی کے مشاعروں میں ہر جگہ بلائے جاتے تھے۔ دعوت نامہ نہ آیا تو خود ہی پہنچ گئے۔ مشاعرہ کبھی نہ چھوڑتے تھے، اُن کا قول تھا کہ مشاعرے کی خبر سننا اور نہ جانا سخت غیر مناسب بات ہے۔ شاعروں کی برادری ایسے آدمی کو بہت پسند کرتی ہے: اس کی سب سے جان پہچان ہو جاتی ہے اور امید کرنے لگتا ہے کہ بہت جلد رونق محفل کا خطاب پا جاؤں گا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ مشاعرہ میں پھسپھسا شعر پڑھے تب بھی چاروں طرف سے داد کی آوازیں آتی ہیں اور سب مل کر واہ واہ کا شور مچا ڈالتے ہیں۔ جرّار چھولسی کی نظر ان نزاکتوں پر ہمیشہ رہتی تھی۔ شجرے کی بابت پوچھا تو اندازہ ہوا یہ جرّار کے ذوق اور دلچسپی کی چیز نہیں ہے۔ تفصیل اور صحت کے ساتھ کچھ یاد نہ تھا۔ عباس حسین، اُن کے دادا، اقبال حسین کے سگے بھائی اور امیر بانو، ان کی ماں اقبال حسین اور مصطفیٰ بیگم کی بیٹی تھیں۔ میں مطلب کی معلومات نکالنے کی کوشش میں لگا رہا، حالانکہ وہ علیل تھے، تنفس قابو میں نہ تھا اور دمے کے موذی مرض نے نیم جان کر دیا تھا۔ آخر جرّار کو ایک واقعہ یاد آیا: "ہمارے دادا، عباس حسین نے ایک دفعہ ہمارے چچا علمدار حسین سے کہا کہ جا رہے جاؤ اور خاندانی شجرہ لے کر آؤ۔ انھوں نے لا کر دیا تو کہنے لگے، یہ کیا اٹھا لائے۔ ہمیں لوگ گیدھیا کہتے آئے ہیں، یہ اوپر جا کر گیدھیوں کے کُنبے سے کہیں نہیں ملتا۔ پھر ذرا سی دیر سوچ کر بولے، خیر، شجرہ تو ہے، جدھر بھی جا ملا۔

اقبال حسین کی ملازمت کا عرصہ پورا ہوا اور سبکدوش ہو کر گھر واپس آئے تو میاں بیوی کے اطوار سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ مدتوں باہر رہ کر آئے ہیں اور نہایت عیش کے ساتھ گذاری ہے۔ دونوں کو وہی پرانے چلن یاد تھے اور سیدھے سادے طریقے سے رہنے کی عادت تھی۔ وطن، برادری اور دو تین پشتوں کے بزرگوں کی روایات سے ان کا رشتہ ویسا ہی مضبوط تھا اور ذرا بھی ڈھیلا نہ ہوا تھا۔ وہ دونوں آتے ہی سب کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے جیسے کہیں گئے ہی نہ تھے۔ اقبال حسین کی طبیعت میں نیاز مندی کی حد تک انکسار تھا اور سب ان کی سادگی کی تعریف کرتے تھے۔ ملازم موجود، مگر ان کا دستور تھا کہ بیٹھک کی طرف لوگوں کو آتے دیکھا اور چلم لے کر کھڑے ہو گئے۔ اگر کسی کی زبان سے نکلا، اجی داروغہ جی، یہ آپ کیا کر رہے ہیں، تو کہتے تھے، نہیں بھائی، کیا مضائقہ ہے، اس بہانے ہاتھ پاؤں کو حرکت دے لیتا ہوں۔

مصطفیٰ بیگم کا گھر اُن کے لئے ایک مکمل دنیا تھا جس میں خوشی اور غم سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ دونوں سے نمٹنے کا ظرف، تربیت اور سلیقہ رکھتی تھیں۔ گھر کے سارے انسان حیوان ان کی منشا کے پابند تھے اور کوئی ان کی گرفت سے باہر نہ تھا، مرد، عورتیں، بچے، ملازم، مویشی، حتیٰ کہ پڑوس کی ایسی خلقت جو گاؤں کے گھروں میں بغیر اجازت اور بے روک ٹوک آتی جاتی ہے۔ وہ حسب مراتب تمام مستحقین اور دور پاس کے سارے قرابتداروں کا خیال رکھتی تھیں، یہی مصطفیٰ بیگم کا سب سے بڑا کمال تھا۔ شیخ سعدیؒ کا مقولہ ہے کہ مشک بولتی ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ درپردہ سلوک کبھی درپردہ نہیں رہتا، ضرور جھانکنے لگتا ہے۔ مصطفیٰ بیگم کی فیاضیاں روشن نہ ہوتیں، یہ ممکن نہ تھا۔ ساری بستی میں چرچا ہونے تک شہرت ہو گئی کہ داروغہ جی کے گھر میں ہیرے اور جواہرات ہیں۔ اصل میں وہ مصطفیٰ بیگم کے احسانات، نوازشیں اور نیکیاں تھیں جو ہیروں کی طرح جگمگاتی تھیں۔

اقبال حسین کے مزاج کی سادگی اور خاکساری مشہور تھی اور ایک مثال بن گئی تھی۔ یہ خوبیاں ان کی سیرت کا قدرتی عنصر تھیں اور ان کے اظہار میں شعور کا کوئی دخل نہ تھا۔

لیکن دنیا اور اس کے معاملات سے نمٹنے کے لئے مضبوط حواس خمسہ کے علاوہ جو چھٹی حس درکار ہوتی ہے، جسے عقل عملی سمجھ لیجئے، اس کی بھی کمی نہ تھی۔ انھوں نے دو عدد نہایت شاندار مکان، ایک مردانہ، دوسرا زنانہ، بنانے میں دل کھول کر لاگت لگائی، بازار میں اونچی کرسی کی دو کانوں کی لمبی قطار، عریض اور طولانی چبوترے سمیت بنوائی، ان دو کانوں کے بعد نقب زنی کی وارداتوں میں کمی آگئی، ورنہ بازار میں نقب زنی کا رواج پرانے وقتوں سے چلا آتا تھا۔ جھولس میں جائدادیں مہنگی قیمت دے کر خریدیں اور مقامی زمینداری بڑھائی، حالانکہ بعض کا خیال تھا اتنی رقم میں وہ چھوٹا موٹا گاؤں خرید سکتے تھے، جارچہ جھولس کے عین درمیان میں راستے کے سہارے ایک باغ لگایا، اس کی پرورش میں خوب پیسہ خرچ کیا اور مدتوں لگے رہے۔ کوشش صحیح اور نیت سالم ہو تو مقصد ضرور پورا ہوتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ جارچہ جھولس کی برادری میں ان کے خاندان کا مقام بلند ہو۔ ویسے اقبال حسین کا اخلاق ہی ان کے احترام کی ضمانت اور ان کی عزت بڑھانے کے لئے کافی تھا۔

افضال حسین اور ظفریاب حسین، اولاد نرینہ میں مصطفیٰ بیگم اور اقبال حسین کے دو بیٹے تھے۔ انھوں نے دونوں کے مستقبل کا منصوبہ سوچ کر تیار کیا اور اسی کے مطابق تربیت کی۔ ابتدا میں علی گڑھ بھیجا، دونوں کچھ عرصہ ظہور وارڈ میں رہے، جو بچوں کا مشہور ہوسٹل تھا، ظفریاب حسین کو ظہور وارڈ کے بہت سے قصے یاد تھے۔ مگر دونوں بھائی وہاں سے دہلی چلے گئے اور ہائی اسکول کا امتحان دونوں نے اینگلو عربک اسکول دہلی سے پاس کیا۔ اقبال حسین کی استطاعت تھی کہ چاہتے تو اعلیٰ تعلیم دلاتے۔ دونوں بچے عام ذہانت کی سطح سے بلند تھے۔ یہ اقدام طے شدہ منصوبے سے انحراف ہوتا۔ وہ جانتے تھے کہ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم آدمی کے اندر شہری مزاج پیدا کرتی ہے اور آخر کار پکا شہری بنا کر چھوڑتی ہے، لہٰذا آگے پڑھانا فضول بات تھی۔ اقبال حسین اپنی آئندہ نسل کا رشتہ جھولس سے مستحکم رکھنا چاہتے تھے۔ افضال حسین کو یو پی پولیس کے امتحان میں بٹھایا، کچھ اپنے اثرات سے کام لیا ہوگا، وہ باپ کی مرضی کے مطابق تھانیدار ہو گئے۔ اس زمانے میں، جنگ عظیم اول سے پہلے اور

ذرا بعد تک، تھانیداری سے ملازمت شروع کرنے والوں کے لئے اوپر ترقی کا راستہ آسان سمجھا جاتا تھا۔ ظفریاب حسین کی بابت ماں باپ کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ چھولس میں رہ کر زمینداری کی دیکھ بھال کریں گے، یہ فیصلہ برادری کو بہت پسند آیا۔ ان کی شادی سادات بارہہ میں ہوئی تھی، دوسری بیوی شہر بانو کا سلسلہ جار چے سے ہے اور بقید حیات ہیں۔ آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد کسٹوڈین کے محکمے نے مسلمانوں کو ستایا اور ان کی جائیدادوں پر زبردستی قبضے کا چکر پھیلایا، الٹا بار ثبوت بھی ان ہی پر ڈالا کہ ثابت کریں پاکستان نہیں جا رہے ہیں، اس وقت سے ظفریاب حسین کی حالت ڈھیلی ہو گئی۔ مجموعی طور سے انھوں نے زندگی کا بیشتر دور بےفکری اور فارغ البالی سے گذارا تھا۔

باپ کی خواہش کے علی الرغم اور امید کے برخلاف افضال حسین کے مزاج میں وہ عادتیں چپکے سے داخل ہوتی رہیں جن کو پولیس کی ملازمت کے لئے فال نیک نہیں سمجھا جاتا۔ ان کو ابتدائی عمر سے شاعری کے شوق نے تھام لیا جو آخر تک نہ گیا، قیصر تخلص تھا اور اعلیٰ درجہ کا تخلیقی ذوق رکھتے تھے۔ شاعری مطالعے کا رجحان پیدا کرتی ہے اور شاعر ہر وقت چراغ سے چراغ جلانے کی فکر میں غلطاں رہتا ہے۔ افضال حسین استغراق کے ساتھ اردو اور فارسی کے معروف اساتذہ کو پڑھتے تھے اور یہی ان کی واحد دلچسپی تھی۔ قدرتی طور سے ایسا آدمی جرائم کی تفتیش اور جرائم پیشہ لوگوں کی پکڑ دھکڑ کو حد درجہ فضول حرکت اور واہیات ذمہ داری سمجھتا ہے۔ گویا کہ ایک ناگوار بوجھ ہے جسے پہلی فرصت میں سر سے اتار کر پھینکنا چاہیئے۔

علی گڑھ کے ظہور وارڈ سے تربیت کا آغاز ہوا تھا۔ وہ شیروانی اور ترکی ٹوپی کے علاوہ کسی لباس کو پسند نہ کرتے تھے۔ سوٹ سے کبھی رغبت پیدا نہ ہوئی۔ ریٹائر ہو کر چھولس آ گئے، تب بھی گھر سے باہر ویسی ہی شان سے نکلتے تھے۔ صاف ظاہر تھا، اور اس کو کبھی چھپایا بھی نہیں، کہ سرکاری وردی سے سخت جی گھٹتا ہے۔ بادرجہ مجبوری پہن لیتے ہیں۔

شاعری کا شغف، کتابیں، ادبی رسالے اور افکار کی دنیا میں سیر و سیاحت،

افضال حسین کی طبیعت کا رطب و یابس سے پرہیز کرنا اور نفاست میں ڈوب جانا قدرتی بات تھی۔ چھولس کی دیہاتی خلقت کو شکوہ تھا کہ بڑے داروغہ جی ہر طرح کے آدمی کو اپنے پاس محبت سے بٹھاتے تھے، خود خاموش رہنے کی عادت تھی، مگر دوسروں کی باتوں سے خوب جی خوش کرتے تھے، اور اکثر ہنسی بھی آجاتی تھی۔ افضال حسین باپ کی طرح نہیں ہے، مغرور ہے، کسی سے بات نہیں کرتا۔ اصل بات یہ تھی کہ افضال حسین کے لئے ذرا سی گنوار وصحبت بھی برداشت کی بات نہ تھی۔ ان کو باہر کی بیٹھک سے کوئی مطلب نہ تھا، اکثر گھر کے بالائی کمرے میں کتابوں کے ذریعہ وقت گذارتے تھے، طبیعت موزوں ہوئی تو شعر کہہ لئے۔ باپ نے پولیس کا افسر بنانا چاہا تھا، انھوں نے ایسے شغل اختیار کئے جو پولیس کی زندگی کے قابل نہیں چھوڑتے۔

چھولس کے تمام مردوں اور عورتوں کے علم میں تھا کہ افضال حسین اپنے عزیزوں سے بیحد محبت کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے کم لوگ واقف تھے کہ مطلب کے آدمی سے بہت زیادہ باتیں بھی کرتے ہیں اور خوش مزاج آدمی ہیں۔ وہ میرے والد کے ہم عمر تھے، مگر مجھے گھنٹوں اپنے پاس بٹھاتے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ محتشم کاشی، نعمت خاں عالی، اور بہت سے فارسی شاعروں کے حالات اور اشعار افضال حسین کی زبان سے سنے ہیں حالانکہ اس وقت تک فارسی شاعروں کے شعر سمجھنے کی معقول تمیز بھی نہ آئی تھی۔ اُن کے ذاتی ذخیرے میں کسی خوشنویس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہفت بند کاشی کا نہایت خوبصورت خطی نسخہ موجود تھا۔ ایک زمانے تک یہ نظم ہر پڑھے لکھے شیعہ کے گھر میں پائی جاتی تھی۔ مشہور تھا کہ جدید صنف مرثیہ کا آغاز اسی نظم سے ہوتا ہے۔

مصطفیٰ بیگم کی ایک خاموش کامیابی پر برادری تعجب کرتی تھی اور سب کہتے تھے کہ خدا جانے کیا نسخہ استعمال کیا ہے۔ عموماً ساس بہو کے اختلافات مشہور ہیں، انھوں نے اپنی بہو ذاکری بیگم کو اس خوبصورتی کے ساتھ خاص اپنے قالب میں ڈھالا تھا جیسے عدالتوں کے شاطر کارپرداز کسی خفیہ اور اہم دستاویز کی نقل مطابق اصل تیار کرتے ہیں

ہنرمندی دکھاتے ہیں۔ ذاکری بیگم ذاتی خلوص، وفاداری اور محبت کی خوبیاں ممکن ہے اپنے گھر سے ساتھ لے کر آئی ہوں، یا مصطفیٰ بیگم کی تربیت کا فیض ہو۔ بہرحال شہرت یہ تھی کہ جہاں سے مصطفیٰ بیگم نے قدم اٹھایا وہیں ذاکری بیگم نے قدم رکھا۔ انھوں نے اقبال حسین کی گھر کی رونق اور حیثیت میں ذرا سا فرق نہ آنے دیا۔ عورت محض اس اعتبار سے کنبہ پرور نہیں کہلاتی کہ نئی نسل کو دودھ پلاتی ہے اور اپنی گود میں پالتی ہے۔ اس محاورے کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ وہ شوہر کے سارے کنبے کی پرورش، ترقی اور بہبود پر نظر رکھتی ہے۔ مصطفیٰ بیگم اور ذاکری بیگم، دونوں کی ذات ان برکتوں سے آراستہ تھی۔

ظفر حیدر، بڑے بیٹے، افضال حسین اور ذاکری بیگم کی یادگار ہیں۔ میری چھوٹی بہن قدسیہ سے ان کی شادی ہوئی۔ دونوں شادی کے تھوڑے دن بعد پاکستان مہاجرت کر گئے اور حیدرآباد سندھ میں اقامت گزین ہیں۔ مہاجرت کا مثبت عمل شمار کرنا چاہیئے کہ افضل حسین کی نسل میں پرانا دستور سا تھا، ایک کے دو، اکثر ایک ہی رہ گیا، قدسیہ اور ظفر خدا کے فضل سے بہت سے لڑکوں کے ماں باپ ہیں۔ فی الحال خاندان بڑھنے کے آثار پیدا ہوئے۔ دوسرا مثبت نتیجہ یہ ہوا کہ ظفر کے سب بچے یونیورسٹی کی تعلیم تک پہنچے اور گھر میں بزرگوں سے جو رسم چلی آرہی تھی، ہرچہ گیرید مختصر گیرید، ان بچوں نے توڑ دی۔

محمد کامل، مصطفیٰ بیگم کے نواسے تھے۔ دور پاس کے عزیزوں کے ساتھ مروّت اور ہمدردی سے پیش آنا اقبال حسین کے گھر کی تربیت اور نانی کے خون کا اثر تھا۔ مجھ پر ذاتی طور سے محمد کامل کے بہت سے احسانات ہیں۔ بذلہ سنجی اور ذہانت میں جواب نہ تھا۔

ظفر حیدر تک مصطفیٰ بیگم کے گھر کی تاریخ ایک دور پورا کرلیتی ہے۔ نظام شمسی کے ستاروں کا عالم بتاتا ہے کہ مقررہ وقت پر مدار کی ایک گردش ختم ہوئی اور دوسری کا آغاز ہوا۔ یہی مثال مہاجر نسلوں پر صادق آتی ہے۔

# آٹھواں باب

# شجرہ

شجرے کا رواج ہمارے معاشرے سے تقریباً جا چکا ہے۔ وہ فارغ البال لوگ دنیا سے رخصت ہوئے جو شجرے کو دلچسپی اور دیدہ ریزی کی چیز سمجھتے تھے۔ نومولود نسلوں کا اضافہ کرنا اور برادری میں تازہ ورود مسعود کی خبر رکھنا ان کے شوق کا مشغلہ تھا۔ مددمعاش کے قوانین گئے شجرے کی اہمیت بھی گئی۔

ابتداء میں جارچہ چھولس دونوں جگہ کا شجرہ مولانا عباس حسین کے کتابخانے میں رہتا تھا۔ چھولس میں قاعدہ یہ تھا کہ کسی کو اپنے خاندانی شجرے کی ضرورت ہوئی تو وہ لپکا ہوا جارچے گیا اور وہاں سے نقل لے آیا۔ میرے والد سید علی ہادی نے یہ کیا کہ چھولس کا شجرہ علیحدہ اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ ہمارے گھر کو پہلے ہی سے ایک قسم کے دستاویزی محافظ خانے کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ طریقہ ملک کی تقسیم کے وقت تک برقرار رہا۔ پاکستان کے لئے چل چلاؤ پھیلا تو اکثر لوگ جاتے وقت اپنی زمین جائیداد کی شہادت اور حسب نسب کی رسید میرے والد سے مانگتے تھے وہ اندر رکھی ہوئی الماریوں کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ زمانہ افراتفری اور بے دلی کا تھا۔ مدتوں سرخ کپڑوں میں لپٹے ہوئے بستوں کی کھکوڑ جاری رہی جس نے جو کاغذ مفید سمجھا، قبضے میں کیا اور چلتا ہوا۔ بعد میں میرے والد کو بعض قیمتی دستاویزیں یاد آئیں۔ اکثر بزرگوں نے شجرہ بھی نقل کیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ میرے ہاتھ جو رجسٹر آیا وہ خامیوں سے خالی نہیں ہے اکثر جگہ سے کیڑے کھا گئے ہیں۔ اگر کسی فرد یا خاندان کے شجرہ میں کوئی نقص ہے تو میری خطا یہ ہو سکتی ہے کہ پڑھنے میں غلطی ہو گئی، دنیا میں کوئی چیز مکمل

نہیں ہوتی۔ مگر کرم خوردہ سلسلے کی تلافی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ خدا جانے گم شدہ نام کیونکہ مل پائیں گے جبکہ کئی جگہ بعد کے نام رہ گئے، ابتدائی کڑیاں کیڑوں نے چھلنی کر دیں۔

مختصر یہ کہ میر سید علی سبزواری کے چار بیٹے تھے۔ سید امجد[1]، سید اکبر[2]، سید خاں[3] اور سید علی اصغر[4]۔ سادات چھولس کی نسل علی الترتیب چار خاندانوں پر مشتمل ہے، جیساکہ شجرہ واضح کرتا ہے۔

ماضی کی آواز پر کان لگانا اور خفتگانِ خاک کی خبر خبر رکھنا، یہ دو عادتیں ہمارے دل میں زندہ ہیں تو شجرے سے دلچسپی باقی رہے گی۔

آدمی کچھ بھی نہیں بھولتا۔ حکمائے یونان کے اس عقیدے میں شک نہیں کہ یادداشت انسان اور حیوان میں امتیاز کی علامت ہے۔ دُنیا کے حادثات بظاہر انسانی تحت الشعور میں اُتر کر سو گئے مگر جاگنے کے منتظر رہتے ہیں۔ موقع آتے ہی ساری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں مثال کے طور پر مغلوب حریف مقابل کے غالب حریف سے، چھ سات صدیوں کا حساب بھی ہے تو چھ سات مہینے میں برابر کر کے دکھا دے گا۔ اسی بنا پر یادداشت کی صیقل کو دماغ کی مفید ورزش کہتے ہیں۔ قدرتی طور سے شجرہ بھی تھ[illegible]ی سی معاونت کرے تو فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ہماری آئندہ نسلیں اپنے بزرگوں پر [illegible]ر نہ کریں یہ شرمندہ بھی نہ ہونگی۔ لوگ ہمیشہ ان کی تعریف کریں گے اور محبت کے ساتھ یاد رکھیں گے معاملہ افراد کے سہارے یادوں کا تسلسل باقی رکھنے اور صالح روایات کو بچانے کا ہے۔ جو طریقہ بھی صحیح بیٹھ جائے۔ اجتماعی یادداشت جاتی رہے تو فکر، اعتماد اور حمیت کا دیوالہ نکلنے میں دیر نہیں لگتی۔

## نسل سید جلال بیہقی

- امام ہشتم علی رضا علیہ السلام
  - امام نہم محمد تقی ع
  - شاہ حسن لاوشن چراغ
    - شاہ محمد تقی کربلائی
      - محمد نقی
        - شاہ علی
          - اکبر مودودی
            - محمد مولائی
              - سید علی نوری
                - سید جلال بیہقی *
                - شاہ نعمت اللہ
  - ابراہیم
  - جعفر قانع
  - شاہ یعقوب
  - شاہ حسین
  - شاہ عمران

- * سید جلال بیہقی
  - سید محمد
    - علاء الدین
      - سید مسیح
      - سید علی سبزواری (نسل سادات اچولس)
        - سید امجد
        - سید اکبر
        - سید خان
        - علی اصغر
  - سید محمود برقعہ پوش
  - شاہ میر
    - سید حسن (نسل سادات جارچہ)
      - سید اسحاق
      - سید موسیٰ
      - سید ابراہیم
      - بندگی معظم
      - میر میران
      - سید ناصر
        - سید محمود روحانی
      - زین العابدین

سید اسحاق : نسل انبالہ

سید موسیٰ : نسل پیدی ضلع بجنور

سید ابراہیم : مزار جلیسر ضلع اٹیہ

بندگی معظم : مزار بدایوں

میر میران : مزار سرھند

سید ناصر : مزار کشمیر سید ناصر کے پسر سید محمود روحانی، جارچے واپس آگئے جارچے میں مزار ہے۔

زین العابدین لشکر برس، مزار جیور ضلع بلند شہر۔ راجہ مہلک کی جنگ میں شہید ہوئے۔ لاش دریا میں بہی جاتی تھی۔ کسی نے نکال کر جیور میں دفن کیا۔

نسل سید امجد

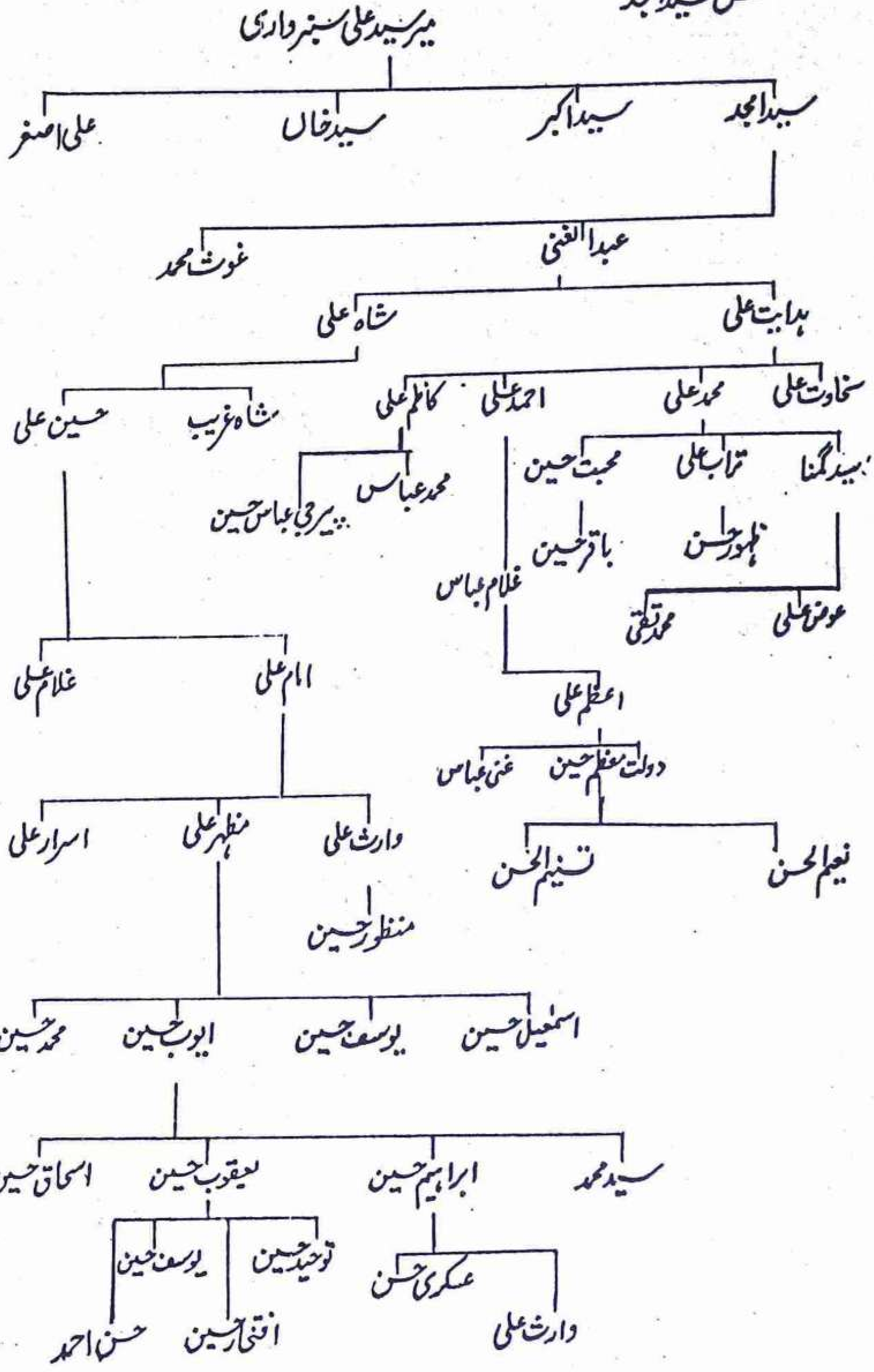
میر سید علی سبزواری
سید امجد
سید اکبر
سید خاں
علی اصغر
عبدالغنی
غوث محمد
ہدایت علی
شاہ علی
سخاوت علی
محمد علی
احمد علی
کاظم علی
شاہ غریب
حسین علی
سید گمنا
تراب علی
محبت حسین
محمد عباس
میر جی عباس حسین
ظہور حسن
باقر حسین
غلام عباس
عوض علی
محمد تقی
امام علی
غلام علی
اعظم علی
دولت معظم حسین
غنی عباس
وارث علی
منظہر علی
اسرار علی
نعیم الحسن
تسنیم الحسن
منظور حسین
اسمٰعیل حسین
یوسف حسین
ایوب حسین
محمد حسین
سید محمد
ابراہیم حسین
یعقوب حسین
اسحاق حسین
توحید حسین
یوسف حسین
عسکری حسن
وارث علی
افتخار حسین
حسن احمد

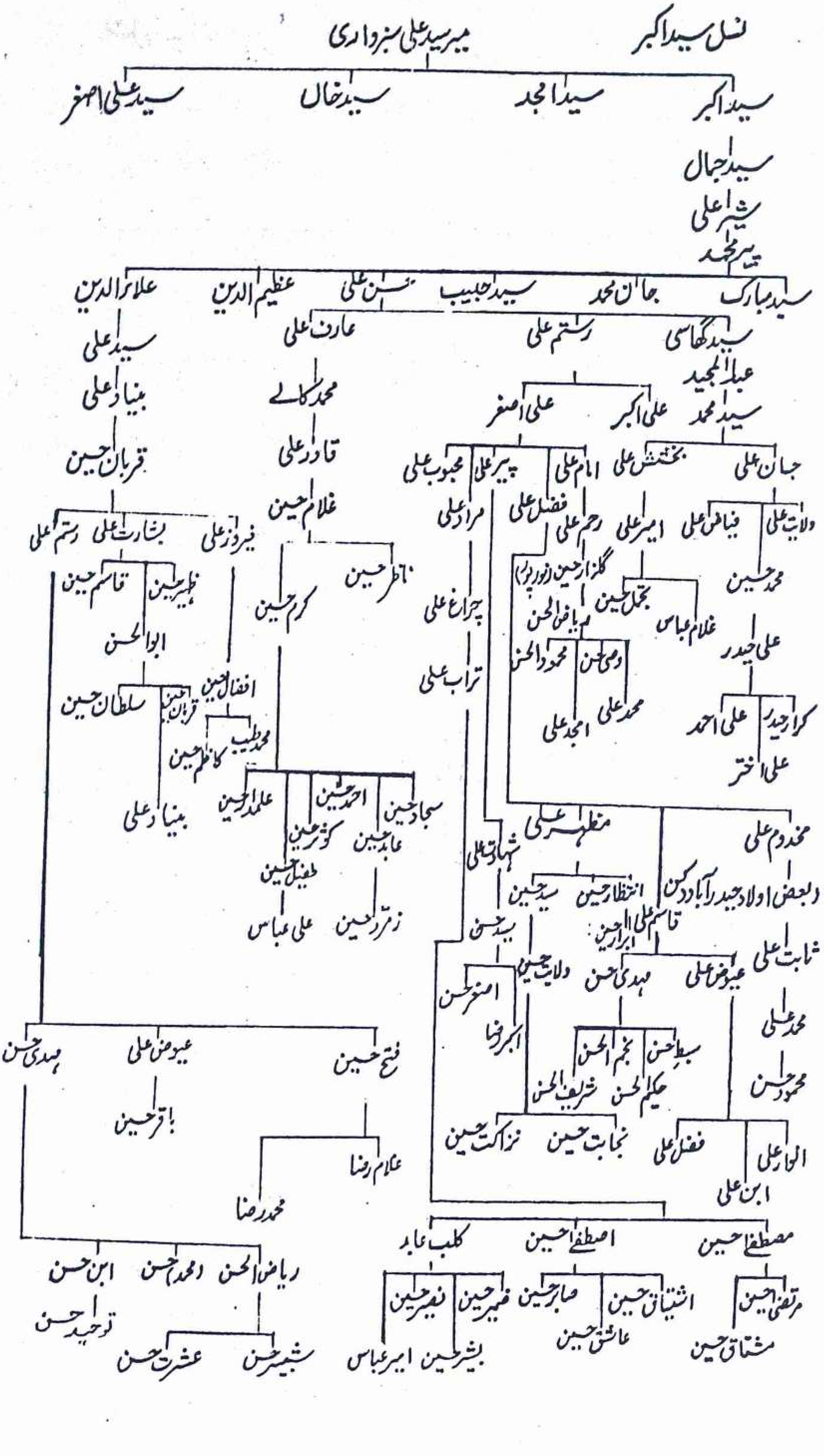
نسل سید اکبر
میر سید علی سبزواری
سید اکبر
سید امجد
سید خال
سید علی اصغر
سید جمال
شیر علی
پیر محمد
سید مبارک
جان محمد
سید حبیب
حسن علی
عظیم الدین
علاء الدین
سید گھاسی
رستم علی
عارف علی
سید علی
عبد المجید
سید محمد
علی اکبر
علی اصغر
محمد کالے
بنیاد علی
جان علی
بخشش علی
امام علی
پیر علی
محبوب علی
قادر علی
قربان حسین
ولایت علی
فیاض علی
امیر علی
رحم علی
فضل علی
مراد علی
غلام حسین
فیروز علی
بشارت علی
رستم علی
محمد حسین
گلزار حسین (نور پور)
تجمل حسین
غلام عباس
مرتضیٰ الحسن
ناظر حسین
کرم حسین
چراغ علی
ظہیر حسن
قاسم حسین
ابو الحسن
علی حیدر
وصی حسن
محمود الحسن
تراب علی
افضال حسین
قربان حسین
سلطان حسین
کرار حیدر
علی احمد
محمد علی
امجد علی
محمد طیب
کاظم حسین
علی اختر
سجاد حسین
احمد حسین
علمدار حسین
بنیاد علی
مخدوم علی
مظہر علی
عابد حسین
کوثر حسین
شہادت علی
طفیل حسین
بعض اولاد حیدر آباد دکن
انتظار حسین
سید حسین
زمرد حسین
علی عباس
قاسم علی
ابرار حسین
سید حسن
ثابت علی
عیوض علی
مہدی حسن
ولایت حسین
امیر حسن
محمد علی
اکبر رضا
سبط حسن
نجم الحسن
حکیم الحسن
شریف الحسن
فتح حسین
عیوض علی
مہدی حسن
محمود حسن
باقر حسین
الطاف علی
فضل علی
نجابت حسین
نزاکت حسین
غلام رضا
ابن علی
محمد رضا
مصطفیٰ حسین
اصطفیٰ حسین
کلب عابد
ریاض الحسن
امجد حسن
ابن حسن
مرتضیٰ حسین
اشتیاق حسین
صابر حسین
ضمیر حسین
نصیر حسین
توحید حسن
مشتاق حسین
عاشق حسین
بشیر حسین
امیر عباس
شبیر حسن
عشرت حسن

## نسل سید خاں

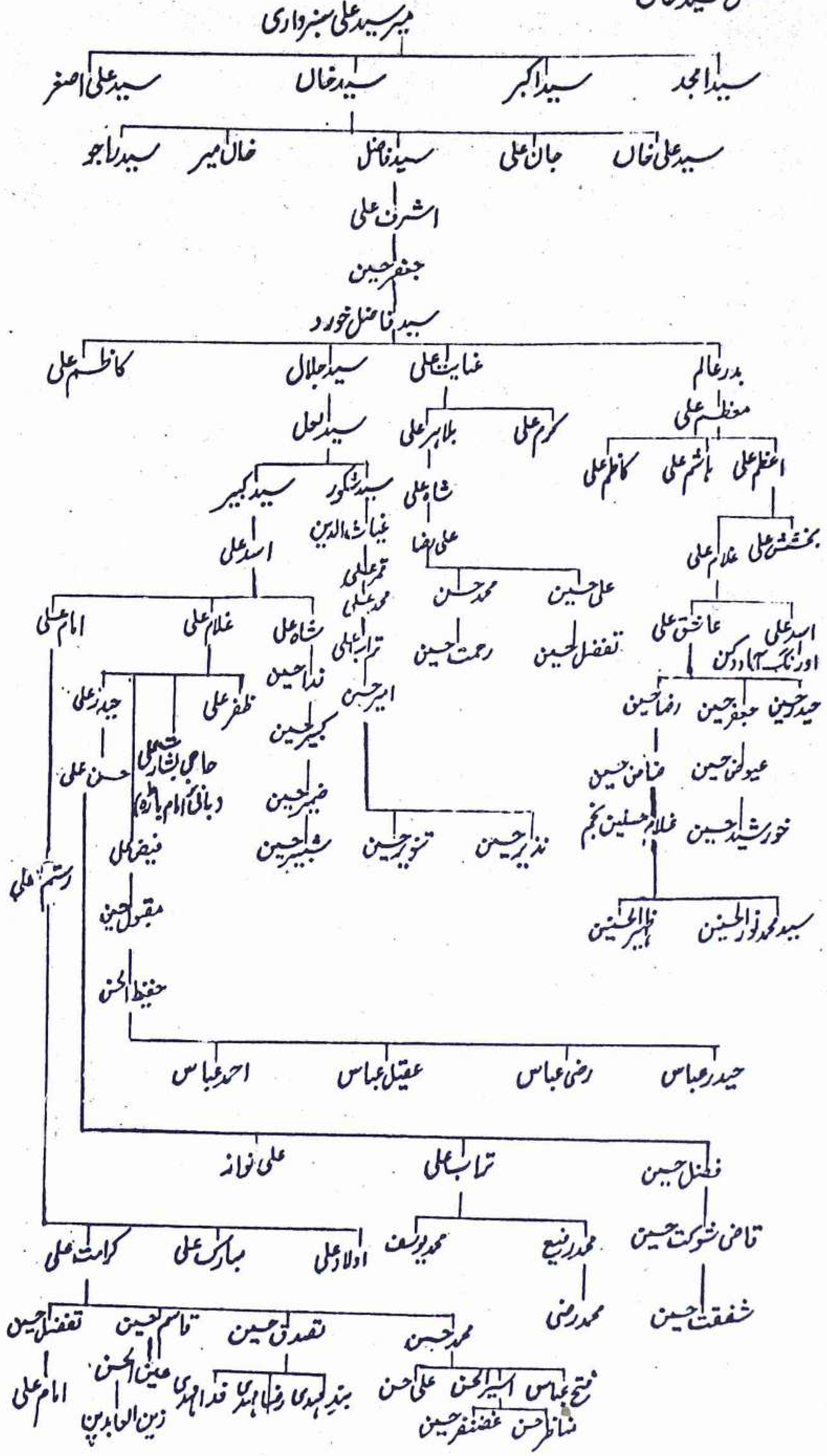
میر سید علی سبزواری
سید امجد
سید اکبر
سید خاں
سید علی اصغر
سید علی خاں
جان علی
سید فاضل
خاں میر
سید راجو
اشرف علی
جعفر حسین
سید فاضل خورد
بدر عالم
عنایت علی
سید جلال
کاظم علی
معظم علی
کرم علی
بلاہر علی
سید لعل
اعظم علی
ہاشم علی
کاظم علی
شاہ علی
سید شکور
سید کبیر
بخشش علی
غلام علی
علی رضا
غیاث الدین
اسد علی
علی حسین
محمد حسن
قمر علی
محمد علی
اسد علی اورنگ آباد دکن
عاشق علی
تفضل حسین
رحمت حسین
تراب علی
شاہ علی
غلام علی
امام علی
حیدر حسین
جعفر حسین
رضا حسین
ندا حسین
امیر حسن
ظفر علی
حیدر علی
عبدالغنی حسین
ضامن حسین
کبیر حسین
حاجی بشارت علی (بانی امام باڑہ)
حسن علی
خورشید حسین
غلام حسنین نجم
ضمیر حسین
سید محمد نور الحسنین
ظہیر الحسنین
نذیر حسین
تنویر حسین
شبیر حسین
فیض علی
رستم علی
مقبول حسین
حفیظ الحسن
حیدر عباس
رضی عباس
عقیل عباس
احمد عباس
فضل حسین
تراب علی
علی نواز
قاضی شوکت حسین
محمد رفیع
محمد یوسف
اولاد علی
مبارک علی
کرامت علی
شفقت حسین
محمد رضی
محمد حسن
تصدق حسین
قاسم حسین
تفضل حسین
فتح عباس
اسیر الحسن
علی حسن
بندہ مہدی
رضا مہدی
فدا مہدی
عین الحسن
زین العابدین
امام علی
مناظر حسن
غضنفر حسین

# نسل سید علی اصغر　　سلسلۂ شاہ محمد

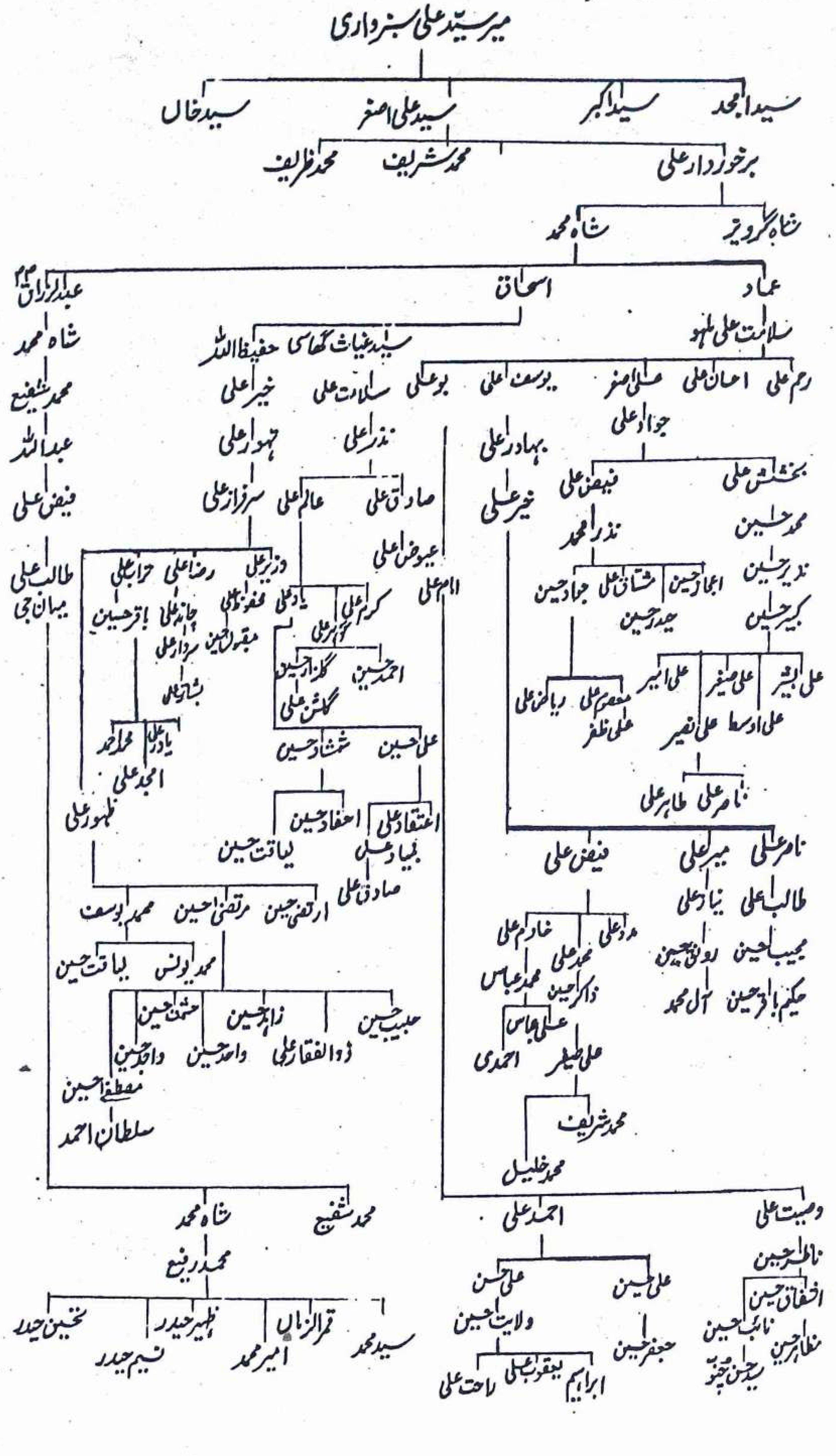

## سلسلۂ کشمیریان

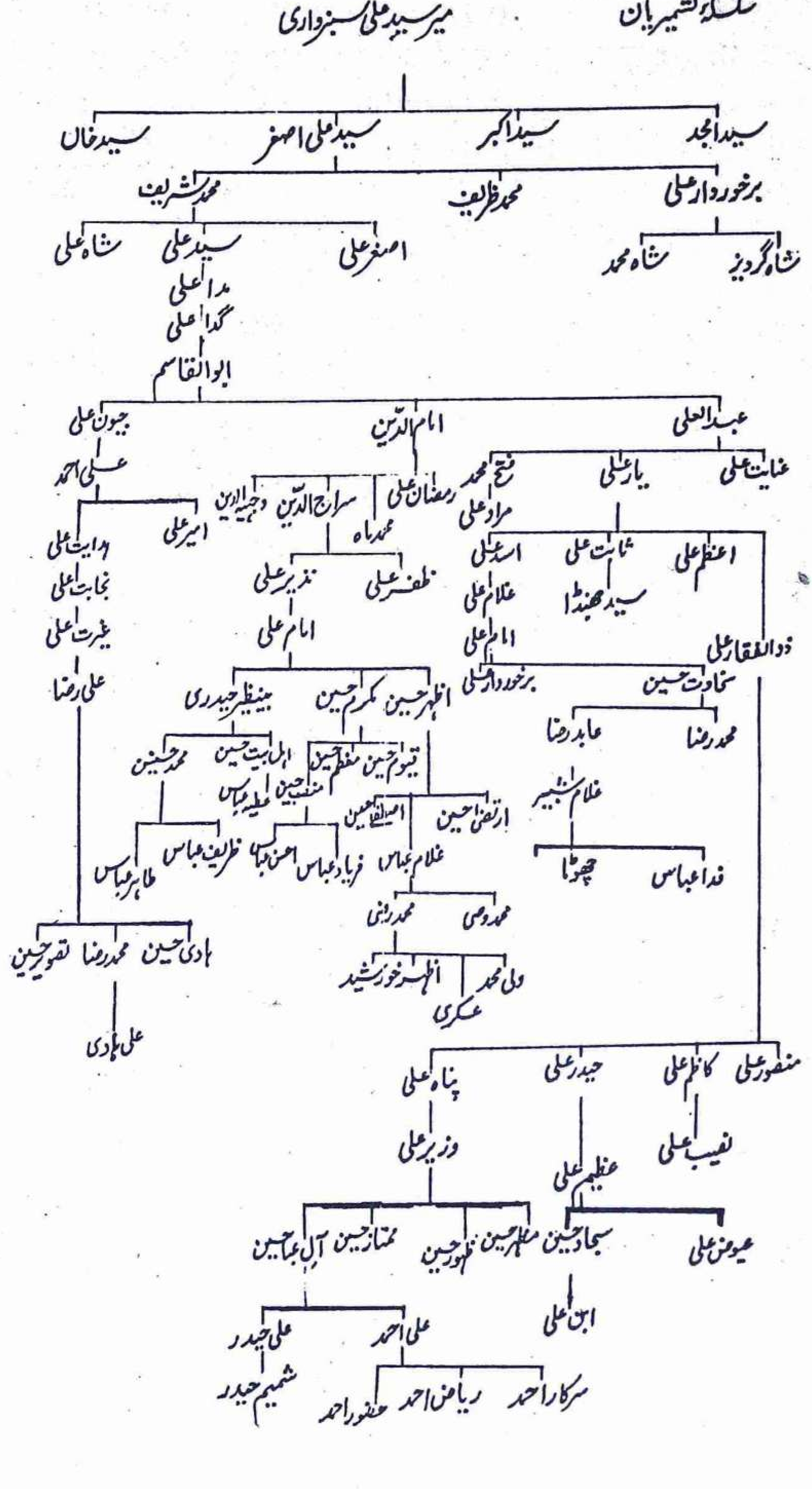

نسل سید علی اصغر مسلسل (سلسلہ عطا علی، اعظم علی)

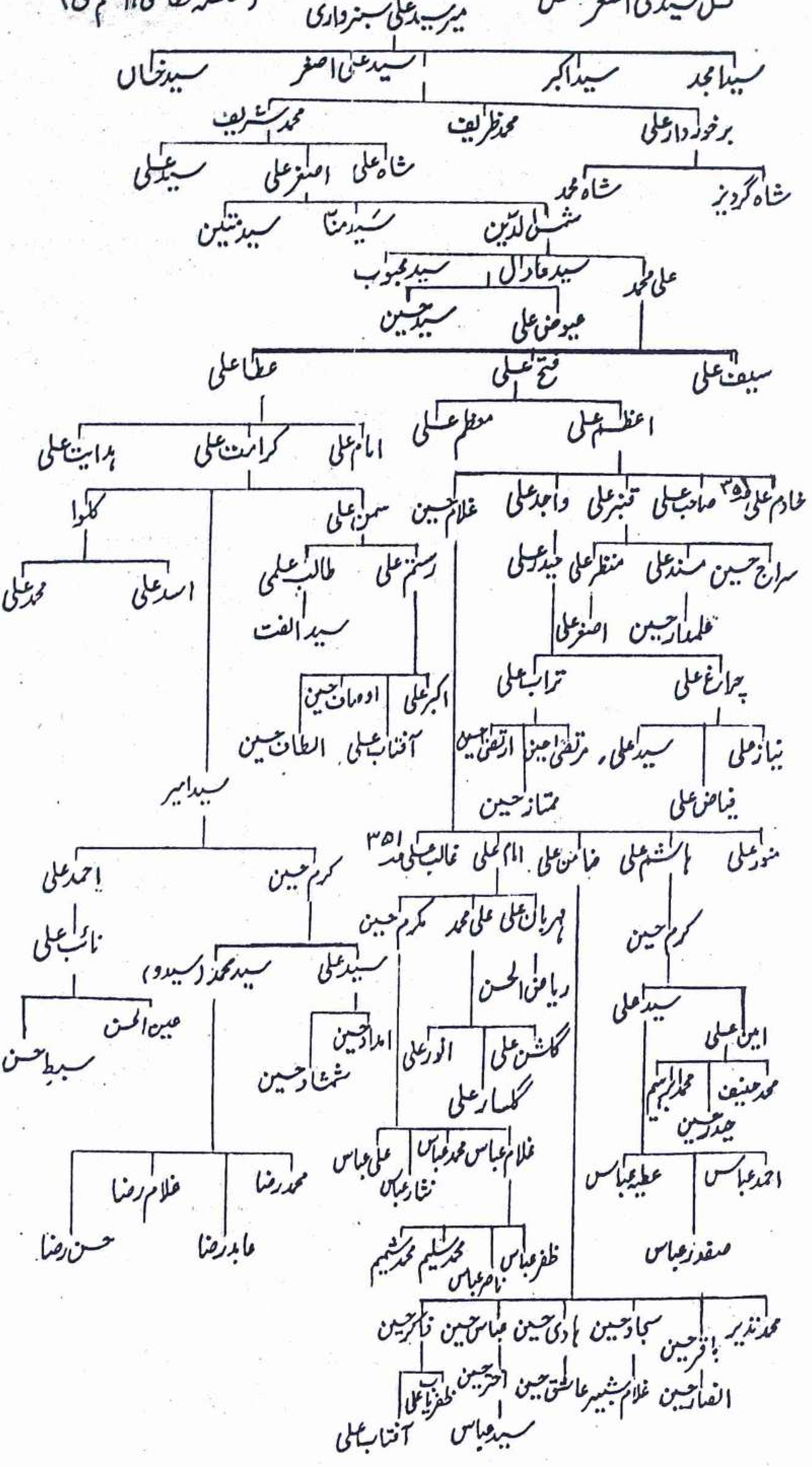

گزشتہ صفحہ ۳۵۰ سے پیوستہ

(سلسلہ غالب علی، خادم علی، بساون علی)

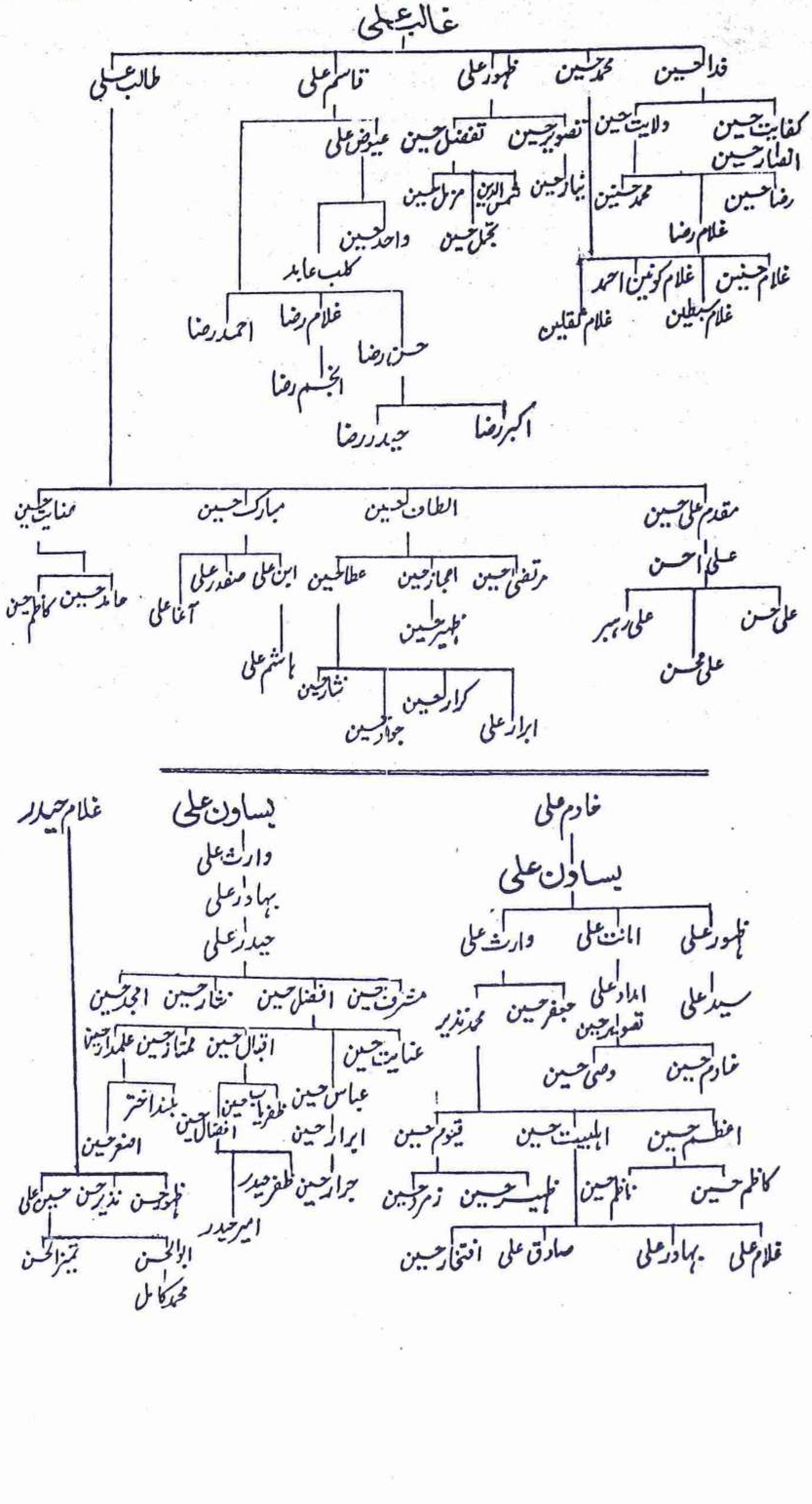

## سلسلہ شمس الدین، سید عادل، معظم علی

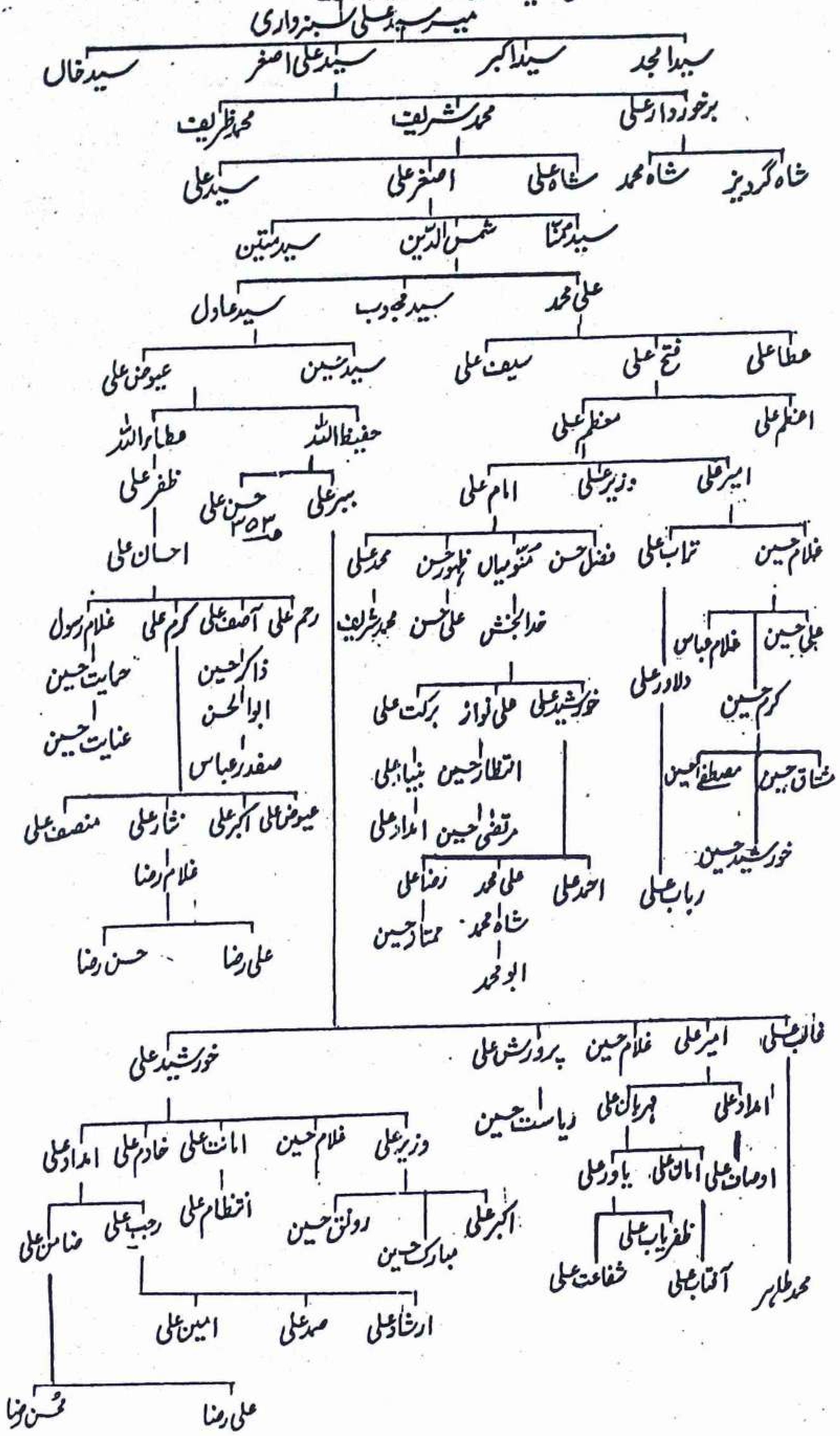

گزشتہ سے پیوستہ — سلسلہ حفیظ اللہ، حسن علی، ثابت علی

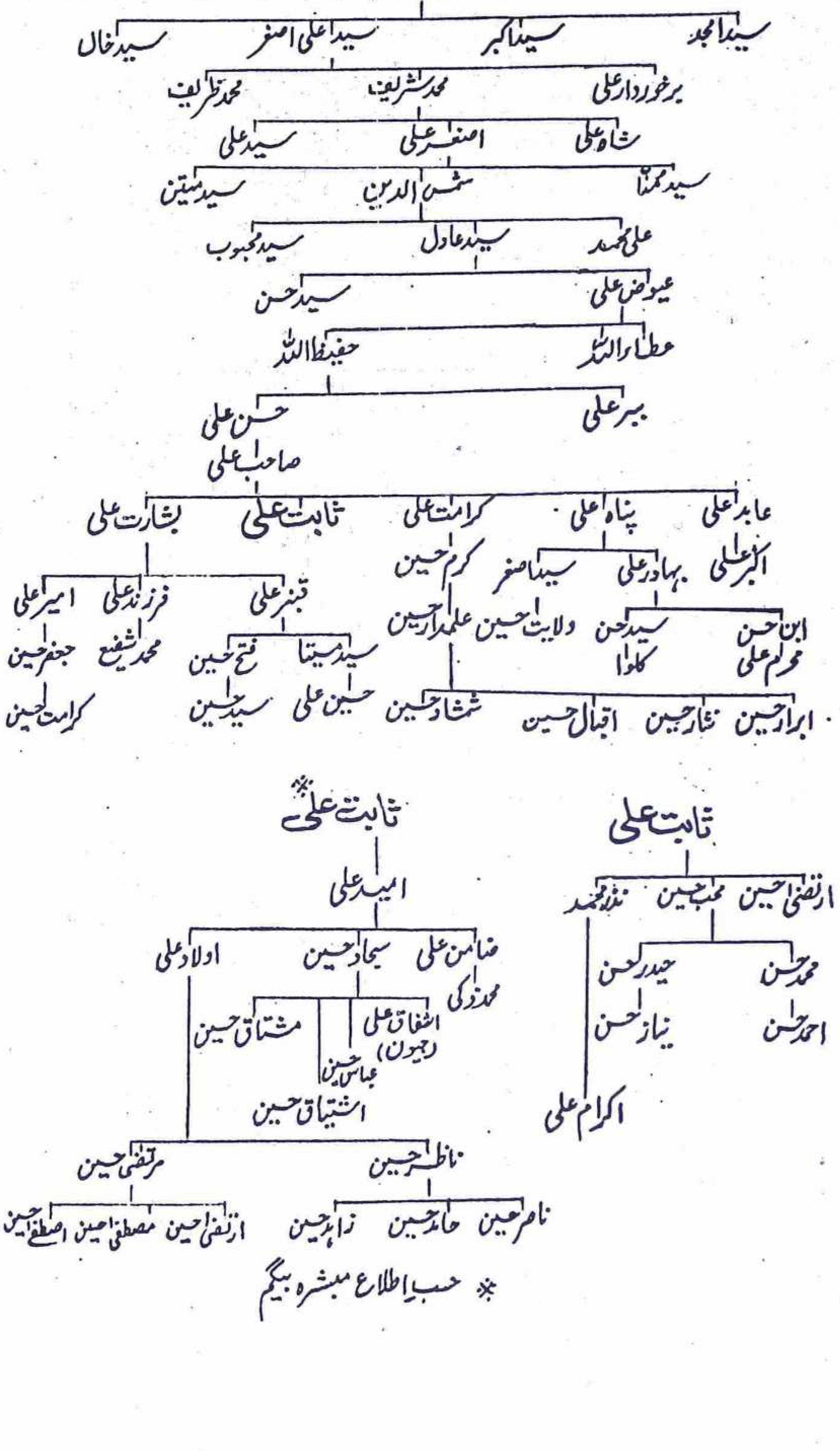


* حسب اطلاع مبشرہ بیگم

سلسلۂ قادر علی و نور علی قائم علی (نور پور)

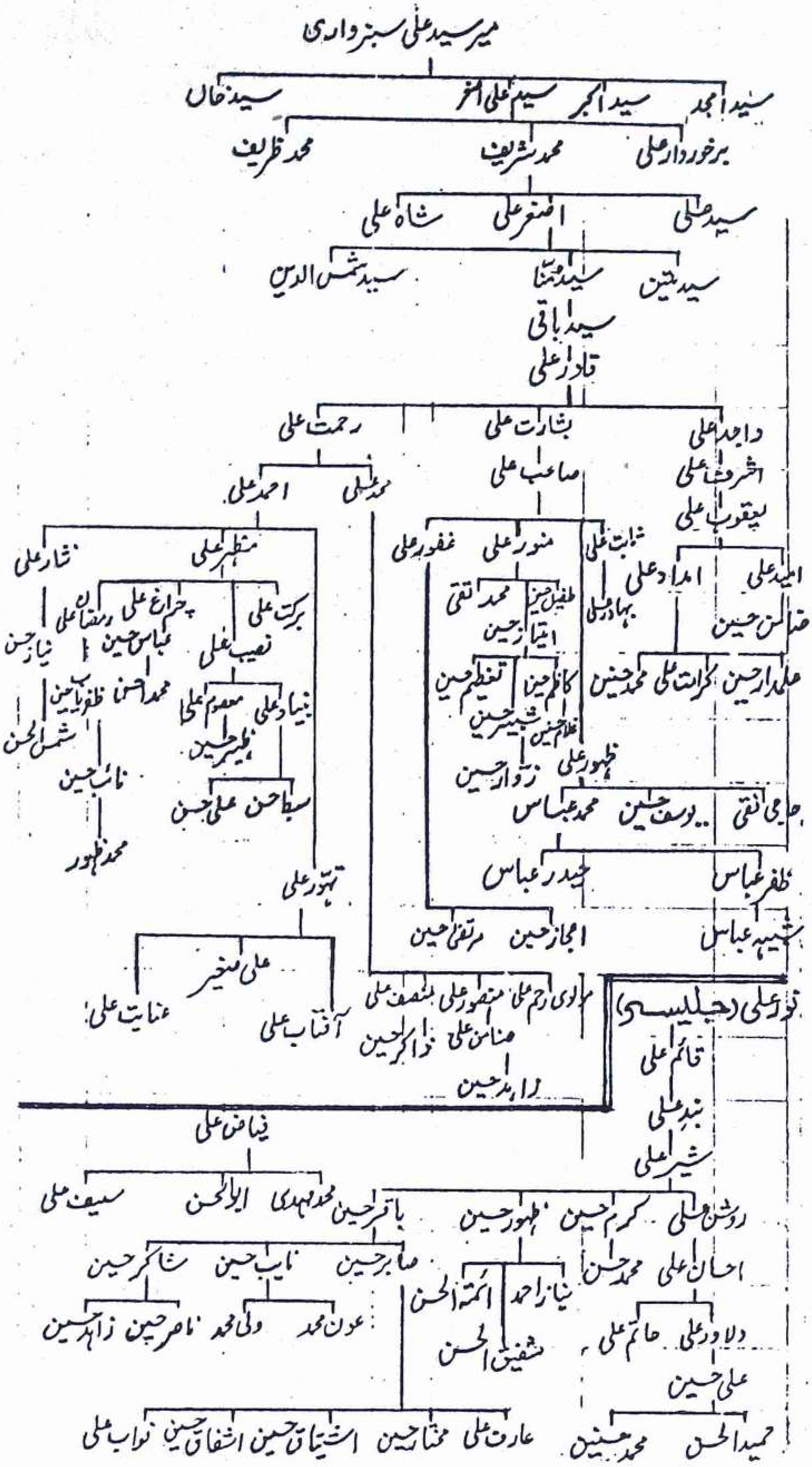

786
1189